

تاریخ
دعوتِ عزیمت

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

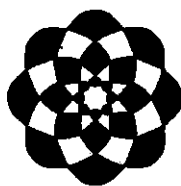
جلد اول

مجلس تحقیق و نشریات اسلام، لکھنؤ

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ



مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

جملہ حقوق محفوظ

۱۴۳۱ھ - ۲۰۱۰ء

نام کتاب _____ تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ اول)

نام مصنف _____ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

صفحات _____ ۴۳۶

تعداد _____ ایک ہزار

قیمت _____

طابع _____ کاکوزی آفسیٹ پریس، لکھنؤ

ناشر _____ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

Post Box No. 119

Nadwatul Ulama

Lucknow.

Tel : 0522-2740539

Fax : 0522-2740806

e-mail : info@airpindia.com

تاریخ دیوبند و عزیمت

حصہ اول

عربی _____ کویت و بیروت _____ متعدد ایڈیشن
 انگریزی _____ لکھنؤ _____ دوسرا ایڈیشن
 اردو _____ لکھنؤ _____ ۷ واں ایڈیشن
 اردو _____ کراچی _____ متعدد ایڈیشن
 اسی طرح ترکی اور فرنج زبانوں میں اشاعت ہو چکی ہے۔

فہرست

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۴	حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی جانشینی	۹	دیباچہ طبع دوم
۳۵	خلافت کے بعد ان کی زندگی	۱۱ — ۱۶	پیش لفظ
۳۷	ان کی انقلابی اصلاحات		مقدمہ
۳۸	اعمال و اخلاق کی طرف توجہ		اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل
۳۹	تدوین علوم اور اجائے سنن	۱۷ — ۳۰	
۴۰	چند خطوط و فرامین	۱۷	زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے
۴۸	تبلیغ و اشاعت اسلام کی طرف توجہ	۱۸	امت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے
۴۹	ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا رد عمل	۱۸	اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات
۵۰	ان کی زندگی کا جوہر	۱۹	اسلام کے قلب و جگر پر جلے
۵۱	حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی وفات	۲۰	دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی
	دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت جن ابصری	۲۶	مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت
	۴۸ — ۵۳	۲۷	ہر نئے فتنے اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت و طاقت
۵۳	امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف	۲۸	تاریخ کے گم شدہ مآخذ
۵۴	تابعین کی دعوت ایمانی	۲۹	اسلام کی میراث
۵۵	حضرت جن ابصری		پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ
۵۵	حسن ابصری کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں		۳۱ — ۵۲
۵۷	حسن ابصری کے مواظف	۳۱	عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات
۶۳	ان کی حق گوئی و میاکی	۳۲	عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر
۶۳	اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین	۳۳	انقلاب حکومت کی ضرورت اس کی مشکلات

۹۶	واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے	۶۵	تفاق و منافقین کی نشاندہی
۹۹	بے نظیر عزیمت و انتقامت	۶۷	حسن بصری کی وفات اور ان کی مقبولیت
۱۰۰	امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ	۶۷	انقلاب حکومت کی کوششیں
فقہۃ داعیۃ ال اور ابو الحسن اشعری اور ان کے پیرو		خلافت عباسیہ اور دینی دعوت و تذکیر	
۱۱۸ - ۱۰۳		۷۲ - ۶۹	
۱۰۳	معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات	۶۹	خلافت عباسیہ اور اس کے اثرات
۱۰۴	سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی مزوت	۷۰	بعد اذ کے داعی الی اللہ
۱۰۵	امام ابو الحسن اشعری	تدوین حدیث و فقہ	
۱۰۶	امام ابو الحسن اشعری کا جذبہ تبلیغ و احقاق حق	۸۳ - ۷۳	
۱۰۶	ان کی دینی صلاحیتیں اور علمی کمالات	۷۳	امت کی دو فوری ضرورتیں
۱۰۸	ان کا مسلک اور ان کی خدمات	۷۵	تدوین حدیث
۱۱۳	ان کی تصنیفات	۷۵	محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی
۱۱۴	عبادت و تقویٰ	۷۶	فن اساء الزجاء
۱۱۴	وفات	۷۷	محدثین کی احتیاط و امانت
۱۱۴	امام ابو منصور ماتریدی	۷۸	قوت حافظہ اور استحضار
۱۱۶	اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر	۷۹	مجالس درس میں سامعین کا ہجوم
علم کلام کا انحطاط فلسفہ اور باطنیت کا فروغ		۷۹	صحاح ستہ
اور		۸۰	تدوین فقہ
ایک نئے منظم کی ضرورت		۸۱	ائمہ اربعہ اور ان کی خصوصیات
۱۲۹ - ۱۱۹		۸۲	ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین
۱۱۹	علم کلام کا انحطاط و انحطاط	۸۲	تدوین فقہ کا فائدہ
۱۲۰	فلسفہ کا رواج	فقہۃ خلق قرآن اور امام احمد بن حنبلؒ	
۱۲۱	فلسفہ یونان کے عرب ناقل و شارح	۱۰۲ - ۸۴	
۱۲۱	جماعت اخوان الصفا اور اس کے رسائل	۸۴	فلسفہ الہیات اور ذات و صفات کی بحثیں
۱۲۲	معتزلہ و فلاسفہ کا فرق	۸۵	معتزلہ کا عروج
۱۲۳	باطنیت کا فقہ	۸۶	امام احمد بن حنبلؒ
۱۲۴	ظاہر و باطن کا مداخلہ	۹۴	فقہۃ خلق قرآن
۱۲۶	نبوت محمدیؐ کے خلاف بغاوت	۹۶	امام احمد ابتلاء و امتحان میں

امام غزالیؒ

۱۹۶-۱۳۰

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

۱۹۷-۲۲۴

۱۳۰	تعلیم اور علی عروج	۱۳۰	تعلیم و تکمیل
۱۳۱	گیارہ سال کی رہوردی اور اس کے تجربات	۱۳۱	اصلاح و ارشاد اور جوہر عام
۱۳۲	خلوت سے جلوت کی طرف	۱۳۲	محامد و اخلاق
۱۳۳	امام غزالیؒ کا تجدیدی کام	۱۳۳	مردہ دلوں کی سیمائی
۱۳۴	فلسفہ پر عمل جراحی	۱۳۴	تعلیمی مشاغل و خدمات
۱۳۵	تہافت الفلاسفہ کا اثر	۱۳۵	استقامت و تحقیق
۱۳۶	باطنیت پر حملہ	۱۳۶	تفویض و توحید
۱۳۷	زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ	۱۳۷	خلق خدا پر شفقت
۱۳۸	احیاء علوم الدین	۱۳۸	حضرت شیخ کا عہد اور ماحول
۱۳۹	تقصید و احتساب	۱۳۹	مواظع و خطبات
۱۴۰	علماء و اہل دین	۱۴۰	توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی
۱۴۱	حکام و سلاطین	۱۴۱	شکستہ دلوں کی تسکین
۱۴۲	مسلمانوں کے دوسرے طبقے	۱۴۲	دنیا کی صحیح حیثیت
۱۴۳	ایک اسلامی و تربیتی کتاب	۱۴۳	خلفاء اور حکام وقت پر تنقید
۱۴۴	احیاء العلوم اور فلسفہ اخلاق	۱۴۴	دین کے لئے دل سوزی اور فکر بندی
۱۴۵	حب جاہ	۱۴۵	بیعت و تربیت
۱۴۶	محاسبہ نفس	۱۴۶	زمانہ پراثر
۱۴۷	احیاء کے ناقد	۱۴۷	وفات
۱۴۸	امام غزالیؒ اور علم کلام	۱۴۸	علامہ ابن جوزیؒ
۱۴۹	تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالیؒ کی محدث	۱۴۹	۲۲۵-۲۵۱
۱۵۰	بقیہ زندگی اور وفات	۱۵۰	ابتدائی حالات اور تحصیل علم
۱۵۱	امام غزالیؒ کی دو ممتاز خصوصیتیں	۱۵۱	کتابت حدیث میں انہماک
۱۵۲	امام غزالیؒ کا عالم اسلام پراثر	۱۵۲	ذوق مطالعہ
۱۵۳	عمومی دعوت و تذکرہ کی ضرورت و اصلاح عام اور بندہ کے الہی الہام	۱۵۳	تصنیف و تالیف اور تحریر علی
۱۵۴	داعی کی علمی صلاحیتیں	۱۵۴	تقویٰ اور ذوق عبادت

۲۶۶	فتح بیت المقدس	۲۲۹	ظاہری محاسن و اوصاف
۲۶۸	اسلامی اخلاق کا مظاہرہ	۲۲۹	بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق
۲۶۹	صلیبی سیلاب	۲۳۲	محاسن و عظمت اور تاثیر
۲۷۰	صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل	۲۳۳	ان کی ناقدرانہ تصانیف
۲۷۳	وفات	۲۳۳	کتاب الموضوعات
۲۷۴	درویش سیرت سلطان	۲۳۴	تلبیس ابلیس
۲۷۷	محاسن اخلاق	۲۳۴	مختلف طبقات پر تنقید
۲۷۹	مردانہ اوصاف	۲۳۹	صيد الخاطر
۲۸۱	علم و فضیلت	۲۴۰	عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج
۲۸۲	فاطمی حکومت کا زوال اور سلطان صلاح الدین	۲۴۲	واقعات زندگی اور نفس سے مکالمہ
	کادوسر کارنامہ	۲۴۶	سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت
	شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام	۲۴۷	صلوئے امت کی سیرت
	۲۸۷ - ۳۰۲	۲۴۷	تاریخ کی اہمیت
۲۸۷	علی عظمت	۲۴۹	تاریخی تصنیفات
۲۸۹	سلاطین کو صلاح نیک و اسلام اور مسلمانوں کی غیر خواہی	۲۵۰	ادبیت و خطابت
۲۹۱	بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت	۲۵۱	وفات
۲۹۳	شیخ عز الدین مصر میں		نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی
۲۹۳	شیخ کی حق گوئی و بیباکی		۲۵۲ - ۲۸۶
۲۹۵	فرنگیوں سے جہاد	۲۵۲	صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ
۲۹۵	مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام	۲۵۴	اتابک عماد الدین زنگی
۲۹۶	امراء سلطنت کا نیلام	۲۵۵	الملك العادل نور الدین زنگی
۲۹۷	شیخ عز الدین اور سلاطین مصر	۲۵۶	نور الدین کے حماد و اوصاف
۲۹۸	مکارم اخلاق	۲۵۹	شوق جہاد اور ایمان و یقین
۲۹۹	امراء المعروف اور بنی عن النکر اور شیخ کا مسلک	۲۶۱	سلطان صلاح الدین ایوبی
۳۰۱	شیخ کی تصنیفات	۲۶۲	زندگی میں تنبیہی
۳۰۲	شیخ کی وفات	۲۶۳	جہاد کا عشق
۳۰۳	فقہہ نامہ اور اسلام کی ایک نئی آرا کش	۲۶۴	حطین کی فیصلہ کن جنگ
	۳۰۳ - ۳۰۳	۲۶۵	سلطان کی دینی حیثیت

۲۵۴	رفتار کے انتخاب کا سبب	۳۱۴	اسلام کے مشرقی ممالک تاتاریوں کی زوئیں
۳۵۵	مولانا کی وفات	۳۱۷	ہندو کی تباہی
۳۵۷	اخلاق و خصوصیات	۳۲۲	تاتاریوں میں اسلام کی اشاعت
۳۵۷	ریاضت و مجاہدہ	مولانا جلال الدین رومیؒ	
۳۵۸	نماز کی کیفیت	۳۳۵ - ۴۰۰	
۳۵۹	زہد و قناعت	۳۳۵	علم کلام و عقلیت کا بحران
۳۵۹	فیاضی و ایثار	۳۳۷	صاحبِ دل حکم کی ضرورت
۳۵۹	بے نفسی اور فنایت	۳۳۷	مختصر حالات
۳۶۰	کسبِ حال	۳۳۸	خاندان اور والدیندار
۳۶۰	اہل دنیا سے کیسوی	۳۳۸	مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم
۳۶۰	مثنوی معنوی اور اس کا علمی اور اصلاحی مقام و مقام	۳۳۹	والدین کی بلج سے ہجرت
۳۶۰	مثنوی معنوی	۳۴۰	مولانا قونیہ میں
۳۶۲	عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید	۳۴۱	آپ کے تعلیمی سفر اور شاغل
۳۶۸	دعوتِ عشق	۳۴۳	انقلابِ حال
۳۷۳	جہانِ دل	۳۴۳	شمس تبریزی
۳۷۵	مقامِ انسانیت	۳۴۴	مولانا کی ملاقات اور تغیرِ عظیم
۳۷۹	دعوتِ عمل	۳۴۶	شورشِ عام
۳۸۲	عقائد و علم کلام	۳۴۶	شمس کی غیبت
۳۸۳	وجود باری	۳۴۷	مولانا کی بے قراری اور شمس کی واپسی
۳۸۶	نبوت اور انبیاء	۳۴۸	شمس کی دوبارہ غیبت
۳۸۹	معاد	۳۴۹	مولانا کی بیتابی
۳۹۲	جبر و اختیار	۳۵۱	سفر شام اور سکونِ خاطر
۳۹۳	علت و معلول	۳۵۱	شیخ صلاح الدین زرکوب
۳۹۷	مثنوی کا اثر	۳۵۳	چلی حسام الدین
۴۰۱	اشاریہ (انڈکس) از محمد غیاث الدین ندوی	۳۵۴	مثنوی کی تحریک

دیباچہ طبع دوم

”تاریخ و محوت و عزیمت“ حصہ اول کے دوسرے ایڈیشن پر ناپچیز مصنف کتاب الشہ تبارک و تعالیٰ کے حضور میں بہ ہزار زبان ثنا خواں اور پیاس گزار ہے۔

اس حصہ کے دوسرے ایڈیشن کی فوریست کئی سال کے وقفہ کے بعد آرہی ہے، لیکن اس کی وجہ کاتبوں کی نایابی، طباعت کی دشواریوں، اور مصنف کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے سوا کچھ نہیں، ورنہ یہ کتاب برصغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں میں جس طرح مقبول ہوئی، اور جس طرح اہل علم، اور اہل قلوب نے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اور اس کے پہلے ایڈیشن کے ختم میں جتنا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اس سب کا قدرتی تقاضا تھا کہ اس وقت تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہوتے، لیکن اردو کاتبوں کی طباعت میں اب جو دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں، اور جن کا اندازہ کچھ مصنفین ہی کو ہے، انھوں نے اس کتاب کی اشاعت دوم میں غیر معمولی تاخیر پیدا کر دی، اس کے لئے مصنف کتاب متأسف بھی ہے، اور محذرت خواہ بھی۔

کتاب کے مضامین و مواد میں تعداد و عنوانات کے لحاظ سے کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوا، لیکن جو کچھ ہوا وہ وقیع اور قابل لحاظ ہے، اور اس سے کتاب کی قیمت و افادیت میں ضرور اضافہ ہوتا ہے، ان میں دو اضافے ضرور قابل ذکر ہیں، ایک عنوان ”فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش“ کے تحت تاتاری حملہ اور اس کے اسباب کے مضمون

(کا اضافہ کیا گیا ہے، اس میں (مصنف کی معلومات کی حد تک) اس وقت کے عالم اسلام کے اخلاقی، معاشرتی،

دینی، روحانی اور سیاسی حالات کا پہلی مرتبہ جائزہ لیا گیا ہے، اور اس فتنہ، عالم آشوب، اور طوفان بلائیں کے باطنی اور غیبی اسباب کو قرآن مجید کی مشعل ہدایت لے کر اور الہی قانون مجازہ کی مدد سے معلوم کرنے، اور ان کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مواد اور وقت دونوں کی کمی اور مصنف کی بعض معذوریوں کی بنا پر اس باب میں اضافہ اور ترقی کی بڑی گنجائش ہے، لیکن یہ ایک ابتدائی کوشش اور ایمانی فکر و نظر کا ایک نمونہ ہے، جس کو بہت آگے بڑھایا جاسکتا ہے، بایں ہمہ وہ اس موجودہ حالت میں بھی عبرت و بصیرت اور درس و موظمت سے خالی نہیں، دوسرا اضافہ مقدمہ کتاب میں دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی کے زیر عنوان کیا گیا ہے، جس میں مسیحیت، اور ہندومت کی اصلاح و تجدید کے بارے میں کچھ نئے معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، ان اضافوں کے علاوہ اس ایڈیشن میں صرف پہلے ایڈیشن کے اغلاط کی تصحیح اور قلیل التعداد جزوی ترمیمات ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف کی یہ سعی مقبول ہو، اس سلسلہ کی ترتیب میں جو مقاصد پیش نظر رہے ہیں اور جن کا تذکرہ پیش لفظ میں کیا گیا ہے، ان کی تکمیل ہو۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

۳ صفر المظفر ۱۳۸۹ھ
۲۱ اپریل ۱۹۶۹ء دو شنبہ

پیش لفظ

محرم ۱۳۷۲ھ میں لکھنؤ میں جماعت دعوت اصلاح و تبلیغ کی طرف سے انتظام کیا گیا کہ رفقا کے سامنے ضروری عنوانات اور پہلوؤں پر تقریریں کی جائیں اور ان کی واقفیت اور ذہنی تربیت کا سامان ہم پہنچایا جائے۔ ان تقریروں اور مضامین کا سلسلہ ایک ہفتہ جاری رہا، اس تربیتی ہفتہ میں ایک طویل اور مسلسل عنوان ”اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں“ تھا، یہ عنوان راقم سطور کے حصہ میں آیا تھا، اور تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر عرض کیا جاتا رہا، اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی، جس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے، احباب اس کا خلاصہ اپنے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔

بعد میں اشاعت کی نیت سے جب اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ کام بڑی توجہ اور اطمینان سے کرنے کا ہے، اور یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے، جس پر (ہمارے محدود علم کے مطابق) کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں، اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلا ہے، جس کو جلد پر ہونا چاہئے، اس خلا کے موجود ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں، جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کئی کئی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں، جنہوں نے حالات سے کشمکش کی، اور

(جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، جو فکری اور عملی

حقیقت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے، اور جن کے علمی و علمی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷-۸ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور یا یوسی ہے، جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت و عربیت کو پیدا کرتی رہی ہے، اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک حساس کہتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

لیکن نتیجہ بے سبب نہیں، بد قسمتی سے تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرہ میں یا تو وہ کتابیں ملتی ہیں، جن کو واقعات کی "فہرست" کہنا صحیح ہے، اور جن کی مرکزی شخصیت بادشاہوں کی ذات ہے یا چند نمایاں شخصیتوں کی سوانح (تراجم و تذکرے) مگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ نہیں، جن میں ان تمام شخصیتوں کی تحریکوں کا تعارف ہو، جنہوں نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے، اسلام کی بروقت حفاظت یا تجدید و تقویت کی خدمت انجام دی ہے، غلط رجحانات کی اصلاح اور عقوتوں کا سد باب کیا ہے، اور اسلام کے فکری اور علمی ذخیرہ میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہے، درحقیقت اسلام کے سلسلہ دعوت و اصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب و تالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پرکرن وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی و علمی خدمت ہے۔

اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح و دعوت کی تاریخ مرتب ہو جائے گی، بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری و علمی انحطاط و ارتقاء کی تاریخ بھی وجود میں آجائے گی۔

لیکن جب اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ یا رسالہ کا مضمون نہیں ہے، یہ ایک اہم اور ضخیم تصنیف کا موضوع ہے، اس کے لئے تاریخ کو دوبارہ پڑھنا ہوگا، اور اس کو ایک خاص انداز سے مرتب کرنا ہوگا، اس کے لئے صرف تاریخ عام کا جائزہ لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ مذاہب و فرق، علوم و فنون کی تاریخ اور تراجم و تذکرے

(کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھنا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون جس سکون و اطمینان اور فرصت کا طالب ہے، وہ اس

پریشان اوقات کی زندگی میں بہت کیاب ہے، پھر بھی ضرورت کے احساس نے اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور طبیعت کی افتاد سرسری طور پر گزرنے سے مانع ہوئی۔

یہ بات ناظرین کرام کے پیش نظر رہے کہ اس کتاب میں ہمیں اصطلاحی تجدید سے بحث کرنا نہیں ہے، نہ ان اشخاص کا تعین کرنا ہے، جو اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں، اور جن کی واحد ذات نے دینی انقلاب برپا کر دیا، اور تجدید کے شرائط پورے کئے، یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلابِ حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے اور ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشان دہی کرنی ہے، جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے، اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے، اور مسلمان اس وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، اس مضمون میں متعدد ایسے اشخاص کا تذکرہ آئے گا، جو انفرادی طور پر تو مجدد نہیں کہے جاسکتے، مگر دین کی تجدید احیاء اور اصلاح و انقلاب کے مجموعہ میں ان کا ضرور حصہ ہے، اور مسلمان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے:-

(۱) کسی دعوت یا شخصیت کے حالات و مقاصد معلوم کرنے کے لئے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی گئی ہے، اگر اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی، اور غلطہ گیا، تو اس کے رفقاء و تلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات و بیانات کو ترجیح دی گئی ہے، آخری صورت میں بعد کے مستند ماخذوں پر اعتماد کیا گیا ہے، اس بارے میں کسی زبان یا زمانہ کی تخصیص نہیں، جہاں کوئی کام کی بات دیکھی گئی، اخذ کی گئی، اور اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

(۲) شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلے میں ان کے گرد و پیش، اس زمانہ کی علمی و فکری سطح، اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے، اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا

جاسکے، کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لا کر اپنے زمانہ کے پیانوں اور تقاضوں اور اپنے

ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں

کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے جس سے کتاب سطحی نظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیح بن جاتی ہے، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی نا انصافی اور کوتاہ نظری ہے، اس لئے کہ آدمی اپنے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور اس عہد کے میدان عمل کے حدود کے لحاظ سے کامیاب و ناکامیاب کہا جاسکتا ہے، ورنہ عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جاسکتی ہے، اور نہ صرف اسلامی تاریخ، بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جاسکتی۔

(۳) کسی صاحب دعوت یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے چند مختصر اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی کہ اس سے اس کے مقاصد، اس کے علمی مرتبہ اور اس کے ذہن کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہو سکتا، اور قارئین اس کا لطف صحبت اور شرف ملازمت حاصل نہیں کر سکتے، اس کتاب میں ممتاز صاحب دعوت، مصلحین، مصنفین اور اصحاب فکر کی تصنیفات و خطابات کے اتنے مختلف اور مبسوط اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا کچھ وقت ان کی صحبت میں گزرا، اور اس کو اطمینان کے ساتھ ”دید و شنید“ کا موقع ملا ہے، اس کے لئے خود مؤلف کتاب نے اپنے وقت کا ایک معتدبہ حصہ ان حضرات کی تصنیفات و مواعظ، اور ان کے علمی و فکری آثار کے ماحول میں گزارا اور کوشش کی ہے کہ ان کا تذکرہ اور تعارف کرانے کے زمانہ میں وہ اپنا وقت خالص اسی ماحول میں گزائے اور ان اثرات و کیفیات کو اپنے اوپر طاری ہونے کا موقع دے، جو ان کے معاصرین اور ہم نشینوں پر طاری ہوتی تھیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں مؤلف کتاب کا قلبی رجحان صاف معلوم کر سکیں گے، اور ان کو زبان میں بھی تغیر اور صاحب ترجمہ کی زبان وادب سے مناسبت نظر آئے گی، یہ بات اگر کسی نقاد کی نگاہ میں قابل اعتراض اور کتاب کی کمزوری شمار کئے جانے کے قابل ہے، اور اس کے نزدیک مورخ کو اپنے قلم کی طرح ”چوب خشک“ اور ناقص

لے ضمیر ہونا چاہئے تو مصنف اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے، اور اس کے لئے کسی محذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

(۴) تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ

ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ اولاً تو یہ متقدمین اہل دعوت و اہل فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور عملی انہماک کے ساتھ عبادت و انابت الی اللہ کا ذوق خاص رکھتے تھے، اور ان کی کامیابی و مقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے، اور اس کے تذکرہ کے بغیر ان کا تذکرہ نامکمل رہتا ہے، دوسرے اس ضخیم تصنیف اور تاریخ کے اس وسیع دفتر کے پڑھنے والے کا یہ حق اور اس کی محنت اور دقت کا یہ خاموش مطالبہ ہے کہ وہ اس سے صرف تاریخی معلومات ہی اخذ نہ کرے، بلکہ قلب و روح کی تازگی اور ذوق عمل کا حصہ بھی پائے۔

(۵) کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل و کمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اگر اس کے منصف و محتاط معاصرین یا صاحب نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات و افکار پر تنقید کی ہے تو اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے، اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے، اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے، تو اس کو بھی پیش کر دیا گیا ہے، لیکن تاریخ کو ناقدرانہ تالیف ثابت کرنے کے لئے بے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

یہ کتاب کی پہلی جلد ہے، پہلے خیال تھا کہ یہ جلد شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر تمام ہوگی، اس طرح اس حصہ میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کی تاریخ دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کی روداد آجانی لیکن ابن تیمیہ کا تذکرہ (ان کے زمانہ کی اہمیت اور ان کے کام کی وسعت کی بنا پر) اتنا مبسوط ہو گیا کہ اس کو کتاب کا ایک مستقل حصہ بنانا پڑا، جو اس سلسلہ کی دوسری جلد ہوگی، کتاب کا تیسرا حصہ (اور شاید چوتھا بھی) ہندوستان کے اہل دعوت و عزیمت کے ساتھ مخصوص ہوگا، جو پچھلی صدیوں میں عالم اسلام میں اصلاح و تجدید کے علمبردار اور فکر و تحقیق کا منبع و سرچشمہ تھے۔

آخر میں مولف کو صاف اعتراف ہے کہ اس کتاب کے لئے جتنی طویل مدت تصنیف، جیسا سکون خاطر،

جنتنا وسیع و عمیق مطالعہ، اور جیسا وسیع اور متنوع علم درکار ہے، مصنف اس سے بہرہ مند نہیں، لیکن جو کچھ بھی

اس عرصہ اور ان حالات میں ہو سکا، اور جو ناظرین کے سامنے ہے، وہ مصنف کی پریشان خاطرگی، انتشار و ہنسی اور

علمی بے بضاحتی کے پیش نظر محض تائید الہی اور توفیقِ خداوندی ہے، وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ

اللّٰهِ۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ حضرت شاہ علم اللہ راءے بریلی

۴ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ

مقدمہ

اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاقْضَيْتُ عَلَيْكُمْ

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا

نِعْمَتِي وَرَضَيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا

اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حقیقت

سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کر چکا۔ (المائدہ - ۳)

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اس کا

شباب ہر وقت قائم ہے۔ ع

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر

جس دین کو بھیجا ہے، اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی حقائق و حقائق" پر ہے، مگر وہ زندگی سے پُر ہے، اور حرکت اس کی

رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے، اور

ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے، جو

اس دور کی یا دگوروں کے اندر محفوظ ہو، اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے، جو عظیم و حکیم صانع کی صنعت کا

ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (الانعام ۱۲) یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا۔

صُنِعَ اللَّهُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا شَيْءٌ (زل ۸۸) کاریگری الٰہی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

اُمّتِ اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے، اور یہ امت آخری اور عالمگیر اُمّت ہے، اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ پڑے گا، اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے، وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے، اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے، وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور مکان و زمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا آسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا ہے گا، جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ اُمّت تاریخ عالم میں

جیسی ”مردم خیز“ ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ خاص اتفاقی بات نہیں ہے،

بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی، اور زہر کو جس تربیاق کی حاجت تھی، وہ اس امت کو عطا ہوا۔

اسلام کے قلب و جگر پر حملے

شریع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرے مذاہب ان کی تاب نہیں لاسکتے، دنیا کے دوسرے مذاہب جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی، اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہارہ سکے، اور انہوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی، اور اپنی اصل شکل میں قائم رہا، ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں، اسلامی روح، اور اس کے نظام عقائد کے لئے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھودیتا، اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کر لے گیا، اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی، بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجی اثرات، مشرکانہ اعمال و رسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشتات، الحاد و لادینیت اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بار بار حملہ ہوا، اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لاسکے، اور ان کے سامنے سپردال دے، لیکن امت مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا، اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی، ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے، جنہوں نے تحریفات و تاویلات کا پردہ چاک کر دیا، اور حقیقت اسلام اور دین خالص کو اجاگر کیا، بدعات اور عجی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پُر زور حمایت کی، عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کڑی ضرب لگائی، تعیشتات اور اپنے زمانہ کے "مترفین" کی سخت مذمت کی، اور جابر سلطان کے سامنے

ظہر حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی، یہ افراد داعی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے، اور طاقتور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لئے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "یدِ بریضا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا، اور حق روشن ہو گیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے، اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور امت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد کھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات و بدعات کے غرض سے نکلے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقتِ ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پُر زور مدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لئے کمر بستہ ہو کر میدان میں آجائے، اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانیوں سے اس مذہب کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دے۔

اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے، وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی میں ایسی تحریک کا شکار ہوئی، جس کی نظر اس دور کی تاریخ مذاہب میں کہیں نہیں ملتی، وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب ہے ایک ایسے مشرکانہ مذہب میں تبدیل ہو گئی، جس کو یونانی اور بودھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰-۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا، یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے

دوسری روح، ایک نکل سے دوسری نکل، اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایک ایسی جست یا پھلانگ کے مترادف ہے جس میں

پہلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا، ایک سچی فاضل (ERUSET DE BUNSEN) اس تغیر و انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول و عمل سے کبھی نہیں ہی تھی اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں و مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے اس کی ذمہ داری حضرت مسیحؑ کے سر نہیں ہے بلکہ یہ سب اس یہودی عیسائی بے دین پال کا کرشمہ ہے، نیز صحت مقدس کی تشکیل و تحمیم کے طریقہ پر تشریح اور ان صحیفوں کو پیش گوئیوں اور شاہدوں سے بھر دینے کا نتیجہ ہے، پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہب یارانی (ESSENIO) کا داعی ہے حضرت مسیحؑ کے ساتھ بہت سی بودھ رسوم و الہتہ کر دیں، آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور واقعات ملتے ہیں اور جو حضرت مسیحؑ کو ان کے مرتبہ سے بہت فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں، وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں حضرت مسیحؑ نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے، جس کو آرتھوڈوکس سچی دینا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے۔“

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا، اور اس پوری مدت میں سچی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر حقیقی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرے، اور اس نقطہ کی طرف واپسی کی کوشش کرے، جس نقطہ پر حضرت مسیحؑ اور ان کے خلائف اور تبعین چھوڑ کر گئے تھے، صدیوں پر صدیاں بیت گئیں، اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا جو مسیحیت کے ان نئے اور بیرونی اجزاء کو علیحدہ کر سکے، آخر کار پندرہویں صدی سچی میں مارٹن لوتھر (M. LUTHER) جرمنی میں پیدا ہوا، اور اس نے بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قدم کی اصلاح کی، یہ کوئی جوہری یا عمومی اصلاح نہ تھی، اور نہ مسیحیت کے غلط فہم اور اس کے انحراف کے خلاف کوئی بغاوت، گویا مسیحیت کی تاریخ کی تقریباً پندرہ صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہیں اور اس عرصہ میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، مسیحی

فضل کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں سچی دنیا میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی جو مسیحیت کی اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. BASSMULLINGER) لکھتا ہے :-

”اگر ہم اس کے ابواب تلاش کریں کہ سو لہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں جوڑی کامیابی بھی کیوں نہ ہوئی تو بلا کسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب تو رومن کتھی کے ذہن کی ماضی کی مثالوں کی غلامی تھی۔
دوسری جگہ لکھتا ہے :-

”جوہر کے اصلاح کی کوئی جامع تجویز رونے کا لانے کی ان کی مسلسل کوششوں کی ناکامی یورپین تاریخ کی ایک جانی بھی حقیقت ہے۔“

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے :-

”سو لہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں، متحدہ اور بعض بہت یادگار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں، لیکن بلا استثنا ان سب کو کلیسا کی سخت و طاقت کا شکار ہو جانا پڑا تھا۔“

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو کلیسا کے خرافات و اوہام اور اس کی زبردستیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا، اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لو تھر نے (اپنے مخصوص دائرہ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔
غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی، جس کو اس نے اپنے لئے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے سرخوہ ویا گیا تھا، کلیسا کا اثر کم بڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا، یورپ میں مادیت کی حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور مغرب کے ہر مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا، جو اس مادیت کا مقابلہ کرتا، اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا یا

عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرنا، ان سب میں وہ روحانی و اخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے

ان زبردست تفسیروں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے، اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکے، جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی عقائد پر قائم ہو، اور جہاں نئے زمانہ کے سوالات، عصر جدید کے مسائل کا حل اس کی روشنی میں ممکن ہو، اس کے برعکس یہ ہوا کہ عیسائی مفکرین، مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے خود بالوس ہو گئے، اور لادینی مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس بہتری پیدا ہو گیا۔

یہی قصہ مشرق کے مذاہب کے ساتھ بھی پیش آیا، ہندو مذہب بھی اپنی اصل راہ سے بالکل ہٹ گیا، اس نے اپنی سادگی اور اخلاقی کائنات سے براہ راست روحانی نسبت بالکل کھودی، اخلاقی قوت بھی مفقود ہو گئی، اور اپنی پیچیدگی کی وجہ سے وہ محض ایک دقیق اور غیر عملی فلسفہ بن کر رہ گیا، اور رفتہ رفتہ عقائد میں توحید خالص اور معاملات میں مساوات دونوں اہم چیزوں کا سرشتہ اس کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا، اور یہی وہ دواہم بنیادیں تھیں جن پر کوئی ایسا مذہب قائم ہو سکتا ہے جس کی جڑیں باطن میں مضبوط ہوں، اور شاخیں ظاہر میں پھیلی ہوئی ہوں۔

انیشد کے مصنفین نے بہت کوشش کی کہ اس فساد کا تدارک کریں، چنانچہ انھوں نے ان رسوم کو جو ہندو مذہب اور ہندو سماج پر پوری طرح چھا گئی تھیں، مسترد کر دیا، اور اس کی جگہ ایک ایسے فلسفیانہ اور تصوراتی نظام کو پیش کیا، جو کثرت میں وحدت کے نظریہ پر قائم تھا، نئی تصویر ہندو مذہب کے علمی حلقوں میں تو ضرور پسند کی گئی، اس لئے کہ ان کا رجحان شروع ہی سے وحدۃ الوجود، ہمہ دوست کی طرف تھا، لیکن عوام نے جن کی فکری سطح پست تھی، اور جو عملی نظام اور عملی تعلیمات کے خواہشمند تھے، اس بات کو قبول نہ کیا، اور اس طرح ہندو مذہب رفتہ رفتہ اپنی قوت و تاثیر کھوتا رہا، اس کی طرف سے بے اعتمادی اور بے اطمینانی روز بروز بڑھنے لگی، ہندو سماج کی یہی بے اطمینانی اور بے چینی تھی، جس نے آگے چل کر بودھ کی شخصیت میں جنم لیا، یہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سامنے آیا۔

بودھ نے ایک نیا فکر یا ایک نیا مذہب (اگر اس موقع پر لفظ مذہب کا استعمال درست ہو) پیش کیا جو ترک

نویا، تہذیب نفس، خواہشات سے مقابلہ، رحم دلی و ہمدردی، خدمت و عمل اور رسوم و عادات اور طبقاتی کشمکش

کی تردید و مخالفت پر قائم تھا، جو ہندو سماج میں آخر زمانہ میں بہت نمایاں ہو گئی تھی، یہ فکر یا یہ مذہب بہت سرعت

کے ساتھ پھیلا اور ایشیا کے جنوبی اور مشرقی حصہ پر جو بھارت اور بحر الکاہل کے درمیان واقع ہے، اس کا تسلط قائم ہو گیا۔

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ زبردست مذہبی تحریک بھی اپنے راستے سے ہٹ گئی، اور تحریک کا شکار ہو گئی، موزمبیقا اور سوم وغیرہ جن کے خلاف اس مذہب نے علم بغاوت بلند کیا تھا، اس پر پھر سے حملہ آور ہوئے یہاں تک کہ اس کے آخر دور میں وہ بھی شرک اور مورتی پوجا کا مذہب بن کر رہ گیا، جو اپنے پیشرو ہندو مذہب کے مورتیوں کی اقسام اور ان کی تعداد کے سوا کسی اور چیز میں مختلف اور بہتر نہ تھا، اس کی اخلاقیات کو بھی زوال ہوا، افکار و خیالات میں پیچیدگی اور بڑھ گئی، نئے نئے فرقے اور مذہبی گروہ قائم ہو گئے، پروفیسر ایسٹورٹو اپنی کتاب ”ہندوستانی تمدن“ میں لکھتے ہیں :-

”بودھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی، جس میں اوتاروں کی بھارا اور مورتی پرستی کا دور دورہ دکھائی

دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی، اس میں بدعتیں اور بدعتیں کے بعد دیگرے نظر آ رہی تھیں“

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب ”تلاش ہند“ (DISCOVERY OF INDIA) میں بدھ مت کے بگاڑ اور

تدریجی زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنایا، اور بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دو ٹوٹے ہوئے، اور ایک خاص عبادت

کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا، عبادت کے طریقوں میں سحر اور ادا م داخل

ہو گئے، اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تشریف شروع ہو گیا، اس عہد

میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی، (MRS. RHYS DAYIS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

”ان مریضانہ خیالات کے گہرے سایہ میں اگر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہو گئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور

اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لی اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضائیں

لے بودھ مت کے لئے فقط مذہب کے استعمال میں مجھے تردد اس لئے ہے کہ اس میں خالق اور مبداء و معاد کے سلسلے میں کوئی عقیدہ یا نظریہ

نہیں ملتا، اور اکثر مصنفین و مؤرخین کی یہ رائے ہے، دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا لفظ بودھ (BUDDHA)۔

ہندوستانی تمدن (اردو) ایسٹورٹو

ذہن کا ان پُر فریب تخلیقوں سے گھٹا ٹپ اندھیرا چھا گیا اور بانی مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان ایسا ہی موٹا گائیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔

مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہوئی، اور ان میں اکثر بتدزل رسوم داخل ہو گئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، اس وسیع بودھ دنیا میں اور اس کی حکمرانی کی اس طویل مدت میں کوئی ایسا مصلح سامنے نہ آیا، جو حقیقی بودھ مت کی طرف دعوت دے، اور اس جدید اور مخرب مذہب کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے، اور اس کا گذشتہ دور شباب اور اس کی گم شدہ سادگی اور صفائی پھر سے واپس لے آئے۔

غرض قدیم ہندو مذہب، بودھ مت کے سامنے بالکل پنپ نہ سکا، یہاں تک کہ آٹھویں صدی عیسوی میں شکر آچاریہ نے بودھ مت کی مخالفت اور قدیم ہندو مذہب کی اشاعت کا علم بلند کیا، اور آخر کار اس کو اس ملک سے تقریباً باہر کر دیا، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حیثیت ہندوستان کے بہت سے مذاہب میں ایک قدیم روبروال اور محدود مذہب کی رہ گئی، شکر آچاریہ نے اپنی ذہانت، مذہبی جرأت اور جوشِ عمل سے یہ تو کیا کہ بودھ مت کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا، لیکن وہ اس باب میں کامیاب نہ ہوئے (بلکہ شاید اس کا انھوں نے سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کہ قدیم ہندو مذہب کو اس کی پہلی اور حقیقی شکل پر واپس لے آئیں، اس میں توحید کا عقیدہ، خالق کائنات کے براہِ راست اتصال، بندہ اور خدا کے درمیان واسطوں کی نفی، اجتماعی انصاف اور طبقاتی مساوات کی رُوح پیدا کریں، چنانچہ آج تک یہ دونوں ہندوستانی مذاہب اپنی بدلی ہوئی ہئیت پر قائم ہیں، اور دورِ انحطاط کی میراثِ رسوم و عادات اور موریوں کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں، مذاہب و اخلاق کے انسائیکلو پیڈیا (ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS) کے مقالہ نگار (V.S. GHATE) جو افسسٹن کالج بمبئی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور ہندوستان کے قدیم مذاہب و فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، شکر آچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اس نظامِ مذہب اور فلسفہ کا زندہ کرنا تھا، جس کی ”اوپنیشہ“ میں تعلیم دی گئی ہے۔“

اس نے مطلق وحدۃ الوجود کے عقیدہ کو رائج کر دیا، اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ یہ بتائے کہ ”اوپنشیہ“ اور جگوت گیتا میں قانون پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مکمل وحدۃ الوجود کی تعلیم ہے، شکر آچاریہ نے بت پرستی کی نہج لغت کی اور نہج حلہ کیا، اس کے نزدیک بت ایک رمز اور مظہر ہیں، شکر آچاریہ نے رسمیت (RITUALISM) اور کرما کی مذمت کی، لیکن مقبول عام دیوتاؤں کی پرستش کی طرف سے مدافعت کی، اپنے نشوونما کی ایک خاص منزل میں بت پرستی ہماری حضرت کی ایک ضرورت ہے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے تو پھر بت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی ہے، علامتوں اور رموز کو ترک کر دینا چاہئے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے، شکر نے بتوں کی اجازت دی، بحیثیت ایک علامت کے ان لوگوں کے لئے جو ایسے رہنوں کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکے، جو صفات سے آزاد اور ناقابل تبدیل ہوں۔

بہر حال وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، جو شکر آچاریہ سے لے کر دیانند سرسوتی اور گاندھی جی تک کی گئیں، اور جن کا مقصد اس مذہب کا اس کی ان صحیح بنیادوں پر احیا تھا، جو نبوت کی دعوت انسان کی فطرت سلیم اور تغیر پذیر عہد کے ساتھ ہم آہنگ ہو، ان دونوں مذاہب نے آخر کار مادیت و لادینیت کے سامنے بالکل سپردال دی ہے، اور زندگی سے کنارہ کش ہو کر عبادت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں پناہ لی ہے، اور رسوم و عادات اور ظاہری اشکال میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسی طاقتور دعوت نہیں جس کا نعرہ اور جس کا منشور یہ ہو (پھر سے مذہب کی طرف آؤ) اس کے برعکس ایسی تحریکیں بہت بیدار اور طاقتور ہیں، جن کا نعرہ اور اصول یہ ہے کہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرو، اور ہندوستان کی قدیم تاریخی زبان ”سنسکرت“ کو پھر سے ملک میں رائج کرو۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ و دنوں تک برقرار نہیں

لے، ان خود از مقالہ شکر آچاریہ یا مختار انتخاب ملاحظہ ہو۔

رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح بھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوت عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جواں ہیں، مادیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتہً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُر جوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنہوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔ ع

اگرچہ پیر ہے مومن جواں ہیں لات و منات

اس کا مقابل جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا، اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی ہے گی، تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہر نئے فتنہ اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت و طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کے اس طویل اور پُر آشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت ایسی نہیں پائی جاتی، جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی حقیقت اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امت اسلام کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو، اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب بھی اسلام کے لئے کوئی فتنہ نمودار ہوا، اس کی تحریعت اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی، یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا، اور اس کو میدان سے ہٹا دیا، بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں، جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف

کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے، کتنے آدمی ہیں، جو قدرت، جہمیت، اعتراف، خلق قرآن

وحدۃ الوجود اور اکبر کے دین الہی کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد و مذاہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جدوجہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنی اسلام کی تاریخ، اور ایسا ہی سلسلہ ہے، جیسی مسلمانوں کی زندگی۔

تاریخ کے گم شدہ مآخذ

لیکن اس کی ذمہ داری صرف مؤرخین پر عائد نہیں ہوتی، اس کے ذمہ دار وہ تمام لوگ ہیں، جو تاریخ کی اصطلاحی اور سرکاری حیثیت کے سوا کوئی اور حیثیت ماننے پر تیار نہیں، اور کسی ایسی کتاب کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے جو کسی کتب خانہ میں تاریخ کی الماری کے اندر نہ ہو، یا فن تاریخ کے تحت درج نہ ہو، حالانکہ ایسی بہت سی کتابیں اپنے اندر تاریخ کا بہت قیمتی ذخیرہ رکھتی ہیں، اور ان کو بہت اہم مآخذ قرار دیا جاسکتا ہے، یہ وہ ادبی اور دینی کتابیں ہیں، جن میں ان داعیوں اور مصلحین امت نے اپنی دلی احساسات و کیفیات کو بے نقاب کیا ہے، اور اپنی زندگی کے اہم واقعات اور تجربے راجع کئے ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں، جن میں شاگردوں اور مریدوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ کے نصائح و ملفوظات اور حقائق و معارف قلم بند کئے ہیں، اور ان کی پُر اثر اور بابرکت مجلسوں کی رونمائی پیش کی ہے، یہ کتبوبات اور مواظف کے وہ مجموعے ہیں، جن سے ان کے خیالات و افکار اور جذبات و کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں جو اعتساف سوسائٹی پر تنقید اور بدعات و منکرات کے رد و ابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی مآخذ تک وسیع ہو سکتا اور کوئی وسیع النظر نگاہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر رجح کر

کام کر سکتا تو ایک مربوط و مکمل تاریخ اصلاح و تجدید پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ

دعوت و عزیمت دونوں چیزیں اس امت کے ہر دور اور ہر مرحلہ میں اس کا ساتھ دیتی رہیں، اور انھوں نے بھی اس کو بالیس اور محروم نہیں کیا۔

اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہمارے ہاتھ میں پہنچی (اور جس کو ہم میراث) کے معنی میں نہیں بول رہے ہیں، جو اہل مغرب کا مفہوم ہے، اس لئے کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، ہم میراث سے وہ دولت اور ثروت مراد لیتے ہیں، جو ہمارے اسلاف سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، علم راسخ، محفوظ و مضبوط عقائد، طاقتور ایمان، سنتِ سنیت، اخلاقِ عالیہ، فقہ و شریعت اور شاندار اسلامی ادب کی ثروت، اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے، جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاجِ خلافت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے خصائص مٹ گئے تھے، ان کو اُجاگر کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اس لازوال ثروت میں ہر شخص کا اضافہ تسلیم کیا جائے گا جس نے اس دین پر اس کے آخذاور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سر نو استوار کیا، نوادہ فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس... امت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لئے اس کے دین اور مصادرِ دین کی حفاظت کی، حدیث و فقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا، اور امت کو تشریح کا خزانہ عامہ اور زندگی و معاشرہ کا منظم قانون عطا کیا، جس نے معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا، اور اس کے انحراف اور کج روی پر کھل کر تنقید کی، اور صحیح حقیقی اسلام کی برلاؤ آشکارا دعوت دی، جس نے شکوک و شبہات کے دور اور اضطرابِ عقائد کے زمانہ میں علمی طرز استدلال اختیار کر کے دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی، جس نے دعوت و تذکیر اور انداز و تفسیر میں انبیاء علیہم السلام کی نیابت کی، اور ایمان کی دلی ہوئی چنگاریوں کو شعلہٴ جوالہ کی حرارت و حرکت بخشی، جس نے مادہ پرستی کے تند و تیز دھارے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تیزی و بلا خیزی کم کی، اور خدا کی مخلوق کو اس دھارے میں بہ جانے یا اس میں دب جانے

سے محفوظ رکھا جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے درپے خارجی حملوں کو سہارا لینے کی قوت عطا کی جس نے اپنی حکیمانہ دعوت اور اپنے دامِ محبت سے اس دشمن کو شکا کر کیا، جو زورِ شمشیر اور نوکِ خنجر سے بھی زیر نہ ہو سکا تھا، اور جس نے عالمِ اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا جس نے اپنے طاقتور ایمان اور اپنی روحانی قوت سے ایسے دشمنوں کو خطرہٴ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا شرف بخشا، جس نے اپنے طاقتور ادب اور دل گداز و ملیح اشعار سے ان ذہنوں کو اسیرِ دام کیا، جو علمی بحث اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے، یہ پورا ایک سلسلہ ہے اور اس میں ہر شخصیت کا ایک خاص حصہ اور مرتبہ ہے، تاریخ دراصل امانت کی ادائیگی اور حق شناسی اور اعترافِ حقیقت کا نام ہے، ان میں ہر شخص اسلام کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے ترکش کا ایک قیمتی تیر تھا، اگر ان لوگوں کی مخلصانہ کوششیں نہ ہوتیں، جن کو آج ہم تاریخ کی دور میں سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو ہم تک یہ مجموعہ نہ پہنچ پاتا، جس میں ہمارے لئے عزت، عبرت اور وعظمت کا وافر سامان موجود ہے، اور جس کی موجودگی میں ہم اقوامِ عالم کے سامنے بجا طور پر اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

اس مسلک اور ان خطوط پر جو مصنف کے نزدیک منصفانہ اور عادلانہ مسلک ہے، اس نے آئندہ صغیٰ میں ان اہم شخصیتوں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جنہوں نے دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کے میدان میں کوئی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ و بید اللہ التوفیق

پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں

اور
عمر بن عبد العزیزؓ

عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات

خلافت راشدہ کے اختتام، اور بنی امیہ کی حکومت کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید و انقلاب کی فوری ضرورت پیدا کر دی، قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت و تربیت اور خلافت راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا، کتاب سنت نہیں رہا، بلکہ عربی سیاست اور مصالح ملکی، بن گیا، تفاخراؤ عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے شہر بدر کر دیا تھا، اور جو بادیہ عرب میں پناہ گزیں تھی، پھر واپس آ گئی، قبائلی غرور خاندانی جنبہ داری، اعتراف پروری جو خلافت راشدہ میں سخت عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی، ہزاروں محاسن بن گئے، اعمال و اخلاق کے محرکات (بجائے اجر و ثواب کے) جاہلی ناموری، مدح و تعریف اور تقویٰ ہو گئے،

لے اس سلسلہ میں جاہلیت کا جذبہ مبالغت اور شہرت و عزت پونے طور پر زندہ اور بیدار ہو گیا تھا، اس ذہنیت کا اندازہ اس دیکھ چپ واقعہ سے ہو سکتا ہے، جو ابو الفرج اصفہانی نے افغانی میں نقل کیا ہے کہ عہد اموی کے دو عرب سرداروں حوشب اور عکرمہ کے درمیان عرصہ اس بات کا مقابلہ تھا کہ کس کے یہاں کھانا زیادہ تیار ہوتا ہے، اور همان زیادہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں حوشب کا پورا اکثر بھاری رہتا، ایک عرصہ بعد عکرمہ نے اپنے حلیت کو رک دینے کے لئے یہ تدبیر کی کہ صد باوریاں آئے کی خریدیں اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کر دیں کہ آگاہ نہ لیا جائے، اس گندھے ہوئے آٹے کو اس نے ایک بڑے گڑھے میں بھر دیا، اور اوپر سے گھاس ڈال دی، اور اس کا انتظام کیا کہ حوشب کا گھوڑا اس گڑھے میں گر جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اگر گھوڑا گندھے ہوئے آٹے کی اس خندق میں جا پڑا اور آٹے میں لت پت ہو گیا، اور دھوم مچ گئی کہ عکرمہ کے یہاں اس مقدار میں کھانا گندھا ہے، گھوڑا اس میں گر گیا، لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے دیکھا تو گھوڑے کا سر اور گردن باہر تھی، اور سارا جسم (باقی صفحہ پر)

بیت المال (جو مسلمانوں کے پیسے سے جمع ہوتا تھا) خلیفہ کی ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا تھا، پیشہ ور شعرا و خوشامدی درباریوں اور آبرو باختر مصاحبین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا، جس پر مسلمانوں کی دولت بیدل صرف ہوتی تھی اور ان کی بے عنوانیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی، گناہ سنانے کا ذوق اور موسیقی کا انہماک حد کو پہنچ گیا تھا، حکومت کی غلط رویہ اور اہل حکومت کی بے دین زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہو رہی تھی، اور مترفین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس کے اخلاق قدیم مترفین سے ملتے جلتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ جیسے زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حولیت سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے، اور چالیش برس کا حساب ایک دن میں پورا کرنا چاہتی ہے۔

عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر

بنی امیہ کے اس مادی اقتدار اور اس کے قدرتی اثرات کے باوجود اس عہد تکین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا، جو دینی علمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، اور اپنی تلہیت، اخلاص، پاکیزہ نفسی، اور علم و تفقہ میں مشہور و معروف تھے، حکومت و انتظام کے دائرہ سے باہر انہی حضرات کا اثر و اقتدار تھا، اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے، اور مادیت کے سیلاب میں بالکل بہ جانے سے رکے ہوئے تھے، ان دینی شخصیتوں میں سب سے با اثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ علی آباء السلام) کی تھی، جو جہاد و تقویٰ اور زہد و توحید میں اپنی نظیر نہیں

(باقی ص ۳۳) ڈوبا ہوا تھا، ربیبوں اور بیویوں سے اس کو بڑی مشکل سے نکالا گیا، عام طور پر اس واقعہ کی شہرت ہوئی، اور شعرائے اشعار کہے اس طرح حکمران نے اپنے حولیت کے مقابل میں فتح حاصل کر لی، اور اپنا تقویٰ تسلیم کر دیا (از رتات اثنالث جلد ۱ ص ۱۳۹-۱۴۰) ۱۔ اموی عہد کا مشہور صحابی شاعر (م ۹۵ھ) خلیفہ عبد الملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آنا کہ گھڑیوں کی صلیب پر آؤں اور اسی کے ہاتھوں سے شراب کے قطرے چمکتے، اور کوئی اس کو ٹوکنے والا نہ ہوتا (اغانی ج ۷ ص ۷۸) ۲۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو گا کہ ایک مرتبہ عراق کا مشہور مفتی حنفی اپنے ہم پیشہ لوگوں کی دعوت پر مدینہ منورہ آیا، اور ایک مکان میں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، سننے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ چھت بیٹھ گئی، اور خود حنفی دب کر مر گیا۔

رکھتے تھے، مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں طوات کے لئے آیا، شہرتِ ہجوم کی وجہ سے وہ حجر اسود تک نہیں پہنچ سکا، اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام کرے، اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے، ان کا آنا تھا کہ مجمع کافی کی طرح چھٹ گیا، اور انھوں نے بآسانی طوات و استلام کیا، وہ جدھر سے گزرتے، لوگ ہزار ہا راستہ چھوڑ دیتے تھے، ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہد اموی کے مشہور شاعر فردق نے برجستہ اشعار میں اس کے تجاہل عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایانِ شان تعارف کرایا۔

اسی طرح دوسرے فضلاء اہل بیت حضرت حسن المثنیٰ، اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ المحض نیز دوسرے فضلاء تابعین حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت سعید بن المسیب حضرت عروہ بن الزبیرؓ مسلمانوں کے لئے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے، انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی، حق گوئی، اور بے باکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمتِ دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا، حکومت کے بڑھتے ہوئے ہمہ گیر اثرات کے مقابل میں یہ اخلاقی اثر اگر چہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا، اور کبھی بھی عین دنیاوی انہماک میں بھی اصلاحِ حال کا جذبہ ابھرتا تھا۔

انقلابِ حکومت کی ضرورت اس کی مشکلات

رفتہ رفتہ سیاسی انقلاب کے اثرات وسیع اور گہرے ہونے چلے گئے، ان دینی شخصیتوں میں بھی کمی آنے لگی، جو اسلام

لے حجر اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے چھونا، ۱۲۰ھ قیسیدہ اب بھی عربی ادب میں یادگار ہے، اس کا مطلع ہے۔

هَذَا الَّذِي تَصْرَفُ الْبَطْءَ وَطَأْتَهُ
وَالْبَيْتَ يَصْرَفُهُ وَالْحِلَّ وَالْحَرَمَ

تحقیق کا خیال ہے کہ اس قیسیدہ میں بہت سے اشعار بعد میں اضافہ ہوئے ہیں۔

منفصل حالات و تراجم کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، صفحہ الصفحۃ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

کے اصلی اخلاق و اوصاف کی محافظ اور قرن اول کی یادگار تھیں، حکومت کا دائرہ اثر وسیع اور مستحکم ہو گیا، اب اخلاقی و دینی انقلاب اس کے بغیر مشکل تھا کہ خود حکومت میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جاسکتی تھی، اس وقت کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ایسی نہ تھی، جو اس کو میدان جنگ میں شکست دے سکے، ماضی قریب میں دو بڑی کشمکشیں ایک بیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مخلصانہ و سرفروشانہ اقدام، دوسرے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا دلیرانہ و منظم مقابلہ ناکام ہو چکا تھا، کسی فوجی انقلاب کی کامیابی کے قریبی امکانات و آثار نہ تھے، شخصی و موروثی حکومت نے اصلاح و تبدیلی کے دروازے بند کر دیئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لئے مسلمانوں کی قسمت پر ہر لگ چکی ہے، اس وقت اسلام کو غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت تھی، اور وہ معجزہ ظاہر ہوا۔

عمر بن عبدالعزیزؓ کی جانشینی

یہ معجزہ حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ کی ذات ہے، جو خود بانی خاندان (مروان) کے پوتے، اور ان کی ماں (ام عاصم) فاروق اعظمؓ کی پوتی تھیں، فاروقیت اور امویت کا یہ جوگ لٹ اسی لئے ہوا تھا، کہ بنی امیہ کے خاندان میں ایک خلیفہ راشد پیدا ہو، جو حالات میں انقلاب برپا کر دے۔

عمر بن عبدالعزیزؓ سترہ سال میں پیدا ہوئے، وہ خلیفہ وقت سلیمان بن عبدالملک کے چچا زاد بھائی تھے، اور اس کے پیشرو ولید بن عبدالملک کے اور اس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے حاکم (گورنر) تھے، ان کی جوانی اور امارت کو ان کی فتلا

لہ اس رشتہ کی تاریخ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے منادی کر والی تھی کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، اسی زمانہ میں ایک رات وہ گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آیا کہ کوئی عورت کہہ رہی ہے، بچی صبح ہو رہی ہے، دودھ میں پانی ملائے، لو کی نے جواب دیا کہ ماں آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے اس کی مانعت کی ہے، عورت نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت کہاں ہیں، ان کو کیا خبر؟ لو کی نے جواب دیا کہ امیر المومنین کو تو خبر نہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے اس گھر کو نظر میں رکھ لیا، اور اپنے صاحبزادہ عاصم سے کہا کہ تم اس لڑکی کو پیام دو، مجھے امید ہے کہ اس کے بطن سے ایسا جوان پیدا ہوگا جو سارے عرب پر حکومت کرے گا، عاصم نے اس سے نکاح کر لیا، عمر بن عبدالعزیزؓ اس کے نواسے ہیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیزؓ ص ۱۸۱۷)

کے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحب ذوق امیر از مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس راستے سے گزرتے تھے، دیر تک اس کی ہلک بتلاتی تھی کہ ادھر سے گزرے ہیں، ان کی چال شہور اور نوجوانوں کا فیشن تھی، سولے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیک مزاجی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں انشا اہم کام انجام دینے والے ہیں۔

لیکن ان کی ذات سر تا پا اسلام کا اعجاز تھی، اور وہ جس طرح منصب خلافت پر آئے، وہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، موروثی نظام حکومت میں ان کی خلافت کا کوئی موقع نہ تھا، اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے، تو امارت سے زیادہ ان کا کوئی حصہ نہ تھا، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا، سلیمان بن عبد الملک بیمار ہوا، اس کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے اس نے ان کو لابی لابی قبائیں پہنائیں، اور ہتھیار باندھے کہ وہ کچھ بڑے معلوم ہوں، مگر وہ آنکھوں میں نہ بچے، اس نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا، اور کہا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے، جس کے لڑکے بڑے بڑے ہوں، **وَجَاءَ بَنِي خَيْبَةَ** نے جو اسی انتظار میں تھے، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کی جانشینی کا مشورہ دیا، جو منظور ہوا، رجا کا یہ کارنامہ (جو دینی انقلاب کا ذریعہ بنا) بڑے بڑے مجاہدات اور ساہا سال کی عبادت پر بھاری ہے۔

خلافت کے بعد ان کی زندگی

عمر بن عبد العزیز نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر ان چند عمال حکومت کو معزول کیا، جو سخت ظالم اور نافذ اثرس تھے، ان کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا، اس کو بیت المال میں داخل کیا، اور اسی گھڑی سے ان کی سیرت کیس بدل گئی، اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے، بلکہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جو اری او باندیوں کو تحقیق کے بعد ان کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کر دیا، مظالم کا تصفیہ کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسریٰ و قیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی، سنت اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور

(مطابق سنت بنا دیا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کر دی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انھوں نے ایسی زاہدانہ

زندگی اختیار کی، جن کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقراء میں بھی ملتی مشکل ہے، لباس میں ایسی کمی

کی کہ بعض اوقات کڑا سوکھنے کے انتظار میں صبح میں تاخیر سے پہنچتا ہوتا، بنی امیہ جو ساری سلطنت کو اپنی جاگیر اور بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، اب اپنا نپا تگ حصہ پاتے، خود ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے، وہ منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، روکر فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سن کر وہ بھی رو پڑیں، اس وقت جبکہ وہ روتے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران تھے ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکر سے جو ان کا سچا رفیق تھا، پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا کہ دس بارہ دینار کہا کہ اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارک باد دی، اور کہا کہ حج کا سامان آگیا، فرمایا ہم نے اس مال سے بہت دنوں فائدہ اٹھایا ہے اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر اس کو بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان کے دو وقت کھانے کا حساب دو درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر سرکاری شمع جل رہی ہوتی، اور کوئی ان کی خبر بیت دریافت کرنے لگتا، یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنی ذاتی شمع منگواتے، بیت المال کے باورچی خانہ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی ان کو احتراز تھا، بیت المال کے کُٹنگ کو سونگھنا بھی گوارا نہ تھا۔^{۵۲} ان کی احتیاط تنہا اپنی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنے عمال حکومت کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تھے، اور ان سے توقع کرتے تھے کہ وہ بھی حکومت کے معاملہ میں اسی قدر محتاط اور بزرگ ہوں گے، والی مدینہ ابوبکر بن حزم نے سلیمان بن عبد الملک کو درخواست دی تھی کہ حسب دستور سابق ان کو سرکاری موم بتیاں اور قندیلیں ملنی چاہئیں، سلیمان کے انتقال کے بعد یہ پرچہ عمر بن عبد العزیز کے ملاحظہ میں آیا، آپ نے لکھا کہ ابوبکر مجھے یاد ہے کہ تم اس عہد سے پہلے جاؤ گے کی اندھیری راتوں میں بے شمع و موم بتی کے نکلتے تھے، تمہاری وہ حالت اس حالت سے بہتر تھی میرے خیال میں تمہارے گھر کی موم بتیاں

اور قندیلے کافی ہیں انہی سے تم کو کام لینا چاہئے، اسی طرح کی ایک درخواست چرس میں سرکاری کام کے لئے کاغذ طلب کیا گیا تھا، لکھا کہ:-

”قلم باریک کرو اور گٹھا ہوا لکھو، اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لئے کہ مسلمانوں کو ایسی لمبی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خواجہ بیت المال پر بار پڑے“

ان کی انقلابی اصلاحات

اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انھوں نے حکومت کی روح ہی بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انھوں نے حکومت کا نقطہ نظر بدلا اس وقت تک حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا، جس کو جمہور کے اخلاق و عقائد، سیرت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انھوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرے سے کہ:-

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے“

حکومت کا مزاج اور نقطہ نظر ہی تبدیل کر دیا، اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا، ان کی ساری مدت خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انھوں نے ملکی مصالح و منافع کے مقابلہ میں ہمیشہ دین و اصول و اخلاق کو ترجیح دی، اور دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پروا نہیں کی، ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیرہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی، روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، ابکاران سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی، اور تشویش کا اظہار کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا عین مقصد ہے، ایک دوسرے عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہو گی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیرہ کی

اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو، اور زمین میں
فساد پھیلانے نہ پھرو۔

مملکت میں ایسی اصلاحات کیں، جن کے نتائج بہت دور رس تھے، ساری مملکت کے لئے یکساں پیمانے پر قر کے جس میں فرق نہیں ہو سکتا تھا، حکام و عمال سلطنت کو تجارت کی مانعیت کی شبیہ کا قانوناً ممنوع قرار دیا، سلطنت کی زمین کا خاصا زقبہ، امراء اور شاہی خاندان کے افراد و حکام نے اپنی شکار گاہ یا چرواہا کے لئے گھیر کر سیکار بنا رکھا تھا، حکم دیا کہ وہ عوام کی ملکیت ہے، عمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی مانعیت کی اور فرمایا کہ اگر وہ کبھی تحفہ تھا، تو اب رشوت کے سوا کچھ نہیں ہے، حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اپنے تک پہنچنے اور شکایات پہنچانے کے پورے مواقع اور بہولتیں ہتیا کریں، حج کے موقع پر اضلاع ہوتا تھا کہ جو کسی ظلم کی اطلاع یا کوئی نیک مشورہ دے گا، اس کو ستر سو دینار تک انعام ملے گا۔

اعمال و اخلاق کی طرف توجہ

اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم و بادشاہ ہوتا تھا، اس کو لوگوں کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کرنے کی

له مناقب عمر بن عبد العزيز^{٢٣} (طبع بيروت) له سيرت عمر بن عبد العزيز^{١٣٦} ٢٤٤٣ الفصام ٩٩ ٥٤ الفصام ٩٥ ١٥٣ الفصام ٩٩

د فرست تھی، از اہلیت، نہ اس کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے دے، ان کے اخلاق و رجحانات کی

نگرانی کرے، اور وعظ و نصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علماء و محدثین کا سمجھا جاتا تھا، عمر بن عبد العزیز نے اس دونی کو مٹایا اور اپنے کو حقیقی معنی میں "خلیفہ" ثابت کیا، انھوں نے زمام خلافت ہاتھ میں لینے ہی عمال حکومت اور امراء اجناد (فوجی افسروں) کو طویل طویل خط اور فرمان لکھے، جو انتظامی سے زیادہ دینی و اخلاقی ہیں، اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ مشورہ و نصیحت کی روح ہے، ایک خط میں انھوں نے سابق اسلامی زندگی (عہد نبوت و خلافت) اور اس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے، اور اسلامی نظام مالیات اور طرز حکومت کی تشریح کی ہے، ان خطوط میں وہ امراء اجناد (فوجی افسروں) کو وقت پر نمازیں پڑھنے، اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر و اشاعت کی تاکید کرتے ہیں، عمال کو تقویٰ و اتباع شریعت کی وصیت فرماتے ہیں، اپنے اپنے علاقہ اور حلقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں، اور اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا مقصد بتلاتے ہیں، ان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کرتے ہیں، اور بتلاتے ہیں کہ اس فریضہ کے ترک ہو جانے کے کیا نقصانات ہیں، اور اس کا کیا وبال پڑتا ہے؟، عمال سلطنت کو سزا و عقوبت میں اعتدال و احتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اسلام کے قانون تعزیرات کی تشریح کرتے ہیں، پھر سلطنت کی عمومی شہری خرابیوں اور بد اخلاقیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں، توجہ گری اور جہازہ میں عورتوں کے ساتھ جانے کو بند کرتے ہیں، پردہ کی تاکید کرتے ہیں، قبائلی عصبیت کی مذمت اور اس کی ممانعت کرتے ہیں، نبیذ کے استعمال میں بڑی بے اعتدالی شروع ہو گئی تھی، اور لوگ اس کے ذریعہ نشہ اور شراب تک پہنچ گئے تھے، جس سے مختلف قسم کی بد اخلاقیات پیدا ہو رہی تھیں، اس کی تہدید و تشریح کرتے ہیں۔

تدوین علوم اور احیائے سنن

اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم کی تدوین اور سنتوں کی احیاء کی طرف بھی توجہ کی، ابو بکر بن حزم جو ایک

بڑے عالم تھے، ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا۔

انظر ما كان من حديث رسول الله
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں
صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبه فآتی حقت
ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس طرح مجھے اندیشہ ہے کہ
دروس العلم و ذهاب العلماء۔
علماء رخصت ہو جائیں گے اور علم مٹ جائے گا۔

انھوں نے تعین کے ساتھ عمرہ بنت عبد الرحمن النصار یہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرہ روایات کی
طرف توجہ دلائی کہ جلد اس کو قلم بند کر لیا جائے، پھر صرف ابو بکر بن حزم ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ عمال سلطنت اور شاہیں
علماء کو بالعموم اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا، اور گشتی فرمان جاری کیا کہ:-

انظر والی حدیث رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) کی احادیث ڈھونڈ ڈھونڈ کر
علیہ وسلم) فاجمعواہ۔
جمع کرو۔

اسی کے ساتھ علماء کے وظائف مقرر کئے کہ وہ کیسوی اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کر سکیں۔
وہ خود بڑے عالم تھے، انھوں نے بنفس نفیس فرائض و سنن کی تشریح کی طرف توجہ کی، خلافت کے ابتدائی
دنوں میں ایک گشتی فرمان جاری کیا جس میں فرماتے ہیں کہ:-

”اسلام کے کچھ حدود و قوانین و سنن ہیں جو ان پر عمل کرے گا، اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی، اور جو عمل نہیں کرے گا،
اس کا ایمان نامکمل رہ جائے گا، اگر زندگی نے وفا کی، تو میں تمہیں اس کی تعلیم دوں گا، اور تمہیں ان پر چلاؤں گا، اگر
اس سے پہلے میرا وقت آگیا، تو میں تمہارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا لکھوں بھی نہیں ہوں!“

چند خطوط و فرامین

سیدنا عمر بن عبد العزیزؓ کے قالب میں جو خالص اسلامی ذہن اور اسلامی روح کا فرما تھی، (اور جو بالآخر ان کے

(نظام سلطنت میں جلوہ گر ہوئی) اس کا صحیح اندازہ ان کے خطوط اور سرکاری فرامین سے ہوتا ہے، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً

سلطنت کے کارپردازوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو لکھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا خالص اسلامی ذہن و دماغ بخشا تھا جس پر جاہلیت کی کوئی پرچھائیں، اور شاہین بنی آدمیہ کے اخلاق و افکار کا کوئی سایہ بھی نہیں پڑا تھا، یہاں چند خطوط پیش کئے جاتے ہیں۔

ان کو ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض قبائلی سردار اور عہدہ داروں کی "نودولت" جاہلیت کی رسم حلف و محافطت کو زندہ کر رہے ہیں، اور جنگ و مقابلہ کے موقع پر "یا لبی خلات، یا لمحضّر فلاں قبیلہ کی دہائی ہے، ہاں اے اہل معصر اپنے حلیف کی مدد کرو" کا جاہلی نعرہ لگانے لگے ہیں، یہ اسلام کے رشتہ، اخوت اور نظام اجتماعی کے متوازی ایک جاہلی نظام اور جاہلی رسم کا احیاء تھا، اور بہت سے فتنوں کا پیش خیمہ، سابق فرمانروا شاید اس کو بعض ملکی مصالح سے نشہ دیتے یا کم از کم اہمیت نہ دیتے، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس خطرہ کو محسوس کیا، اور اس کے بائے میں مستقل فرمان صادر کیا، اپنے ایک بڑے عہدہ دار صحاک ابن عبدالرحمن کو لکھتے ہیں :-

"حمد و صلوة کے بعد معلوم ہوا کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس اسلام کے علاوہ جس کو وہ اپنے لئے اور اپنے بندگان خاص کے لئے پسند فرما چکا ہے، کسی دین کو قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی اس کتاب سے عزت بخشی اور اس کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلام میں تفریق کر دی ہے، ارشاد فرمایا :-

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ
تہا ہے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی، اور ایک کتاب آئی جو اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے شخصوں کو جو
يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ مِنْ ضُلُوكٍ
وضائے حق کے طالب ہیں، اسلامی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی
سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى
نور سے تارکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے ہیں اور
النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

(۱۱۱:۵ - ۱۶:۱۵)

جلوہ جاہلیت میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک شخص دوسرے شخص کا حلیف بن جاتا تھا، پھر وہ جاہلیت کی پاسداری کرتا تھا، اور حق و باطل میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔

نیز ارشاد ہے:-

وَيَا نَحْيَ أَتْرَلْنَا وَيَا نَحْيَ نَزَلْنَا وَمَا
أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا
(اسراء ۱۰۵)

مرف خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی، اس وقت تم لے
اہل عرب (جیسا کہ تم کو معلوم ہے) منالیت، جہالت، پریشانی، تنگی، اور سخت انتشار میں مبتلا تھے، فتنے نہایت
درمیان عام تھے، لوگ تم کو دبائے ہوئے تھے، اور لوگوں کے پاس جو تھوڑا بہت دین باقی تھا، اس سے بھی تم محروم
تھے، اس کے برعکس لوگوں کی گمراہیوں میں سے کوئی گمراہی ایسی نہیں تھی، جس میں تم مبتلا نہ ہو، تم میں سے جو زندہ رہتا
تھا، وہ جہالت و گمراہی کے ساتھ زندہ رہتا تھا، اور تم میں سے جو مرتد تھا، اس کا انجام جہنم ہوتا تھا، یہاں تک کہ
اللہ تعالیٰ نے تم کو ان براہیوں، بتوں کی پریشانی، جنگ و جدال، منافرت اور تعلقات کی خرابیوں سے صاف بچالیا،
تم میں سے انکار کرنے والے نے انکار کیا، اور تم میں سے تکذیب کرنے والے نے جھٹلایا، اور اللہ کا پیغمبر اللہ کی کتاب اور
اسلام کی دعوت دیتا رہا، پھر تم میں سے بہت کم اور کمزور لوگ اس پر ایمان لائے، ان کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا،
کہ لوگ انہیں اچک نہ لیں، تو اللہ نے ان کو پناہ دی، اور اپنی مدد سے ان کی تائید کی، اور ان کو وہ لوگ عطا فرما
جن کا اسلام لانا اس کو منظور ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے، اور اللہ
کو اپنے رسول سے اس وعدہ کو پورا کرنا تھا، جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں، اس وعدہ کو تھوڑے سے مسلمانوں
کے علاوہ عام طور پر لوگوں نے بعید سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ
دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَكِنَّ
الْكَافِرِينَ
وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا
دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب
کرے، گو شرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔
(الصفت - ۹)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور مسلمانوں سے اپنے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کر دیا ہے اہل اسلام! یاد رکھو تم کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دیا، اسی اسلام کے صدقہ میں دیا ہے، جس کی بدولت تم اپنے دشمنوں پر فتح پاتے ہو اور جس کی وجہ سے تم قیامت کے دن گواہ بنو گے، تمہارے لئے دنیا و آخرت میں اس کے علاوہ نہ نجات ہے اور نہ کوئی محنت نہ کوئی بچاؤ ہے اور نہ کوئی حفاظت کا سامان اور طاقت جب اللہ تعالیٰ تم کو وہ بہترین دن نصیب کرے گا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، تو موت کے بعد اللہ کے ثواب کی امید ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے :-

یہ عالمِ آخرت ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں،
جو دنیا میں نہ جڑا ہنسا چاہیں اور نہ فساد کرنا اور نہ کفر۔
محقق لوگوں کو ملے۔

میں تم لوگوں کو اس قرآن اور اس پر عمل نہ کرنے کے نتائج بد سے ڈراتا ہوں، اس لئے کہ اس پر عمل نہ کرنے کے نتیجے میں جو واقعات پیش آئے ہیں، امت میں جو فو ریزی، جو خانہ دیرانی، جو پراگندگی اور انتشار برپا ہوا، وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے، پس جس چیز سے اللہ نے تم کو اپنی کتاب میں منع کیا ہے، اس سے رک جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی وحید سے

زیادہ کوئی چیز غوث اور احتیاط کی مستحق نہیں ہے.....

جس چیز نے مجھے اس خط کے لکھتے پر مجبور کیا ہے، وہ یہ بات ہے، جو دیہات کے باشندوں کے متعلق مجھ سے ذکر کی گئی اور ان لوگوں کی بابت جو نئے نئے حاکم اور جہدہ دار بنے ہیں، یہ سچا ہے اجداد اور جاہل قوم کے لوگ ہیں، احکام الہی کا ان کو علم نہیں، وہ اللہ کے معاملہ میں سخت دھوکہ میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ کا لُجّ ساتھ جو معاملہ رہا ہے، اس کو وہ بھول گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی انھوں نے ناشکری اور ناقدری کی ہے، جس تک پہنچنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی، مجھے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جنگ میں مقرر اور حسین والوں کا سہارا لیتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کے حمایتی اور ولی ہیں، بحان اللہ و بجمہ! یہ کس قدر ناشکر گزار اور کافر نعمت ہیں، ان کو ہلاکت، ذلت و غواری کا کیسا شوق ہے؟ دیکھتے نہیں کہ انھوں نے اپنے لئے کون سا مقام پسند کیا کس امن و امان سے اپنے کو محروم کیا، اور کس گروہ سے اپنا تعلق پیدا کیا؟ اب مجھے معلوم ہوا کہ شقی اپنے ارادوں ہی سے شقی ہوئے ہیں، اور جہنم بیکار نہیں پیدا کی گئی ہے، کیا ان لوگوں نے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نہیں سنا۔

اِنَّهَا الْمُؤْمِنُونَ اَخَوٌ فَاصْلَحُوا بَيْنَكُمْ
اَخَوِيكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ
مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں
کے درمیان صلح کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے
رہا کرو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔
(المحجرات ۱۰)

کیا انھوں نے یہ آیت کبھی نہیں سنی؟۔

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ
نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا
آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور
میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا، اور میں نے اسلام
کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔
(المائدہ ۳)

مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ زمانہ جاہلیت کے طرز کی محالفت کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مشروط حمایت کے وعدہ سے منع فرمایا ہے، اور ارشاد ہے ”لا حلف فی الاسلام“ (یعنی اسلام میں غلط دوستیاں اور حجتہ بندی نہیں ہے) جاہلیت میں ہر حلیف دوسرے حلیف سے اس کی توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کے معاہدہ اور رشتہ ’محالفت‘ کا حق ادا کرے گا، اور اس کو پورا کرے گا، خواہ وہ بالکل ظالمانہ اور فاجرانہ ہو، اور اس میں صریح اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہو.....

میں ڈراتا ہوں ہر اس شخص کو جو میرا یہ خط سنے، اور جس کو یہ خط پہنچے اس بات سے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی قلعہ کو اختیار کرے، اور اللہ و رسول اور مؤمنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا دوست بنائے، بڑے شد و مد سے اور بار بار اس سے آگاہ اور متنبہ کرتا ہوں، اور میں ان لوگوں پر اس ذات کو گواہ بنا رہا ہوں جس کی قدرت اور تصرف میں تمام جان دار ہیں اور جو ہر شخص کی سرگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔

انہوں نے اپنے ایک فوجی افسر کو جنگ پر روانہ ہونے کے وقت جو ہدایت نامہ لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن قرآن کے سانچے میں کس طرح ڈھل گیا تھا، اور ان کا نقطہ نظر اور طریق فکر دنیا دار بادشاہوں اور سیاسی حکمرانوں سے کس قدر مختلف تھا۔

منصور بن غالب کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:-

”اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر کا یہ ہدایت نامہ منصور بن غالب کے نام جب کہ امیر المؤمنین نے ان کو اہل حرب اور ان اہل صلے سے جو مقابلین آئیں، جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہے، امیر المؤمنین نے ان کو حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں، کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان موثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے، امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے، ہم اپنے دشمنوں سے جنگ

کرتے ہیں اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم ان پر غالب آجاتے ہیں، کیونکہ اگر یہ بات نہیں ہے تو ان کے دراصل ہم کو مقابلہ کی قوت نہیں ہے، کیونکہ نہ تو ہماری تعداد ان کی تعداد کے برابر ہے، اور نہ ہمارا سامان ان کے سامان کے برابر، پس اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہو جائیں تو وہ قوت اور تعداد میں ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے، یاد رکھو! اگر ہم ان پر اپنے حق کی وجہ سے فتح نہ پاسکیں گے تو اپنی قوت کی وجہ سے بھی ان پر غالب نہ پاسکیں گے، اور اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکنا نہ ہوں، جہاں تک ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں، سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تم پر کچھ محافظ مقرر کئے گئے ہیں، جو تمہارے سفر و حضر کے افعال کو جانتے ہیں، پس ان سے شرم کرو، اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ خُشن سلوک کرو، اور ان کو اللہ کی نافرمانی کر کے ایذا نہ پہنچاؤ، خصوصاً ایسی حالت میں کہ تم مارا دھوئی ہے کہ تم راہِ خدا میں نکلے ہوئے ہو، اور یہ تم سمجھو کہ یہاں سے دشمن ہم سے گئے گئے ہیں، اس لئے گو ہم گناہ گار ہیں، لیکن وہ ہم پر غالب نہیں آسکتے، کیونکہ بہت سی ایسی قومیں ہیں، جن پر ان کے گناہوں کی وجہ سے ان سے بدتر لوگوں کو مسلط کر دیا گیا ہے، پس اللہ تعالیٰ سے اپنے نفسوں کے مقابل میں مدد چاہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ سے تم اپنے دشمنوں کے مقابل میں مدد چاہتے ہو، میں بھی اپنے لئے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں۔ اور امیر المؤمنین منصور بن غالب کو حکم دیتے ہیں کہ سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں، اور اپنے ساتھیوں کو ایسی قطع مسافت پر مجبور نہ کریں، جو مشقت میں مبتلا کر دے، اور سفر میں کسی ایسی منزل پر پڑاؤ سے گزیر نہ کریں جس سے ان کو آرام ملتا ہو، یہاں تک کہ ان کا دشمنوں سے اس حالت میں سامنا ہو کہ سفر کے مکان نے ان کی قوتوں کو گھٹا نہ دیا ہو، وہ ایسے دشمن کے پاس جا رہے ہیں، جو اپنے گھروں میں ہیں، ان کا سامان اور سواریاں سستائی ہوئی ہیں، پس اگر سفر میں اپنے اور اپنی سواروں کے ساتھ نرمی کا معاملہ نہ کریں گے، تو ان کے دشمنوں کو ان پر زیادہ قوت حاصل ہوگی، کیونکہ دشمن اپنے گھروں میں ہیں، جہاں ان کے آدمی اور سواریاں آرام کئے ہوئے ہیں، اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے۔

اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ ہر جمعہ ایک رات اور دن سفر نہ کریں اور آرام کریں جس میں خود کو اور جانوروں کو آرام پہنچائیں اور اپنے سامان اور ہتھیاروں کی مرمت کریں اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا قیام صلح کی بستیوں الگ رکھیں امن و امان والی بستیوں میں ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ جائے نہ ان کے بازاروں میں نہ ان کی مجلسوں میں ہاں وہ شخص جاسکتا ہے جس کو اپنے دین اور امانت پر پورا بھروسہ ہو اور نہ ان بستی والوں پر ظلم کریں اور نہ وہاں سے اپنے لئے گناہ جمع کریں اور نہ ان کو کچھ اذیت پہنچائیں سوائے اس کے کہ شرعی مطالبہ یا واجبی حق ہو کیونکہ ان کا حق اور ان کی ذمہ داری ہے جس کے پورا کرنے کا تم کو اسی طرح ذمہ دار بنایا گیا ہے جس طرح کہ وہ لوگ حقوق و ذمہ کی پابندی کے مکلف ہیں پس جب تک کہ وہ لوگ اپنے حقوق کی ادائیگی پر ثابت رہیں تم لوگ بھی ان کے حقوق ادا کرتے رہو اور صلح والوں پر ظلم کر کے جنگ لے لکوں پر غلبہ حاصل کرو قسم اللہ کی تمہیں ان لوگوں کے مال میں سے اتنا حصہ پہلے ہی دے دیا گیا ہے کہ اب مزید کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت ہم نے تمہارے سامان میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے اور نہ تمہاری قوت میں کوئی ضعف رہنے دیا ہے اور تمہارے لئے سامان اچھی طرح جمع ہو گیا ہے تمہیں ایک منتخب فوج دی گئی ہے اور شرکاء لکوں کی طرف تم کو مشغول کر کے صلح والوں کی طرف سے تمہاری توجہ ہٹائی ہے اور ایک مجاہد کے لئے جتنا بندوق کر سکتا تھا اس سے بہتر تمہارے لئے کر دیا ہم نے تمہارے لئے قوت کی ہم رسانی میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے "وَلَا خُفْيَا وَلَا خَوْفًا وَلَا يَاسَ اللَّهُ" اور امیر المؤمنین کی ہدایت ہے کہ ان کے جاسوس عرب اور اہل ملک میں سے وہ لوگ ہوں جن کے اخلاص اور صدق پر ان کو اطمینان ہو کیوں کہ دروغ گو کی اطلاع نفع نہیں پہنچاتی اگرچہ اس کی کوئی بات صحیح بھی ہو فریب دہندہ دراصل تمہارے دشمن کا جاسوس ہے تمہارا جاسوس نہیں۔ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ

ایک عمومی خط میں مجال سلطنت کو تحریر فرماتے ہیں:-

”انا بعد بیشک یہ ذمہ داری جو اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد فرمائی ہے، اگر میں نے اس کو قبول کیا ہے کہ اس سے میرا مقصد کھانا، لباس، سواری یا شادیاں یا جمع اموال ہوتا، تو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے ہی یہ چیزیں اتنی دے رکھی تھیں، جو شکل سے لوگوں کو ملا کرتی ہیں، لیکن میں نے اس ذمہ داری کو بہت ڈرتے ڈرتے قبول کیا ہے، مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ عظیم الشان ذمہ داری ہے، اس کی باز پرس بڑی سخت ہے، جس وقت فریق اور مدعی قیامت کے دن جمع ہوں گے، تو اس کے معاملہ میں بڑی سخت جرح ہوگی، ہاں اگر اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، اور نظر انداز فرمائے، اور رحم فرمائے، تو الگ بات ہے۔

میں نے تم کو حکومت کا جو کام سپرد کیا ہے، اور جو اختیارات تفویض کئے ہیں، ان میں سے تم کو امتیاط اور خدا کے خوف کی ہدایت کرتا ہوں، ذمہ داریوں کی ادائیگی، اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کے اتباع اور اس کے نواہی سے اجتناب کی تاکید کرتا ہوں، جو باتیں اس کے خلاف ہوں، ان کی طرف بالکل توجہ کی ضرورت نہیں، تمہاری نظر اپنے اوپر اور اپنے عمل پر ہے، اور ان چیزوں کی طرف ہو جو تمہارے رب تک پہنچائیں، اور جو تم اپنے اور اپنی رعیت کے درمیان کرتے ہو، وہ تمہارے پیش نظر ہے، اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حفظ و نجات اسی میں منحصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں منزل مقصود تک پہنچ جاؤ، اس یوم موجود کے لئے وہی چیز تیار رکھو، جو خدا کے ہاں کام آنے والی ہو اور دوسروں کے واقعات میں تم نے ایسی عبرتیں دیکھی ہیں، جن کے برابر ہمارا وعظ و نصیحت مؤثر نہیں ہو سکتی۔ وَالسَّلَامُ

تبلیغ و اشاعت اسلام کی طرف توجہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف مسلمانوں کی اصلاح اور ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ پر

”عمر بن عبد العزیز نے ہندوستان کے راجاؤں کو سائے خطوط لکھے اور ان کو اسلام اور اطاعت کی دعوت دی اور ہم جیسا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کو اپنی سلطنتوں پر باقی رکھا جائے گا، اور ان کے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔“

ان کے اخلاق و کردار کی خبریں وہاں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں اس لئے انھوں نے اسلام قبول کیا اور اپنے نام عربوں ہی کے نام پر رکھے !

جب اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر مولیٰ بنی مخزوم بلاد مغرب کے والی بنائے گئے تو انھوں نے وہاں اپنے کردار و اخلاق کا بہت اچھا مظاہرہ کیا اور اہل بربر کو اسلام کی دعوت دی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان لوگوں کو ایک خط بھیجا اور ان کو اسلام کی دعوت دی، یحییٰ بن اسماعیل نے مجموعوں میں پڑھ کر سنایا، اور اسلام بالآخر وہاں غالب آیا، اپنی خلافت کے بعد انھوں نے ماوراء النہر کے سلاطین کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے اور خراسان کے جو لوگ اسلام لائے ان سے خراج معاف کر دیا، لیکن جو لوگ اسلام لائے اور ساتھ ہی انھوں نے سرائیں تعمیر کیں، ان کے لئے انعام اور وظیفہ مقرر کیا۔^۳

ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا رد عمل

عمر بن عبد العزیز کی مالی اصلاحات اور بندشوں اور نظام حکومت میں شرعی و اخلاقی پابندیوں سے بجائے اس کے کہ حکومت کو مالی خسارہ اور شہریوں کو نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، ملک میں خوشحالی عام ہو گئی۔

اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈھے سے نہیں ملتا تھا۔

یہی بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز نے افریقہ میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول پر مقرر کیا، میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کئے جن کو وہ رقم دی جائے تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا، جس کو زکوٰۃ دی جاسکے، عمر بن عبدالعزیز نے سب کو غنی بنا دیا، آخر میں نے کچھ غلام خرید کر آزاد کئے، اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا۔^۱

ایک دوسرے قریشی کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کی مختصر مدت خلافت میں یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوٰۃ کی لے کر آتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دے دیا جائے، لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا، عمر کے زمانہ میں سب مسلمان غنی ہو گئے، اور زکوٰۃ کا کوئی مستحق نہیں رہا۔^۲

ان ظاہری برکات کے علاوہ (جو صحیح اسلامی حکومت کا ثانوی نتیجہ ہیں) بڑا انقلاب یہ ہوا کہ لوگوں کے رجحانات بدلنے لگے، اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی ہونے لگی، ان کے معاشرہ کہتے ہیں کہ ہم جب لید کے زمانہ میں جمع ہوتے تھے، تو عمارتوں اور طرز تعمیر کی بات چیت کرتے تھے، اس لئے کہ ولید کا یہی اصل ذوق تھا، اور اس کا تمام اہل مملکت پر اثر پڑ رہا تھا، مسلمان کھانوں اور عورتوں کا بڑا شائق تھا، اس کے زمانہ میں مجلسوں کا موضوع سخن یہی تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں نوافل و طاعات ذکر و تذکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا، جہاں چار آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تنہا راکیا پڑھنے کا معمول ہے، تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے، تم قرآن کب ختم کرو گے، اور کب ختم کیا تھا، مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو۔^۳

ان کی زندگی کا جوہر

عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کا جوہر اور ان کی تمام سرگرمیوں اور جدوجہد کی روح اور قوت محرکہ

ان کا قوی ایمان آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے، انھوں نے جو کچھ کیا، خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی وہ طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقتور حکمران کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی، ان کو کوئی اگر اس طرز عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع و لطف اندوزی کی ترغیب دیتا، تو ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔

إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيمٍ (الانعام ۱۵)
اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے ایک
بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

انھوں نے ایک موقع پر اپنے خادم سے کہا تھا، اور یہ ان کی صحیح تعریف تھی کہ اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے، جو مرتبہ بھی مجھے حاصل ہوا میں نے اس سے بلند تر مرتبہ کی تمنا کی، اور اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ کوئی مرتبہ باقی نہیں رہا، اب میری حوصلہ مند طبیعت جنت کی مشاق و تمنیٰ ہے۔ ان کی رقت و خشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انھوں نے نصیحت کی فرمائش کی اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا، اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمہیں کیا فائدہ ہوا، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی، اور تمہیں اللہ نے جنت نصیب کی، تو تمہارا کیا نقصان ہوا، یہ سن کر وہ اس قدر روئے کہ ان کے سامنے جو انگلیٹھی رکھی تھی، وہ بھگ گئی، یزید بن حوشب کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت و دوزخ صرف عمر بن عبد العزیز اور جن بصری کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

عمر بن عبد العزیز کی وفات

اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبد العزیز کو اپنے کسی پیش رو کی مدت خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور دیرپا انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لیکن بنی امیہ جن کو اپنے

اس فرد خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی، اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمرؓ کے گھرانے میں رشتہ کرنے پر بہت پچھتاہے رہتے تھے، زیادہ دن تک اس مجاہدہ کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کر کے مسلمانوں کو اس عطیہ خداوندی سے محروم کر دیا، سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ کل دو سال پانچ مہینے خلافت کر کے سلمہ میں دنیا سے رخصت ہوئے، اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے ان کو زہر دیا۔



دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

حضرت حسن بصریؒ

امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا، جیسا کہ ان سے پہلے بہتا تھا، جاہلیت نے اپنے بچے مضبوطی کے ساتھ کاڑ لئے، ان کے جانشین نے (جس کو سلیمان ان کے بعد خلیفہ بنایا تھا) اور اس کے جانشینوں نے اس "ناپست دیدہ وقفہ" کی تلافی کی پوری کوشش کی اور حکومت کو اسی چول پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے زمانہ تک تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شخصی و موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و کامیابی کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں "نفاق" کے جراثیم اور "مترقین سابقین" (گذشتہ امتوں کے دولت مندوں اور عیش پسندوں) کے اخلاق و اعمال پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، سوسائٹی میں تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہو گیا تھا ایمان و عمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ اس کی قوت کارا ز اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا اس وقت خطرہ میں تھی، اندیشہ تھا کہ یہ امت اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ اور روحانی حیثیت سے کھوکھلی نہ ہو جائے، قلوب میں سردی و افسردگی، ایمان میں کمزوری اور تعلق بالشر میں اضمحال بڑی شدت و سرعت سے پیدا ہوتا چلا آ رہا تھا، اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی، حکومت اس جوہر کی حفاظت اور پرورش سے نہ صرف غافل و بے تعلق تھی، بلکہ اس کا وجود اور اس کے نمائندے اس مقصد کے لئے حقیقی خطرہ

بنے ہوئے تھے اور اپنی ذاتی سیرت و کردار سے وہ اس اخلاقی انحطاط کے محرک داعی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق اور انابت و عبودیت کی جو کیفیت پیدا کی تھیں اور جو ایک نبی ہی پیدا کر سکتا ہے وہ رو بہ نازل تھیں یہ وہ کی تھی جو حکومت کے رقبہ کی توسیع اور بڑی سے بڑی فتوحات سے پوری نہیں کی جاسکتی تھی اور جو ایک مرتبہ زائل ہونے کے بعد (پچھلی امتوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے) بڑی مشکل سے واپس لائی جاسکتی ہیں۔

اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جاتی اور زمانہ کے اثرات اور اخلاقی و سیاسی عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کی طرح ایک نفس پرور آخرت فراہوش مادہ پرست قوم بن کر رہ جاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا تھا کہ یہ دنیا مسلمانوں کو مضہم نہ کرے اور وہ اگلی امتوں کی طرح اس کے دھاکے میں پڑ کر ضائع نہ ہو جائیں اپنے وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں صاف صاف کہا تھا۔

ما الفقرا، اغشى عليكم ولكن اغشى	مجھے تمہارے باپے میں فقر و افلاس کا خطرہ نہیں
عليكم ان تبسط الدنيا عليكم كما	مجھے جو کچھ خطرہ ہے وہ اس بات کا کہ دنیا کی تم پر لپی
بسطت علي من كان قبلكم	کشائش و فراخی ہو جیسی تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی
فتنا فاسوها كما تنافسوها ففتنكم	تھی اور تم بھی اس میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع
كما اهلكتهم۔	کر دو اور تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کرے جیسے
	اگلوں کو ہلاک کیا۔

تابعین کی دعوتِ ایمانی

یہ خطرہ جس کا زبان نبوت نے اظہار کیا تھا، جلد پیش آگیا، لیکن اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے

اللہ کے کچھ مخلص اور سرفروش بندے میدان میں آئے، جنہوں نے اپنی قوتِ ایمانی سوزندوں، صحبت و تربیت و عطا و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان میں تنکے کی طرح بہنے سے بچایا، اور خود اس سیلاب کی رفتار کو سست کر دیا، انہوں نے امت کے ایمانی و روحانی تسلسل کو قائم رکھا، جو اس کے نسلی و سیاسی تسلسل سے زیادہ ضروری تھا، اور اس کی زندگی میں وہ خلا نہیں آنے دیا جس میں محض ایک بے سیر بے روح، اور بے تلقین قوم بن کر رہ جائے، اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے فضلا و تابعین کی ایک سربراہ اور وہ جماعت تھی جن میں سعید بن جبیر، محمد بن سیرین، اور شعبی خاص طور سے ممتاز تھے۔

حسن بصریؒ

لیکن اس خطرہ کے اصل حریف اور ایمانی دعوت کے علمبردار حضرت حسن بصریؒ ہیں، جو ۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد بسیار مشہور صحابی حضرت زید بن ثابت کے آزاد کردہ غلام تھے، اور خود انہوں نے ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

حسن بصریؒ کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصریؒ میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرمادی تھیں، جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو موثر بنانے کے لئے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے، جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پاسکتی تھی، صحابہ کرام کا انہوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ میں جو تغیرات پیش آئے تھے، ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرہ

سے وہ پورے طور پر باخبر تھے اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے، وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، جب آخرت کا بیان کرتے تھے، یا صحابہ کرام کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں، حجاج بن یوسف کا ساز زبان آور اور قادر الکلام اس اخیر دور میں نہیں گذرا، لوگ حسن بصری اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے، مشہور امام لغت و نحو ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا، اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے۔ وسعت علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ میں دس برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا تھا، جو اس سے پہلے نہیں سنی، ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا۔

کان من دہاوی النجوم علما وتقویٰ	وہ اپنے علم و تقویٰ، زہد و ورع و استغناء و عالی مقام
و نہ دہا و دراعا و عفة و رقة، و فقہا	لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک رشتاں
و معرفۃ یجمع مجلسہ ضر و با من الناس	ستارہ تھے ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے
ہذا یاخذ عنہ الحدیث، و هذا یلقی	تھے، اور ہر ایک فیض پاتا تھا، ایک شخص حدیث
منہ التاویل و هذا یسمع منہ الحلال	حاصل کر رہا ہے ایک تفسیر میں استفادہ کر رہا ہے ایک
والحرام، و هذا یحکی لہ الفتی و هذا	فقہ کا درس لے رہا ہے اور ایک فتویٰ پوچھ رہا ہے
یتعلم الحکم و القضاء، و هذا یسمع الوعظ	کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضائے قواعد سیکھ رہا
و هو فی جمیع ذلک کالبحی العجاج تدفقا	ہے، کوئی وعظ سن رہا ہے، اور وہ ایک بحر زخار ہیں جو
و کالسرراج الوہاج تالفا و لا تنس مواظبہ	موجیں لے رہا ہے، اور ایک روشن چراغ ہیں جو مجلس کو
و مشاہدہ فی الامر بالمعروف و النہی	پر نور کر رہا ہے پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے

عن المنكر عند الامراء واشياء الامراء
بالكلام الفصل واللفظ الجزل۔
سلسلہ میں ان کے کارنامے اور حکام و امراء کے بڑے
پوری فصاحت اور پر شکوہ الفاظ میں اظہار حق کے

واقعات بھلانے کی چیز نہیں۔

اس سب سے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض صاحبِ قال اور صاحبِ کمال نہ تھے، بلکہ صاحبِ دل اور صاحبِ حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، جس وقت وہ تقریر کرتے تھے، سراپا درد و اثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ بصرہ میں کوثر میں بڑے بڑے صاحبِ علم اور صاحبِ درس تھے، مگر ان کے حلقہٴ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ و بیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو کلامِ نبوت سے بڑی مناسبت تھی۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ حسنِ بصری کا کلام انبیاء علیہم السلام کے طرزِ کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، ایسی مناسبت دوسرے واعظین کے کلام میں نہیں دیکھی گئی، اسی طرح ان کا طرزِ زندگی صحابہ کرامؓ کے طرزِ زندگی سے بہت مشابہ تھا۔

ان کی ان خصوصیات و جامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے، اور ان کو امتِ محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے، تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ امتِ محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہئے ان میں حسنِ بصریؒ بھی ہیں کہ معظمہ ہمیشہ سے عالمِ اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحبِ کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہلِ مکہ بھی حسنِ بصری کا علم و دیکھ کر ان کی تقریریں سن کر ششدر رہ گئے کہ ہم نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔

حسنِ بصریؒ کے مواعظ

حسنِ بصریؒ کے مواعظ دورِ صحابہ کی قوت و سادگی کا نمونہ ہیں، ان میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی،

زندگی کی بے وفائی، اور آخرت کی اہمیت کا مضمون، ایمان و عمل کی تلقین، تقویٰ اور خشیتِ الہی کی تعلیم،

طویل اہل اور فریبِ نفس کی مذمت ملتی ہے، اور اس دور میں جس پر مادیت اور غفلت کا سخت حملہ ہوا تھا، اور جو مابہت سے خواص دولت اور عیش و عشرت کے سیلاب میں خش و خاشاک کی طرح بہہ چلے جا رہے تھے، انہی متحنا کی ضرورت تھی، انہوں نے چونکہ صحابہ کرام کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا، اب حکومت امویہ کا شباب دیکھ رہے تھے، اس لئے وہ اپنے مواعظ میں اکثر بڑے درود و جوش کے ساتھ صحابہ کرام کی ایبائی کیفیات اور ان کی اخلاقی و عملی خصوصیات بیان کرنے لگتے ہیں، اور جب وہ ان دونوں زمانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اس عظیم انقلاب کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں، جو ان کو دیکھتے دیکھتے ایمان و عمل اور اخلاق و عادات میں رونا ہوا تھا تو ان کا درد اور جوش بہت بڑھ جاتا ہے، اور ان کو مواعظ تیر و نشتر بن جاتے ہیں، اور ان کے مواعظ اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح و بلیغ زبان اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں، ایک موقع پر اہل زمانہ پر تبصرہ، صحابہ کرام کا تذکرہ اور اسلامی اخلاق کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ہیہات ہیہات اہلک الناس لامانی	ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے
قول بلا عمل، ومعرفة بغیر صبر و ایمان	غارت کیا، زبانی باتیں ہیں عمل کا نام نشان نہیں، علم ہے
بلا یقین، مالی اسری سر جالاً ولا اسری	مگر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے صبر نہیں، ایمان ہے
حقوۃ ولا سمع حبیباً ولا اسری انیساً،	مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں، مگر دماغ تپا ہوا
دخل القوم و اخلتہ ثم خرجوا و عرفوا	آنے جانے والوں کا شور ہے مگر ایک بندہ خدا کا ایسا نظر
ثم انکروا و احرموا ثم استحلوا انما دین	نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر
احمد کم بقرۃ علی لسانہ اذا سئل المؤمن	نکل گئے، انہوں نے سب کچھ جان یا پھر کر گئے، انہوں نے
انت بیوم الحساب، قال نعم کذب	پہلے حرام کیا، پھر اسی کو حلال کر لیا، تمہارا دین کیا ہے؟
وما لک یوم الدین ان من اخلاق	زبان کا ایک چٹا ہوا اگر پوچھا جائے کہ کیا تم روزِ حشر

المؤمنین قوۃ فی دین وایماناً فی یقین
 وعلماً فی حلم وعلماً بطلم وکیسائی
 رفیق وتماماً فی فاقۃ وصدقاً فی غنی
 وشفقتی فی نفقۃ ورحمتۃ لجمہود وعلماً
 فی المحقوق وایضاً فانی استقلۃ لایحیث
 علی من یبغض ولا یاتم فی مساعدۃ من
 یحب ولا یمز ولا یغز ولا یلمز ولا یلغو
 ولا یلہو ولا یلعب ولا یشی بالنیمۃ
 ولا یتبع ما لیس لہ ولا یجد الحق الذی
 علیہ ولا یتجاوز فی العذر ولا یشمت
 بالفیجۃ ان حلت بخیرہ ولا یسر
 بالمعصیۃ اذا نزلت بسواہ المؤمن
 فی الصلوۃ خاشع والی الركوع مسارع
 قولہ شفاء وصبرہ تقی وسکوۃ فکرہ
 ونظرہ عبرۃ یمحاط العلماء لیعلم
 ویسکت بینہم لیسلم ویکلم لیغتم
 ان احسن استبشر وان اساء استغفر
 وان عتب استعقب وان سفہ علیہ
 حلم وان ظلم صبر وان جبر علیہ

پر یقین رکھتے ہو تو جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں قسم
 ہے روزِ جزا کے مالک کی غلط کاموں کی شان تو
 یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو، صاحب ایمان یقین
 ہو، اس کے علم کے لئے علم اور اس کے علم کے لئے علم ہر
 زینت ہو، محقق ہو، لیکن نرم خو، اس کی خوشنوی
 اور ضبط اس کے فقر و افلاس کی پردہ داری کرے
 دولت ہو تو اعتدال کا واسطہ ہے نہ چھوٹنے
 پائے، خراج کرنے میں شفیق خستہ حالوں کے حق میں
 رحیم و کریم، حقوق کی ادائیگی میں کشادہ دست و فراخ دلا
 انصاف میں سرگرم و ثابت قدم کسی سے نفرت ہو تو اس کے
 حق میں زیادتی نہ ہونے پائے کسی سے محبت ہو تو اس کی
 مدد میں حدِ شریعت نہ بڑھنے پائے، نہ عیب چلی کرتا ہو،
 نہ طنز و اشارہ نہ طعن و تشنیع نہ لایینی سے اس کو کچھ کام
 آو نہ ہو و حسبِ کچھ پہنچاؤری نہیں کرتا، جو اس کا حق
 نہیں اس کے پیچھے نہیں پڑتا جو اس پر واجب آتا ہے
 اس کا انکار نہیں کرتا، معذرت میں حد نہیں بڑھتا
 دوسرے کی مصیبت میں خوش نہیں ہوتا، دوسرے کی
 مصیبت اس کو مسرت نہیں ہوتی، مومن کو ناز
 میں خشوع اور نازوں کا نفقہ ہوتا ہے اس کا علم

عدل ولا يتعوز بغير الله ولا يستعين
 إلا بالله وقور في الملاء، شكور في الخلا
 قانع بالرزق، مأمود على الرضاء، صابر
 على البلاء ان جلس مع الفاخلين كتب
 من الذكرب وان جلس مع الذكرب
 كتب من المستغفرين، هكذا كان
 اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم،
 الاول فالاول حتى لحقوا بالله عز وجل
 وهكذا كان المسلمون من سلفكم الصالح
 وانما غيركم لما غيرتم ان الله لا يغير
 ما بقوم حتى يغيروا وما يلفسهم واذا
 اراد الله بقوم سوء فلا مرد له وما لهم
 من دؤن من قال له

متمہائے ساتھ اپنا حال بدل دیا اور ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا وما يلفسهم واذا اراد الله بقوم سوء فلا مرد له وما لهم من دؤن من قال له
 شفاء کا پیام اس کا صبر تقویٰ اس کا سکوت سر اس
 خود و فکر اس کی نظر سراپا درس و عبرت علماء کی صحبت
 اختیار کرتا ہے علم کی خاطر خاموش رہتا ہے تو اس لئے کہ گناہوں
 اور گرفت سے محفوظ رہے، بولتا تو اس لئے کہ کچھ ثواب کمائے
 اور فائدہ حاصل کرے، نیکی کرے اس کو خوشی ہوتی ہے غلطی
 ہو جاتی ہے تو استغفار کرتا ہے بحکایت کرتا ہے اور اس کے
 دل کی کسی کی طرف سے رنج انتہا ہے تو معافی تلافی کرتا ہے اس
 کوئی جہالت کرتا ہے تو وہ تحمل اور غفل سے کام لیتا ہے ظلم
 کیا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے کوئی اس حق میں انصافی
 کئے تو وہ انصاف کو نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی
 کی پناہ نہیں لیتا، اور اس کو کسی بد نہیں چاہتا مجمع
 میں باوقار تنہائی میں شکر گزار رزق پر قانع، آرام و شب
 کے زمانہ میں اگر مصیبت اور آزار اس کی گھڑلوں میں صابر
 غافلوں میں ذاکر، ذاکروں میں ہو تو استغفار میں مشاغل
 یقی شا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، اپنے درجوں اور
 مرتبہ کے مطابق، جب تک کہ دنیا میں رہے اسی شراک ہے اور جب
 دنیا سے گئے تو اسی آن بان گئے، مسلمانو! تمہارے سلف صدیق کا
 یہ نمونہ تھا جب تم نے اللہ کے ساتھ اپنا حال بدل دیا تو اللہ نے بھی

لوگوں کو خود اپنی (صلاحیت) کی حالت کو نہیں بدل دیتا اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالتا ہے جو یہ نہ کرتا ہے تو پھر اس کے سبب سے کوئی صورت ہی نہیں اور کوئی ضد کے سوا ان کا مددگار نہیں رہتا

ایک دوسرے موقع پر صحابہ کرام کو یاد کرتے ہوئے اور سورہ الفرقان کی ان آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے جن میں مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا۔

اِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ لَمَجَاءٍ تَنْهَضُوْهُمۡ هٰذِهِ الدُّعَاۗءُ
مِنْ اِلٰهِهِمْ مَّدْقُوْبًا وَّ اَقْضٰى بَيْنَهَا اِلٰى
قُلُوْبِهِمْ خَشَعَتۡ لِّلّٰهِ قُلُوْبُهُمْ وَاٰدِ اٰهَمۡ
وَاٰبَصَارُهُمْ كُنْتُ وَاِلٰهَهُمْ اِذَا رَاٰتِهِمْ
رَاٰتِیۡتَ قَوْمًا كَانَهُمْ رَاٰی عَیۡنِیۡ وَاِلٰهَهُ
مَا كَانُوْا بِاَهْلٍ جِدَلٍ وَّلَا یَا طَلَّ وَّلَكُنَّ
جَاءَهُمْ اَمْرٌ مِّنۡ اِلٰهٍ فَصَدَّ قُلُوْبُهُمْ فَجَعَلَهُم
اِلٰهَهُ فِی الْقُرْاٰنِ اَحْسَنَ نَصۡیۡتٍ قَالَ وَاَعَادَ
الرَّحْمٰنُ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوْنَ عَلٰی الْاَرۡضِ
هَوْنًا وَاِلٰهَهُمْ فِی کَلَامِ الْعَرَبِ اللِّیۡنُ وَاِلٰهَهُ
السَّكِیۡنَةُ وَاِلٰهَهُمُ الْوَقَارُ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ
قَالُوْا اَسْلَمًا مَّا حُلۡمَآءُ لَا یَعۡجِلُوْنَ وَاِلٰهَهُ
جَهَلٌ عَلَیْهِمۡ حُلُمٌ وَاِیۡضًا حُبُوْرٌ
عِبَادُ اِلٰهِ نَهَارُهُمْ بِمَا یَسۡمَعُوْنَ
ثُمَّ ذَكَرَ لَیۡلَهُمۡ خَبَرٌ لِّیۡلٍ فَقَالَ وَاِلٰهَ الَّذِیۡنَ
یَبۡتَغُوْنَ لِوَدِّهِمْ سَجۡدًا اَوْ قِیَامًا یَتَنَبَّوْنَ
لِّلّٰهِ عَلٰی اَقۡدَامِهِمْ وِیۡفَرۡشُوْنَ وِیۡجُوْهُمۡ

مومنین (اولین) کے کان میں جب خدا کی یہ پکار
پہنچی تو انھوں نے اسی وقت اس کی تصدیق کی، اور
اس پر لپک کہا، اس کا یقین ان کے دلوں کی گہرائی میں
اگر کیا ان کے دل ان کے بدن اور ان کی نگاہیں خدا کی
عظمت اور ہیبت میں جھک گئیں، بخدا میں جب ان کو
دیکھتا تو مٹا معلوم ہوتا کہ کچھ حقائق اور غیب کی باتیں
گو یا ان کی آنکھوں کی تحقیق میں ہی ان کو بحث و مشا
اور فضول باتوں کچھ کام نہ تھا، ان کو تو خدا سے ایک چیز
پہنچی، اور انھوں نے ان کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید
میں ان کا بہترین سراپا کھینچا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
”رحمن کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر عاجزی کے ساتھ
چلتے ہیں“ آیت میں ”هَوْنًا“ کا لفظ آیا ہے، هَوْنٌ
کے معنی کلام عرب میں نرمی و سکینہ اور وقار کے ہیں پھر
فرمایا ”اور جب ان کے سمجھ لوگ باگریں تو کہتے ہیں سلام
ہے، یعنی وہ ضابطہ و حلیم ہیں، جہالت پر نہیں اترتے اور
اگر کوئی دوسرا جہالت پر اترے تو ان کے علم و وقار میں
فرق نہیں آتا، یہ لوگ اللہ کے بندوں کے ساتھ کام

معبد الہیہم تعوی دموعہم علی
 خدودہم فرقان ربہم لامرہا
 سہروالیہم ولا مروا فمشعوا نہارہم
 قال الذین یقولون ربنا اصرف
 عنا عذاب جہنم ان عذابہا کان
 غراماً وکل شیء یصیب ابن آدم ثم
 یزول عنه فلیس بغرام انما الغرام
 اللانزم لہ مادامت السموات والارض
 صدق القوم واجلہ الذی لا الہ الا هو
 فعملوا وانتم تمنون فایاکم وھذہ
 الامانی رحمکم اللہ فان اللہ لم یبط
 عبداً بامنیتم شیئاً فی الدنیا والاخرۃ
 بات سننے کے دن گذارتے تھے پھر ان کی بڑی اچھی
 راتیں گزرتی تھیں جن کی اکثر تھلے خود تعریف کرتے اور
 وہ لوگ اپنے رب کے سامنے سچوں اور کھڑے ہو کر رات
 گزارتے ہیں واقعی یہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے
 چہروں کو خاک پر رکھ دیتے اور سجد میں پڑ جاتے ان کے
 رخصاؤں پر آنسوؤں کا ناز بندھ جاتا اللہ کا خوف ان کی
 آنکھوں کو اکٹھا رکھتا ان کو کوئی توبت تھی جس کے لئے
 وہ راتیں آنکھوں میں کاشت دیتے کوئی توبت تھی جس کا وہ
 دن میں سہے سہے رہتے اکثر تھلے فرماتے اور وہ لوگ کہتے
 ہیں اے ہمارے رب ہم سے دن رات کا عذاب دور کر کے ہلک
 اس کا عذاب بڑا توان اور بلائے جان آیت میں غرام
 کا لفظ آیا ہے جو مصیبت انسان کو لاحق ہوا اور مل جائے
 اس کو عرب غرام نہیں کہتے غرام وہ مصیبت جو قیامت
 تک انسان کو سر سے نکلے قسم ہے اس خدا کی جس کو کوئی
 معبود نہیں یہ اللہ کے بندے (اپنے قول اور اپنے دین میں)
 سچے اور کچے ثابت ہوئے اور جو انھوں نے زبان سے کہا تھا
 اس پر عمل کیا لیکن افسوس تم صرف تمناؤں میں مشغول ہو
 لوگو ان غالی تمناؤں سے باز آؤ اس لئے کہ اللہ تمنا

اس تقریر کے آخر میں فرمایا، (اور اکثر مواقع کے بعد فرماتے) کہ اس وعظ و نصیحت میں تو کوئی کمی نہیں، لیکن دلوں میں زندگی بھی تو ہو۔

ان کی حق گوئی و بیباکی

ان کے کمالات، فصاحت و بلاغت، تحریر علمی، اور تقریر و تاثیر ہی تک محدود نہ تھے، بلکہ وہ اپنے زمانہ میں حق گوئی و بیباکی، اخلاقی جرأت و شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفہ وقت یزید بن عبد الملک پر براہ تنقید کی، ایک موقع پر پیر درسی کسی شخص نے سوال کیا کہ اس زمانہ کے فتن (یزید ابن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہ اس کا ساتھ دو، نہ اس کا ساتھ دو، ایک شامی نے کہا، اور نہ امیر المؤمنین کا، یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا ہاں نہ امیر المؤمنین کا، ہاں نہ امیر المؤمنین کا، حجاج کی تلوار اور سفاکی مشہور ہے مگر حسن کی زبان اس کے زمانہ میں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی، اور اس کے متعلق بھی انھوں نے اپنے ضمیر اور عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

اسلام کے سیاسی و مادی اثر و اقتدار سے اسلامی مملکت میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے اسلام کو قبول تو کر لیا تھا، مگر اس کے اخلاق و معاملات اور قلب و دماغ پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہو سکے تھے اور ان میں حقیقی ایمان اور اَدْخُلُوا فِي السِّلْمِ کَافَّةً (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی شان پیدا نہیں ہوئی تھی، نو مسلموں کی نئی نسل میں (جس کی پوری اسلامی تربیت نہیں ہو سکی تھی) بکثرت ایسے افراد تھے، جو جاہلی اثرات سے پاک نہیں ہوئے تھے، اور اسلام سے ان کو گہرا تعلق اور زندگی میں احکام الہی کے سامنے

انقیاد تسلیم کی تو نہیں پیدا ہوئی تھی، ان میں خاصی تعداد میں (بالخصوص حکومت کے طبقہ اور امرا و اعیان) ایسے لوگ تھے جن میں قدیم منافقین کے اخلاق و اعمال اور ان کے ذہن و مزاج کا پرتو نظر آتا تھا، یہی لوگ بالعموم زندگی پر حاوی تھے، درباروں میں حکومت میں کلیدی جگہوں پر فوج میں بازاروں میں انہی کا غلبہ تھا، انہی کا طرز زندگی سوسائٹی میں فیشن کی حیثیت رکھتا تھا۔

بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ نفاق ایک فتنی و مقامی بیماری تھی، جو ہمدردی میں مدینہ طیبہ کے مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کے بعد وہ ختم ہو گئی، اس لئے کہ دو قوتوں کی کشمکش جاتی رہی، اور صرف اسلام باقی رہ گیا، اس لئے قدرتی طور پر کسی ایسے گروہ کے پیدا ہونے کا موقع نہیں رہا جو ان دونوں کے درمیان متردد و مذنب رہے، اور کسی ایک کا وفادار اور مخلص رفیق نہ بن سکے، اب یا تو کھلا ہو اکفر ہے یا علانیہ اسلام، ان دونوں کے درمیان تذبذب کی کوئی وجہ نہیں، تفسیر و تاریخ میں اس خیال کے اثرات ملتے ہیں۔ ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے، جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے، اس بیماری کے پیدا ہونے کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام و کفر کی دو طاقتیں میدان میں ضرور ہوں، اور ان میں کشمکش جاری ہو، خالص اسلام کے غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی وجہ سے اسلام کو مضہم نہیں کر پاتا، اور وہ اس کے دل و دماغ میں گھر نہیں کر سکتا، لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دست بردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں، اس لئے وہ ساری عمر اس دو عملی اور تذبذب کی حالت میں رہتا ہے، اس کی نفسی کیفیات اس کے اعمال و اخلاق، اس کی اخلاقی کمزوری، اس کی مصلحت شناسی، موقع پرستی، زندگی سے متنش و لطف اندوزی کا جذبہ، دنیاوی انہماک، آخرت فراموشی، اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی اور کمزوریوں و غریبوں پر دست درازی، منافقین اولین کی یاد تازہ کرتی ہے۔

”نفاق“ و منافقین کی نشاندہی

حضرت حسن بصریؒ کی یہ بہت بڑی دینی ذہانت تھی کہ انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ نفاق موجود اور زندہ ہے اور منافقین نہ صرف موجود ہیں بلکہ زندگی پر انداز اور سلطنت میں خیل ہیں، اور انہی سے شہروں کی چہل پہل ہے کسی نے ان سے کہا کہ اس زمانہ میں بھی ”نفاق“ پایا جاتا ہے؟ فرمایا:-

لو خرجوا من ازمة البصرة لا متوحشتم
شہر میں جی لگنا مشکل ہو جائے۔

یعنی شہر کی آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام سے برائے نام تعلق ہے اور اسلام نے ان کی دل میں گھر نہیں کیا ہے یا وہ اپنے اعمال و اخلاق کے لحاظ سے اسلامی سیرت سے آراستہ نہیں ایک دوسرے پر انھوں نے فرمایا:-

يا سبحان الله ما لقيت هذه الامة من
غاب آگے ہیں جو پرے درجہ کے خود غرض ہیں۔

لے متاخرین میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود اور زندہ ہے اور منافقین کا وجود کی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ان کے نزدیک نفاق کی دو ہیں، نفاق اعتقادی اور نفاق عمل و اخلاق، نفاق اعتقادی کا قطعی علم زائد رسالت کے بعد انقطاع وحی کی وجہ سے دشوار ہے، لیکن نفاق عمل اور نفاق اخلاق، کثیر وقوع ہے وہ اپنے زمانہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس وقت نفاق بکثرت موجود ہے، فوز الکثیر میں ارشاد فرماتے ہیں: ”اگر خواہی کہ از منافقان نمونہ بینی رود مجلس امر او مصاحبان ایشان را پس کہ مضمی ایشان را بر مضمی شایع ترجیحی دہند اور انصاف بیچ فرق نیست در میان آنانکہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے واسطہ شفیقہ نفاق در زندہ و در میان آنانکہ احوال پیدا شدہ اند بطریق یقین حکم شایع معلوم کردہ اند بعد ازاں برائت از خلاف آن اقدام می نمایند و علیٰ ہذا القیاس جماعت از معقولیان کہ شکوک و شبہات بسیار بخاطر دارند معا و را بنیائیں ساختہ اند نمونہ آن کردہ اند“ (۱۷ مطبع محمدی)

یعنی حکومت میں وہ غرض موجود ہے جو اسلام اور مسلمانوں کا مخلص نہیں اور جس کو صرف اپنے اغراض اور نفع سے کچپی ہے۔

حسن بصریؒ کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا، اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے، لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح حسن بصریؒ کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لئے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں کے بغیر بڑے بڑے معاشرہ پر زبرد پڑتی تھی، وہ اتفاق کی حقیقت بیان کرتے تھے اور اتفاق ایک مرض تھا جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف و اخلاق بیان کرتے تھے، اور یہ اوصاف و اخلاق بہت سے لوگوں میں پائے جاتے تھے، جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش پیش تھے، اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کے بحران کی مذمت کرتے تھے اور بکثرت لوگ اس وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے، اور ان حقیقتوں کو مستحضر کرتے تھے، اور مترفین و غافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی۔

غرض ان کی دعوت ان کے مواعظ، اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح متضاد تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لئے ان سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پچھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے، اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے، وہ اپنی تقریروں اور مجلسوں سے دین و ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے، اور اپنی صحبت و عمل سے نفوس کی تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ سال کی طویل مدت انھوں نے اس دعوت و اصلاح میں گزاری، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنے نفوس کو ان کی وجہ سے حلاوت ایمان اور حقیقت اسلام نصیب ہوئی، عوام بن حوشب کہتے ہیں کہ حسنؒ نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا، جو انبیاء کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی امتوں میں کرتے تھے۔

حسن بصری کی وفات اور ان کی مقبولیت

اس خلوص، دینی انہماک اور علمی و روحانی کمالات کا یہ اثر تھا کہ سارا بصرہ ان کا گردیدہ تھا۔ اس میں ان کا جب انتقال ہوا تو سارے شہر نے ان کے جنازہ کی مشالعت کی اور بصرہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پوری آبادی کے قبرستان چلے جانے کی وجہ سے اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں ہو سکی تھی۔

حسن بصری کے بعد ان کے روحانی و علمی جانشینوں نے اور اپنے اپنے زمانہ کے داعیوں نے ”دعوت الی اللہ“ دعوت آخرت اور دعوت ایمان و عمل کے تسلسل کو جاری رکھا اور درمیان میں کوئی خلا واقع نہیں ہونے دیا، حسن بصری کی وفات کے بائیس برس بعد خلافت امویہ کا خاتمہ اور خلافت عباسیہ کا آغاز ہوا، اور دمشق کے بجا بغداد دار الخلافت اور پورے مشرق کا مرکز و جہ بن گیا۔

انقلاب حکومت کی کوششیں

ان اصلاحی کوششوں اور دعوت و تذکر کے تسلسل کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کی کوششیں بھی جاری رہی کہ خلافت کو اس کے صحیح مرکز پر قائم کیا جائے اور اس اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے جو امویوں اور ان کے بعد عباسیوں نے قائم رکھی تھی، خلافت غلطی سے ایسی قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہو گئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آواز اور کوئی تحریک ایس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی تھی، جب تک کہ اس کو شرفیت نسب اور علو خاندان کی سند حاصل نہ ہو اور اس کی پشت پر خاندانی طاقت و حمایت نہ ہو، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلافت اموی اور خلافت عباسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا، ان کا تعلق اہل بیت تھا کہ ان کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا لیکن وہ اس کے دینی رجحان کے ناساز و بھی تھے، اور ان کو مسلمانوں کے دینی عنصر اور اصلاح پسند جماعتوں کی ہمدردی اور نائید حاصل تھی۔

لے بصرہ اس وقت عراق کا سب سے بڑا شہر تھا، اور خلافت کے پایہ نجات و نجات کے بعد اسلامی مملکت میں دوسرے بڑے شہر بن گیا تھا۔
لے ابن خلکان (حسن بصری)

واقعہ کربلا کے بعد بھی خاندان نبوت کے متعدد افراد نے انقلاب کی کوشش کی، سیدنا حسین (علیہ علی آباد)

اسلام کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن الحسین نے ہشام بن عبد الملک کے مقابل میں علم جہاد بلند کیا، اور ۲۲ھ میں شہید و مصلوب ہوئے، امام ابو حنیفہ نے ان کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجے، اور حاضر نہ ہو سکنے پر معذرت کی، ان کے بعد بنی حسن میں سے حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ (بن عبد اللہ الرحمن ابن الحسن المثنی بن سیدنا حسن بن علی) نے مدینہ طیبہ اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا، امام ابو حنیفہ اور امام مالکؒ ان کی تائید و حمایت میں تھے، امام ابو حنیفہ نے برطان کی تائید کی، اور کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی، منصور کے فوجی افسر حسن بن قحطبہ کو ابراہیم کا مقابلہ کرنے سے باز رکھا، اور اس نے خلیفہ سے معذرت کر دی، اول الذکر رمضان ۱۴۵ھ میں مدینہ طیبہ میں، اور آخر الذکر ذوالقعدہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے، بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں، لیکن انھوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلان حق کی ایک نظیر قائم کر دی، اگرچہ عملاً وہ کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن ان کی کوششوں کا یہ ذہنی اثر قربانی، اور جدوجہد کا یہ تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں، اسلامی تاریخ کی آبرو انہی جوان مردوں سے قائم ہے، جنھوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی، اور صحیح مقصد کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔

”مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رَجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ“

لے مناقب ابی حنیفہ بزاری ج ۱ ص ۵۵

۲۵ امام مالک نے اہل مدینہ کو محمد ذوالنفس الزکیہ کی رفاقت و طاعت کا فتویٰ دیا، اگرچہ وہ منصور کی بیعت کر چکے ہوں (تاریخ الکامل ج ۵ ص ۲۱۴) ۲۶ مورخین کا خیال ہے کہ ابو حنیفہ کے خلاف منصور نے جو سخت کارروائی کی، اس کی وجہ ان کا عہدہ قضا سے انکار نہ تھا، بلکہ دراصل محمد و ابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا، اس باب کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، امام ابو حنیفہ

کی سیاسی زندگی، از مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔

خلافت عباسیہ اور دینی دعوت و تذکرہ

خلافت عباسیہ اور اس کے اثرات

خلافت عباسیہ، خلافت امویہ کی پوری پوری جانشین تھی، وہی دنیا داری کی روح، وہی شخصی و موروثی سلطنت کا نظام و آئین، اور وہی اس کی خرابیاں اور بُرے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش و عشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سوسائٹی میں عربی روح کار فرما تھی، اس کی خرابیاں، اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجیبی روح داخل ہو گئی تھی، اور عجیبی قوموں اور تہذیبوں کے امراض و عیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا:۔

امطری حیث شملت غسیاتینی . جہاں تیرے عجیب ہیں آئے جا کر برس جاتی رہی پیداوار

خارجہ . کا خراج بہر حال میرے ہی پاس آئے گا۔

ابن خلدون کے اندازہ کے مطابق سلطنت عباسیہ کی سالانہ آمدنی ہارون رشید کے زمانہ میں ست ہزار پانچ سو قنطار (سات کروڑ ڈیڑھ لاکھ دینار سے زیادہ تھی، یعنی اکتیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ۳۱۵) سالانہ سے زائد، جو اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑی مالیت تھی، امون کے زمانہ میں اس

کافی اضافہ ہوا، اس کثیر آمدنی میں سب سے بڑی سلطنت کا پایہ تخت ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کا سامان پیش و عشرت اور ساری دنیا کے اہل کمال، صنائع و معنی، غلام، باندیاں، مصاحب و شاعر اور خوش باش و خوش فکر سب کے بغداد میں آگئے تھے، دولت کی فراوانی عجیبوں کے اختلاط سے تمدن کی ساری خرابیاں اور تمدن زندگی کی ساری بے اعتدالیاں دارالسلام یا مرکز اسلام میں شروع ہو گئی تھیں، دولت کی بہتات مال کی بے وقعتی اور اس وقت کے تمدن و تعیش کا اندازہ کرنے کے لئے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہے، مورخ لکھتا ہے:-

”مامون مع خاندان شاہی و اربکان دولت و کل فوج و تمام افسران ملکی و خدام حسن بن بہل (وزیر اعظم جس کی لڑائی سے مامون کی شادی ہو رہی تھی) کا مہمان ہوا، اور برابر انیس دن تک اس عظیم الشان بارات کی ایسی فیاضانہ حوصلہ سے مہانداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز کے لئے امیرانہ زندگی بسر کر لی، خاندان باختم و افسران فوج اور تمام عہدہ داران سلطنت پر رشک و عنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں، جن پر کاغذ پٹے ہوئے تھے، اور ہر کاغذ پر نقد، لونڈی، غلام، املاک، خلعت، اسب خاصہ، جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا جس کے حصہ میں جو گولی آئے، اس میں جو کچھ لکھا ہوا اسی وقت وکیل الخزن سے دلا دیا جائے، عام آدمیوں پر رشک و عنبر کی گولیاں اور درہم و دینار نثار کئے گئے، مامون کے لئے ایک نہایت متکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا، اور گوہر و باقوت سے مرتع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اس کے قدم پر نثار کئے گئے، جو زریں فرش پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں دکھاتے تھے پٹھ

بغداد کے داعی الی اللہ

لیکن اسی پر عیش و عشرت بغداد میں کچھ نفوس قدسیہ تھیں جو دعوت الی اللہ، تزکیہ نفوس، علوم دینیہ

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب ”یحیوان“ (ج ۳ ص ۹۱، وج ۵ ص ۱۱) و مجلدات الاغانی۔

۱۰ مامون (مولانا شبلی نعمانی مرحوم ص ۱۵۰، بحوالہ ابن خلدون، ابوالفضل، ابن الاثیر، ابن خلکان۔

کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم میں ہمت نہ ہنک تھے، انھوں نے شہر کے ہنگاموں اور زندگی کی ساری پچھپیوں سے

اپنے کو علیحدہ کر لیا تھا، اور اس امت کی روح اور تعلق بالشر کے سرمایہ اور اسلامی زندگی کے سرچشمہ (قرآن و حدیث) کی حفاظت میں مصروف تھے، حکومت ان کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی، اور دنیا کی کوئی ترغیب ان کو اپنے کام سے ہٹا نہیں سکی، مادیت کے اس پر ملاطمہ سمندر میں وہ انسانی جزیرے تھے، جہاں ڈوبنے والے پناہ لیتے تھے، انھوں نے بغداد میں مادی و پر عشرت زندگی کے پہلو پہ پہلو ایک خالص ایمانی اور روحانی زندگی قائم کر رکھی تھی، جو اپنی طاقت اور وسعت میں مادی و سیاسی زندگی سے کم نہ تھی، اگر خلفاء اور امراء و وزراء کا قبضہ جسموں پر تھا، تو ان کی حکومت لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر تھی، اور جہاں کہیں ان دونوں میں مقابلہ پیش آتا تو اکثر اوقات انہی کا غلبہ ثابت ہوتا، سلطان وقت ہارون رشید اپنے شاہانہ ترک و احتشام کے ساتھ رقبہ میں مقیم تھا کہ مشہور امام حدیث اور مرد صالح حضرت عبداللہ بن مبارک کی آمد ہوئی، شہر کی ساری آبادی ان کے استقبال کے لئے نکل پڑی، خلیفہ تنہا رہ گیا، ازدحام کا یہ حال تھا کہ جو نیاں ٹوٹ گئیں، ہارون کی ایک کنیز بالا خانہ سے دیکھ رہی تھی، پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں، جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے، اس نے کہا کہ یہ بادشاہی نہ کہ ہارون کی بادشاہی کہ نجیر پولیس اور اہل کاروں کے جمع ہی نہیں ہوتے۔

یہ ایمانی اور علمی زندگی بغداد میں صاف نمایاں تھی، بغداد جس طرح عیش و عشرت اور مال و دولت کا گہوارہ تھا، اور اس کے طالب دنیا کے گوشہ گوشہ سے سمٹ کر یہاں جمع ہو گئے تھے، اسی طرح علم و عمل و اصلاح و تقویٰ اور دعوت و اصلاح کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں اس فن کے امام اور اس فن کے طالب پورے عالم اسلام سے آکر جمع ہو گئے تھے، طبقات و تراجم کی کتابیں دیکھنے سے تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بغداد میں صلحا و علماء کے علاوہ اور کوئی بستا ہی نہ تھا، اور قال اللہ و قال الرسول کے سوا کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی یہ دینی رونق اور عین مرکز حکومت میں دین و اصلاح کی یہ دعوت انہی مجاہد بندوں کے دم سے تھی، جنھوں نے

اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا، اس سلسلہ میں سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، جعید بغدادی،

معروف کرخی، اور بشر حافی کا نام اور کام سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، ان حضرات کے اعمال و اخلاق، سچی خدا ترسی، بے لوث زاہدانہ زندگی، مخلوق سے استغناء، ایشا ربے نفسی، بے غرض خدمت خلق، اور ایمانی کیفیات غیر مسلم آبادی تک پر اثر ڈالتی تھیں، ان کی ذات سے اسلام کا اخلاقی وقار قائم تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریریں سن کر اور ان کے اعمال و اخلاق دیکھ کر بہ کثرت یہودی، عیسائی، مجوسی اور صابئی مسلمان ہوتے تھے۔



تدوین حدیث وفقہ

امت کی دو فوری ضرورتیں

امت کی روح اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے ساتھ (جس کا سلسلہ برابر جاری تھا) امت کی اجتماعی زندگی و معاشرت اور معاملات و سیاست کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی اور اس بات کی ضمانت کی کہ وہ آئندہ بھی اسلام کے اصول و آئین کے مطابق ہوں گے، اس وقت دو براعظم (ایشیا و افریقہ) اور بڑا عظیم یورپ کا ایک حصہ (اسپین) اسلام کی نگرانی و ولایت میں تھے، اسلام کی سلطنت روئے زمین کی سب سے بڑی وسیع اور سب سے طویل و عریض سلطنت تھی جو دنیا کے تمدن ترین ممالک پر مشتمل تھی، نئے نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، تجارت و زراعت، جزیرہ و خراج محکومین، مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ، اور نئی نئی ضروریات تھیں، جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی منظر تھیں، ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جاسکتا تھا، نہ سرسری طور پر ان سے گذر جاسکتا تھا، حکومت مفصل و مکمل آئین و قانون سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جاسکتا تھا، اگر قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھی جس کا نتیجہ ہوتا، جو اس وقت کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کا ہوا ہے، علماء کی ذرا سی غفلت اور محافظین سنت کی دماغی کاہلی اور رست بندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت سے محروم کر دیتی تھی

ع یک لحظہ غافل بودم صد سالہ را ہم دور شد

اس وقت دوسلوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو محفوظ و مدون کر لیا جائے، جو حدیث کے سینوں اور منتشر سفینوں میں تھا، یہ نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا ماخذ تھا، اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچے کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت یہ ہے کہ وہ زمانہ نبوت کے رئیس رسول کا ایک طرح کا روزنامہ ہے، جو کسی پیغمبر کی امت کو حاصل نہیں، اس کا ضائع ہو جانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا، علاوہ بریں اس میں امت کی اخلاقی اصلاح، اعتدال، صحیح روحانیت، زہد و تقویٰ اور تغیر و انقلاب پر ابھارنے والی زبردست طاقت ہے، جس کے اثر سے ہر زمانہ میں اہل دعوت و اہل عربیت پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر زمانہ کی مسلمان سوسائٹی کا شرعی و اخلاقی احتساب ہو سکے گا، اور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی بدعات کا مقابلہ کیا جاسکے گا۔

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی، قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اصول و کلیات موجود ہیں، اور ان سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بیحد متنوع، ان اصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر جاوی بنانے کے لئے اور ہر نئی حالت اور نئی ضرورت کے لئے ان کی ترجمانی و تشریح کے لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی۔

۱۔ حدیث کے جمع و تدوین کا کام عہد تابعین سے شروع ہو چکا تھا، اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی توجہ و کوشش کا حال گذر چکا ہے، دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے جن میں سے ابن شہاب زہری (۱۲۴ م) ابن جریج (۱۵۰ م) ابن اسحاق (۱۵۱ م) سعید ابن ابی عروبہ مدنی (۱۵۶ م) معری بنی (۱۵۳ م) ربیع بن صلیح (۱۶۰ م) وغیرہ کی مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن ضرورت تھی کہ اس کو زیادہ علمی و ترقی یافتہ شکل پر انجام دیا جائے۔

تدوین حدیث

پہلی ضرورت کے لئے قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ ظہور اسلام کے لئے اس ملک اور قوم کا انتخاب ہوا جو اپنی راست گفتاری، امانت اور قوت حفاظ میں دنیا میں ممتاز تھی، صحابہ کرامؓ نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا، اس کو محفوظ کر لیا، اور بے کم و کاست دوسری نسل کو پہنچا دیا، دوسری قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کے بُت تراشے اور ان کی تصویریں بنائیں، اسلام میں بُت تراشی اور صورت گری حرام ہے، مگر صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و عادات کا ایسا جیتا جاگتا مرقع پیش کر دیا، جس کی موجودگی میں کسی تصویر کی ضرورت نہیں، اور جو تصویر کے تمام مفاسد سے پاک ہے۔

محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی

پھر ان روایات کی حفاظت و اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے صد ہا کی تعداد میں ایسے بلند جوصلہ، تازہ دم، پر جوش طالب علم مہیا کر دیئے، جو قوت حافظہ و ذکاوت میں بے نظیر تھے، ان کا سیلاب عجم کے ملکوں سے امنڈ آیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حدیث کا ایسا عشق بھر دیا کہ ان کے لئے چین سے بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا، ان کو ہر جگہ سے اس علم کو حاصل کرنے اور اپنے سینہ اور سفینہ میں محفوظ کرنے کی دھن تھی، علوم کی تاریخ اور پیغمبروں کی امتوں میں اس عشق اور دھن اور پھر اس احتیاط و امانت کی مثال نہیں ملتی، انھوں نے ان احادیث کو جمع کرنے اور ان روایات کو ان کے راویوں سے سننے کے لئے اسلامی دنیا کا کوہ کوہ چھان ڈالا، اس بادیہ بیابانی کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام بخاری نے ۴۰ برس کے سن میں سیاحت شروع کر دی تھی، بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک انھوں نے گھنگال ڈالے، امام ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (نو ہزار میل) سے زیادہ مسافت

پیادہ پاٹ کی، پھر میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا، محدث اندلس ابن حیوان نے حدیث اندلس، عراق، حجاز،

اورین کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی گویا طبقہ سے لے کر سونز تک سارا بزرگ عالم افریقہ اور پھر بحر احمر طے کیا، بہتے محدثین کا سفر نامہ تین تین بزرگوں ایشیا، افریقہ، یورپ (اسپین) پر مشتمل ہے، اس وقت کی تمدن و معروف دنیا کے مغرب بعید (اندلس) سے مشرق بعید (خراسان) تک سفر کرنا اور شہر شہر پھر نا تو معمولی بات تھی۔

فن اسماء الرجال

ان تخلصین نے صرف حدیث و روایات کے جمع و تدوین پر اکتفا نہیں کیا بلکہ درمیانی واسطوں کی بھی تحقیق کی، اور ان تمام راویوں کے نام و نشان و تاریخ زندگی اور اخلاق و عادات کو محفوظ کر دیا جن کے توسط سے یہ روایات ان کو پہونچی تھیں، اس طرح جس ذات گرامی کے متعلق ”وَسَرَفْنَا لَكَ ذِكْرًا“ کا وعدہ اور اطلاع تھی، اس کی بدولت لاکھوں اشخاص کی زندگی روشنی میں آگئی، ان ہزاروں لاکھوں نسلوں کی اہمیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس سہتی کے اقوال و اعمال و احوال میں سے کسی جز کے راوی اور اس سلسلہ روایت کے ایک ناقل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث و روایات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم ”اسماء الرجال“ کا وجود میں آگیا، یہ علم محدثین کی عالی ہمتی، علمی شغف، تحقیقی ذوق اور احساس ذمہ داری کی روشن مثال ہے اس امت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے ”الاصابة في احوال الصحابة“ (حافظ ابن حجرؒ) کے انگریزی مقدمہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

”کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء

الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم

ہو سکتا ہو“

۱۔ یہ مثالیں ”علمائے سلف“ (مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم) سے اخذ ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب کا عنوان ”سفر“

محدثین کی احتیاط و امانت

محدثین نے نہ صرف رجال حدیث کے حالات صحیح و محفوظ کر دیئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی پابندی کی، اور ان کے اخلاق و عادات، قوت و ضعف، احتیاط و بے احتیاطی، دیانت و تقویٰ، علم و حافظہ کے متعلق ان کے معاصرین کے بیانات اور ہر قسم کی معلومات یکجا کر دیئے، اور ان کے بارہ میں کسی روایت سے کام نہیں لیا، خواہ ان کے زمانہ میں حاکم ہوں یا اپنے وقت کے بڑے زاہد ہوں۔

مراد یوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانتداری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ واقعتاً آج اسلام کے معافین ہیں، راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور ائمہ بھی تھے جن کی تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہو کر سب کی پردہ دری کی، اور ان کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں ان کو مل سکتا تھا، امام و کتب بڑے محدث تھے، لیکن ان کے باپ سرکاری خزانچی تھے، اس بنا پر وہ خود ان کے جب روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے کو ضرور ملا لیتے، یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے؟

مسعودی ایک محدث ہیں، ۱۵۲ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے فوراً ان کے حافظہ سے اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی، یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے، صرف اس معاوضہ میں پیش کرنے چاہے کہ وہ ایک شخص کو معتبر (عدل) اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں، یعنی اس کے متعلق خاموش رہیں، انھوں نے اشرفیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا، اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں سکتا، کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانتداری کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

قوتِ حافظہ اور استحضار

محدثین کی یہ جماعت ایران و ترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا، وہ نسلاً بڑے تندرست، توانا، جفاکش، عالی حوصلہ، علم کے حریص اور حافظہ کے نہایت قوی تھے، حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوتِ حفظ کے محیر العقول نمونے پیش کرتا تھا، جو ضعف و کمزوری کے اس خالص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں، لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں ہم پہنچاتی ہے اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں، اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں، کثرتِ کار، مناسبتِ نام اور اپنے موضوع سے عشق و شغف ایسا ملکہ پیدا کر دیتا ہے، اور انتقالِ ذہنی کے ایسے نمونے ظاہر ہوتے ہیں، جو غیر متعلق اشخاص کے لئے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علما، بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سو حدیثوں کی سند اور متن (مضمون حدیث) کو الٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگا دیا، اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے، امام بخاریؒ جب مجلس میں آئے تو ایک ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں، اور ان کی رائے دریافت کی، وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں، اہل علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے اپنے حصہ کی حدیثیں سنائیں تو امام نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سناں تھیں ان کا متن یہ ہے، اور ان کی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی، یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کر دی، اور جس سند کا جو متن تھا، اور جس متن کی جو سند تھی، وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعتِ نظر، حاضر دماغی اور حافظہ پر انگشتِ بزدان رہ گئے۔

ذریعہ ہے اس سرمایہ میں امام بخاری کی صحیح بخاری، امام مسلم کی صحیح مسلم (جن کو اکثر صحیحین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) اور جس حدیث کو ان دونوں نے روایت کیا ہے اس کو 'متفق علیہ' کے لفظ سے یاد کرتے ہیں (جو حدیث کا اعلیٰ درجہ ہے) سب سے ممتاز اور بلند پایہ ہیں، ان دونوں کے بعد امام مالک کی موطا اور امام ترمذی کی جامع امام ابو داؤد سجستانی کی سنن ابی داؤد، امام نسائی، اور امام ابن ماجہ کے مجموعے اپنی بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں بعد کی اصلاحی کوششوں اور تجدیدی کارناموں میں محدثین کرام کی ان ابتدائی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے آج بھی کوئی سنجیدہ اور وقیع اصلاحی تحریک اور دینی انقلاب کی کوشش اس عملی ذخیرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

تدوین فقہ

اسی طرح فقہ کی تدوین مسائل کا استنباط و استخراج، جزئیات و فتاویٰ کی ترتیب اسلام کی ایسی عملی ضرورت تھی جس کو بالکل موخر نہیں کیا جاسکتا تھا، اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر شام، عراق، مصر و ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہنچ گیا تھا، معاشرت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ و روایات اور روح شریعت گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانہ صحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے

لے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصانیف صحیحین کے متعلق لکھتے ہیں: اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیہما من المنصل المرفوع صحیح بالقطع وانہما متواتران الی مصنفیہما و انہما کل من یروی امرہما فہو مبتدع متبع غیر سبیل المؤمنین (رجحاً) یعنی محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جتنی متصل مرفوع روایات ہیں وہ یقینی طور پر صحیح ہیں اور ان دونوں کتابوں کی نسبت اپنے مصنفین کی تواتر سے ثابت ہے اور جو شخص ان دونوں کتابوں کی تحقیر کرتا ہے وہ مبتدع اور اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر حیلہ والا ہے

پورے علی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

ائمہ اربعہ اور ان کی خصوصیات

یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا، اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کا عظیم کئے ایسے لوگ میدان میں آئے، جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ)، امام مالک (م ۱۷۹ھ)، امام شافعی (م ۲۴۰ھ)، امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے، اپنے تعلق بالشریعت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبہ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں انھوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور کسی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا تھا، امام ابو حنیفہ کو دوبار عہدہ قضا پیش کیا گیا، اور انھوں نے انکار کیا یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں آپ کا انتقال ہوا، امام مالک نے ایک مسئلہ کے اظہار میں کوڑے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعی نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گزارا، اور اپنی صحت قربان کر دی، امام احمد نے تنہا حکومت وقت کے رجمان اور اس کے سرکاری مسلک کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک و راہی سنت کے طریقہ پر پراڑی طرح جے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تنہا اتنا کام کیا اور رسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا، جو بڑی بڑی منظم جامعیتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے، امام ابو حنیفہ نے تراشی ہزار رسائل اپنی زبان سے بیان کئے، جن میں سے اڑتیس ہزار عبادت سے تعلق رکھتے ہیں، اور پینتالیس ہزار معاملات سے۔

۱۔ مسئلہ یہ تھا کہ عبور کی طلاق کا کچھ اعتبار نہیں، اس مسئلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ خلفاء کے لئے جو بیعت لی جاتی تھی، اس میں یہ کہلایا جاتا تھا کہ اگر بیعت توڑی تو بیوی کو طلاق ہو جائے گی، اگر عبور کی طلاق کا اعتبار نہیں تو بیعت کے اس حلف نامے میں کوئی طاقت اور تاثر باقی نہیں رہ جاتی، اسی بنا پر حکومت کو امام مالک کے اس فتوے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی، اور اس کے حکام نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ ۲۔ فجر الاسلام، ج ۱، مناقب ابی حنیفہ، ص ۹۷۔ ۳۔ ج ۲، ص ۱۸۵۔

شمس الائمہ کروری نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان کی تعداد چھ لاکھ ہے، المدونہ میں جو امام مالک کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے چھتیس ہزار مسائل ہیں کتاب لام جو امام شافعی کے افادات کا مجموعہ ہے سات ضخیم جلدوں میں ہے، ابوبکر خلیل (م ۳۱۵ھ) نے امام احمد کے مسائل چالیس جلدوں میں جمع کئے۔

ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین

پھر ان کو شاگرد ایسے متنازلے جنھوں نے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا اور ان کی تنقیح و ترتیب کا کام جاری رکھا، امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف جیسا قانونی و ماغ نظر آتا ہے جس نے ہارون رشید کی وسیع ترین سلطنت کے قاضی القضاۃ کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دیئے، اور اسلام کے اصول معاشیات پر کتاب انخراج جیسی عالمانہ تصنیف کی، اسی طرح ان کے شاگردوں میں امام محمد جیسا فقیہ اور مؤلف، اور امام زفر جیسا صاحب قیاس نظر آتا ہے، جنھوں نے فقہ حنفی کو چار چاند لگائے، امام مالک کو عبداللہ بن وہب، عبدالرحمن ابن القاسم، اشہب بن عبد العزیز، عبداللہ ابن عبدالحکم، یحییٰ بن یحییٰ اللیثی جیسے وفادار شاگرد اور لائق عالم ملے جن کی کوششوں سے مصر اور شمالی افریقہ فقہ مالکی کا حلقہ بگوش ہو گیا، امام شافعی کو بولطی، مزنی اور ربیع جیسے محنتی اور ذہین شاگرد ملے جنھوں نے فقہ شافعی کو مرتب و منقح شکل میں پیش کر دیا، امام احمد کی فقہ کو ابن قدامر جیسا مصنف اور محقق حاصل ہوا جس نے المغنی جیسی عظیم الشان تصنیف کی جو فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں خاص انبیاء رکھتی ہے۔

تدوین فقہ کا فائدہ

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمہ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہو جانا اس دین کی

لے سیرۃ النعمان (مولانا شبلی) بحوالہ تلامذہ عقود العقیان۔ ۱۵ اس کتاب کا نام "جامع العلوم لام احمد" ہے،

ابوبکر خلیل کا مفصل حال شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۲ ص ۳۶۱، میں ملاحظہ ہو۔

زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی علمی و معاشقہ زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہو گئی اور اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی جس کی قوتیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں، انھوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کر دیں اور ایسے اصول مرتب کر دیئے، جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کے حل کرنے میں مدد ملی جاسکتی ہے، اور عام معتدل زندگی کو باقاعدہ اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گزارا جاسکتا ہے۔



فتنہ خلق قرآن اور امام احمد ابن حنبل

فلسفۃ الہیات اور ذات و صفات کی بحثیں

دوسری صدی کی ابتدا ہی میں مسلمانوں کا تعارف یونانی فلسفہ سے ہوا۔ فلسفہ محض چند خیالات قیاسات کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک ظلم تھا، جس کے پیچھے کوئی حقیقت و اصلیت نہ تھی، محدود الفاظ جن کے ساتھ خاص صورت اور تجربات وابستہ ہوں، ایک غیر محدود ذات کی حقیقت و صفات کو کس طرح بیان کر سکتے ہیں، الشریکی ہستی اور اس کی ذات و صفات کا مسئلہ کیمیاوی طرز کی تحلیل و تجزیہ اور علمی مونثکافیوں اور قیاس آرائیوں کا میدان نہ تھا۔ اس معاملہ میں انسانوں کو وہ ابتدائی معلومات اور ذاتی تجربات ہی حاصل نہیں، جن پر بحث و قیاس کی عمار قائم کی جاسکے، اس بارہ میں انسانوں کا ذریعہ علم صرف انبیاء علیہم السلام کی اطلاع اور وحی الہی ہے، اسی اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی صفت بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو سکتا ہے، اور اسی پر انکشاف عقل کی پختگی اور بالغ نظری ہے، مسلمانوں کے پاس قرآن و حدیث کی صورت میں یہ علم حکم موجود تھا، اور ان کو اس شغل بے حاصل (الہیاتی مباحث) کی مطلق ضرورت نہ تھی، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ دین اور محدثین اسی مسلک پر قائم تھے، اور مسلمانوں کی ساری توجہ دعوت اسلام، فتح و جہاد، اور زندگی کے عملی مسائل، اور مفید علوم کی تدوین میں مصروف تھی، جب یونانی اور سریانی کتابوں کے تراجم ہوئے اور قدیم مذاہب و ممالک کے علماء و متکلمین سے

اختلاط ہوا تو اہمیت کے وہ گروہ جو جلد متاثر ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، اور جن کی ذہانت میں گہرائی اور پختگی تھی

زیادہ سطحیت اور وحدت تھی، اس طرز فکر اور طریقہ بحث سے متاثر ہوئے، اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ان کے باہمی تعلق سے کلام الہی، رویت باری مسئلہ عدل، تقدیر، جبر و اختیار کے متعلق ایسی بحثیں اور مسائل پیدا ہو گئے، جو نہ دینی حیثیت سے ضروری تھے، نہ دنیاوی حیثیت سے مفید، بلکہ امت کی وحدت اور مسلمانوں کی قوت عمل کے لئے مضر۔

معتزلہ کا عروج

دینی فلسفیوں کے اس گروہ کی امامت معتزلہ کر رہے تھے، جو اپنے وقت کے ”روشن خیال“ عالم اور پر جوش متکلم تھے، انھوں نے ان علمی بحثوں کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا، اور اپنی ساری ذہانتوں کو ان مباحث پر لگا دیا، ان کے مقابلہ میں محدثین و فقہاء کا گروہ تھا، جو ان مسائل میں سلف کے مسلک کا قائل تھا، اور ان موٹنگائیوں کو مضر اور ان تعبیرات کو غلط سمجھتا تھا، ہارون رشید کے دور خلافت تک معتزلہ کا عروج حاصل نہیں ہوا، اماموں کے زمانہ میں جو یونانی فلسفہ اور عقلیت سے مرعوب تھا، اور مخصوص تربیت اور حالات کی وجہ سے اس کی دماغی ساخت معتزلہ سے ملتی جلتی تھی، معتزلہ کو عروج حاصل ہوا اور قاضی ابی ہادی دوطی کی بدولت جو سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ ہو گیا تھا، اور معتزلہ کے افکار و آراء کا پر جوش داعی اور مبلغ تھا، مذہب اعتزال کو حکومت وقت کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو گئی، اماموں میں خود دعوت کی روح اور ایک داعی کا جوش اور جذبہ تبلیغ تھا، اس میں ذہین نوجوانوں کی عجلت پسندی اور مطلق العنان فرماؤں کی ضد (راج ہٹ) دونوں جمع تھیں، اس کے دربار اور مزاج پر معتزلہ حاوی تھے۔

۱۷۔ اس نے ایک مرتبہ حضرت علیؑ کی تفضیل کا اعلان کر دیا جس سے ملک میں خاصی برپا پیدا ہوئی، ایک مرتبہ متعز کے بوازاں اعلان کیا، پھر جب قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم نے علیؑ طو پر اس کو قائل کیا تو اس کی حمت کا اعلان کروا دیا۔

عقیدہ خلق قرآنؑ اس وقت معتزلہ کا شعار اور کفر و ایمان کا معیار بن گیا تھا۔ محدثین اس مسئلہ میں معتزلہ کے حریف اور مد مقابل تھے، اور محدثین کی طرف سے امام احمد بن حنبلؒ اس مسئلہ میں سیدہ سپر تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ

امام احمد بن حنبلؒ ربیع الاول ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، وہ خالص عربی النسل اور قبیلہ اشقیانہ میں سے تھے، صبر و ہمت اور استقامت و عزیمت اس قبیلہ کے تاریخی خصائص میں سے ہیں، ان کے دادا حنبل بن ہلال بصرہ سے خراسان منتقل ہو گئے، اموی حکومت میں وہ علاقہ سرخس کے حاکم بھی تھے، لیکن جب عباسیوں نے اہل بیت اور بنی ہاشم کے نام سے خراسان میں اپنی دعوت پھیلائی تو وہ اس دعوت کے ہمدردوں اور کارکنوں میں تھے، امام احمد کی ماں مرو سے بغداد آئیں، تو وہ پیڑ میں تھے، ولادت سے پہلے ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، ماں نے بڑی ہمت اور جوش و خروش سے پرورش کی، گذراؤقات کے لئے برائے نام ایک جائیداد تھی، ان حالات نے ان میں تحمل و جفا کشی اور عزم و اعتماد علی النفس کی صفات پیدا کر دیں، بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا، اور زبان کی تعلیم حاصل کی، پھر ایک دفتر میں داخل ہوئے تاکہ تحریر و انشاء کی مشق حاصل کریں، نجابت اور صلاحیت کے

لئے خلق قرآن کی بحث ایک خاص علمی اور فلسفیانہ بحث تھی جس کا دماغی اثر (جیسا کہ بعض اعتزال دوست مؤرخین نے اعتراض کیا ہے) یہ پڑنا لازمی تھا کہ قرآن مجید کی عظمت و جلالت اور اس کے لفظ و معنا کلام الہی ہونے کا عقیدہ کمزور پڑ جاتا، محدثین معتزلہ کی اپنی تعبیرات کو غلط اور امت کے لئے معتزلہ سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اس کی علانیہ مخالفت کی، معتزلہ روشن خیال اور آزادی آراء کا احترام کرنے والے مشہور ہیں، لیکن انھوں نے اس مسئلہ میں سخت غلو اور مذہبی جبر و استبداد سے کام لیا، اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے سکہ عالم اسلام کو میدان جنگ اور دارالاستحسان بنادیا، انھوں نے اس مسئلہ میں اپنے مخالفین کے ساتھ وہ سلوک کیا جو قرون وسطیٰ میں ارباب کلیسائے آزاد خیالوں کے ساتھ کیا تھا، بالآخر یہی سختی اور حکومت و وقت کی سرپرستی مذہب اعتزال اور معتزلہ کے زوال کا باعث ہوئی۔

۱۱۰۰ھ عہد صدیقی کے مشہور سپہ سالار رستمی بن حارثہؒ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

آیتار پچن سے نمایاں تھے، ان کے چچا بغداد کے قائل نگار تھے، اور خلیفہ کی غیر موجودگی میں وہ پرچہ نویسی کرتے تھے، اور خبریں بھیجتے تھے، ایک مرتبہ انھوں نے یہ تحریریں اپنے کسین بھتیجے کے سپرد کیں کہ وہ ایک مجلس شخص کو پہنچا دیں انھوں نے اس خیال سے کہ اس میں اہل بغداد کی شکایت اور بہت سے لوگوں کی مخبری ہوگی، ان کاغذات کو دجلہ میں ڈال دیا جب وہ دفتر میں خطوط نویسی کی مشق کرتے تھے تو بہت سی عورتیں جن کے شوہر ہارون رشید کے ساتھ فوج میں باہر گئے ہوئے تھے، ان سے خط پڑھواتی اور جواب لکھواتی تھیں، وہ خطوط لکھ دیا کرتے تھے، لیکن جس مضمون کو شریعت یا تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے، اس کو نہیں لکھتے تھے، تقویٰ اور طہارت اور صلاحیت و نجابت کے انہی آثار کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے ایک صاحب نظر (سلیم ابن جبیل) نے کہا تھا کہ اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو اہل زمانہ پر حجت ہو گا۔

علوم دینیہ میں انھوں نے حدیث کی طرف خصوصی توجہ کی، سب سے پہلے قاضی ابویوسف رحمہ اللہ سے حدیث کی کتابت کی، پھر چار برس تک بغداد میں امام حدیث، سلیم ابن بشیر ابن ابی حازم الوسطی (م ۸۲ھ) سے استفادہ کرتے رہے، اس اثنا میں شہورائے حدیث عبدالرحمن بن مہدی، ابوبکر بن عیاش وغیرہ سے استفادہ کیا، ان کی اپنے مقصد میں مستعدی اور سرگرمی کا اندازہ اس سے ہو گا کہ وہ کہتے ہیں کہ میں بعض دن حدیث سننے کے لئے اتنے سویرے جانے کا ارادہ کرتا کہ میری ماں میرا دامن پکڑ لیتیں کہ اتنا تو ٹھہر جاؤ کہ اذان ہو جائے اور کچھ اجالا ہو جائے۔ بغداد سے خانہ ہو کر انھوں نے بصرہ، حجاز، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا، اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے استفادہ کیا۔

۸۷ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں ان کی ملاقات امام شافعیؒ سے ہوئی، پھر بغداد میں دوبارہ ملاقات ہوئی جب کہ وہ اپنے اصول اور اپنی فقہ بہت کچھ مدون کر چکے تھے، امام احمد اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے، امام شافعیؒ احادیث کے صحت و مستقم کے بارے میں اکثر ان پر اعتماد کرتے اور فرماتے تھے کہ اگر تم محدثین کے یہاں

حدیث صحیح ہو تو مجھے بتلادیا کرو میں اسی کو اختیار کروں گا۔

انھوں نے جریر بن عبد الحمید محدث سے حدیث سننے کے لئے رے (ایران) جانے کا بھی قصد کیا، لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جاسکے کہتے تھے کہ اگر میرے پاس ۹۰ درہم بھی ہوتے تو میں چلا جاتا، طلب حدیث میں ان کی بلند ہمتی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ۹۸ھ میں انھوں نے حج کی نیت سے حجاز، اور وہاں کچھ دن قیام کر کے عبد الرزاق بن ہمام سے حدیث سننے کے لئے صنعاء میں کا قصد کیا تھا، اور اپنے ہم درس یحییٰ بن معین سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا، دونوں نے اس کی نیت کی اور کہہ پہنچے، ابھی دونوں طواف قدم کر رہے تھے کہ عبد الرزاق بن ہمام طواف کرتے دکھائی دیئے، ابن معین ان کو پہچانتے تھے، انھوں نے سلام کیا، اور امام احمد کا تعارف کرایا، انھوں نے ان کو دعادی، اور کہا کہ میں نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے، یحییٰ بن معین نے کہا کہ ہم کل آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور آپ سے حدیث کی سماعت کریں گے، جب وہ چلے گئے، تو امام احمد نے اپنے رفیق سے کہا کہ تم نے شیخ سے کیوں وعدہ لے لیا؟ انھوں نے کہا کہ حدیث سننے کے لئے شکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک ہینہ کے سفر، پھر واپسی کے ایک ہینہ اور مصارف کثیر سے بچالیا، اور شیخ کو ہمیں پہنچا دیا، امام احمد نے کہا کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں حدیث کے لئے سفر کی نیت کروں، پھر اسی وجہ سے فسخ کروں، ہم تو جائیں گے اور وہیں جا کر سنیں گے چنانچہ حج کے بعد صنعاء گئے، اور ذہری اور ابن المسیب کی روایتوں کی (جو پہلے سے ان کی سنی ہوئی نہیں تھیں) انھوں نے وہاں سماعت کی۔

اس بلند ہمتی، جفاکشی، کثرت اسفار اور فطری اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کا نتیجہ تھا کہ ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اس وسعتِ علم اور کثرتِ حفظ کے باوجود وہ امام شافعی کے تفہیم، حسن استنباط اور ذکاوت سے متاثر تھے، اور کہتے تھے کہ مارات عینائی مثلاً انھوں نے اس سے اجتہاد کے اصول سیکھے، اور اس کا ملکہ اخذ کیا، اور بالآخر وہ اس امت کے نامور مجتہدین میں ہوئے، جن کی فقہ ابھی تک عالم اسلام میں زندہ ہے، امام شافعی بھی

ان کے بڑے معترف اور قدرداں تھے، بغداد سے جاتے ہوئے انھوں نے فرمایا "خرجت من بغداد وما خلفت بها اتقى واقفه من ابن حنبل" (میں بغداد چھوڑ کر جا رہا ہوں، اس حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے نہ کوئی فقیہ)

چالیس سال کی عمر میں غالباً ۳۲۷ھ میں انھوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، یہ بھی ان کا کمال اتباع سنت تھا کہ انھوں نے عمر کے چالیسویں سال جو سن نبوت ہے، اشاعت شروع کی، ابتدا ہی سے ان کے درس میں طالبین و سامعین کا ازدحام ہوتا تھا، بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی، جن میں سے پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے، ان کے درس کی مجلسیں بڑی باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھیں، کوئی وہاں تفریح کی بات یا غیر سنجیدہ حرکت جو حدیث کے وقار کے خلاف ہے نہیں کر سکتا تھا، غریب، گوارا اور اہل دنیا کے مقابلہ میں ترجیح اور اعزاز حاصل تھا، علامہ ذہبی امام احمد کے ایک رفیق اور ہم عصر کا بیان نقل کرتے ہیں:-

لم ارالفقیہ فی مجلس اعزمنہ فی مجلس	میں نے غریب آدمی کو جتنا امام احمد کی مجلس درس
الی حدیثہ کان ماثلًا الیہم، مقصراً	میں معزز دیکھا، کہیں نہیں دیکھا وہ غریب کی طرف تو بوجہ
عن اهل الدنيا، وكان فيه حلم ولم	یہتے تھے، اور امارا سے بے رنجی رہتے تھے، ان میں حلم و
يكن بالعقول، وكان كثير التواضع	وقار تھا، ان کے مزاج میں عجلت نہ تھی، بڑے متواضع
تلوه السكينة والوقار اذا جلس في	اور نگر المزاج تھے، طمانینت اور وقار ان کے چہرہ سے
مجلسه للفتيا بعد العصر لا يتكلم حتى يسأل ^{۵۲}	عیاں تھا، عصر کے بعد جب درس کے لئے بیٹھتے تو جب تک

ان سے سوال نہ کیا جائے گفتگو نہ فرماتے تھے۔

ان کی زندگی ائمہ سلف کی طرح فقر و زہد اور توکل و قناعت کی زندگی تھی، اور ان کا یہ فقر اختیاری

تھا، انھوں نے کبھی خلفاء اور سلاطین وقت کا کوئی عطیہ قبول نہیں کیا، ان کے لڑکوں نے کبھی ان سے اس مسئلہ پر بات چیت کی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ بال حلال ہے، اس سے حج درست ہے، میں اس کو حرام سمجھ کر نہیں، بلکہ احتیاطاً چھوڑتا ہوں، وہ محنت کر کے یا اپنی آبائی جائیداد کی آمدنی سے گزارا کرتے تھے، اس فقر و تنگدستی کے باوجود بڑے فیاض اور عالی حوصلہ تھے، فرماتے تھے، اگر ساری دنیا سمٹ کر ایک لقمہ بن جائے، اور وہ لقمہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں ہو، اور وہ مسلمان اس لقمہ کو کسی مسلمان بھائی کے منہ میں رکھ دے تو ذرا بھی اسراف نہ ہوگا، وہ صرف مال کے بائے میں نہیں بلکہ اپنی ذات کے بائے میں بھی بڑے فراخ حوصلہ اور عالی ظرف تھے، ایک شخص نے ایک موقع پر ان کو بہت سخت سست کہا، تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کو ندامت ہوئی، اور اس نے آکر معذرت کی، اور کہا کہ آپ مجھے معاف کر دیں، فرمایا جہاں یہ بات ہوئی تھی، وہاں سے قدم اٹھانے سے پہلے میں تم کو معاف کر چکا تھا، انھوں نے فتنہ خلقِ قرآن میں اپنے سب دشمنوں کو حتیٰ کہ خلیفہ وقت کو جس کے حکم سے ان کو سخت ترین اذیت پہنچی تھی، معاف کر دیا، فرماتے تھے کہ صرف داعی بدعت کو تو معاف نہیں کرتا، ورنہ جس نے میری اذیت میں حصہ لیا ہے، سب میری طرف سے آزاد ہیں، کبھی فرماتے کہ تمہارا اس میں کیا نفع ہے کہ تمہارے سبب سے کسی مسلمان کو عذاب دیا جائے۔

ان کمالات و اوصاف کے ساتھ کبھی ان کو اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا تھا، اور کوئی فخریہ کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا، ان کے ساتھی یحییٰ بن معین کہتے ہیں:-

مارأیت مثل احمد بن حنبل صحبتہ
 میں نے احمد جیسا آدمی نہیں دیکھا میں پچاس برس
 خمسين سنة ما افتخر علينا بشئ مما كانا
 ان کے ساتھ رہا، انھوں نے کبھی ہمارے سامنے
 فيه من الصلاح والخير
 اپنی صلاح و خیر پر فخر نہیں کیا۔

ان کی تواضع اور اخلاص کا یہ حال تھا کہ اگرچہ وہ عالی نسب عرب تھے، اور یہ اس دور میں بڑا سرمایہ فخر تھا، لیکن اس کا تذکرہ بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے، علامہ ذہبی ان کے ایک معاصر عارم ابو نعمان سے

نقل کرتے ہیں کہ احمد بن حنبل نے میرے پاس اپنا خرچ رکھا دیا تھا، اور اس سے بقدر ضرورت وہ لیتے رہتے تھے،

ایک نے میں نے ان سے کہا کہ ابو عبد اللہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عرب میں انھوں نے جواب دیا: ”یا ابا النعمان فحق قم مساکین“ (ابو نعمان ہمارا کیا ہم غریب لوگ ہیں؟) میں ان سے بہت پوچھتا رہا، مگر انھوں نے ٹال دیا، اور کوئی جواب نہیں دیا۔

باوجود اس کے کہ فقہ، خلق قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں ان کا چرچا تھا اور ہر طرف ان کی تعریف اور ان کے لئے دعا کا غلغلہ بلند تھا، وہ برابر خائف رہتے تھے اور ان کو اپنی طرف سے اطمینان نہیں تھا، مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ کے لئے بڑی کثرت سے دعا ہوتی ہے، فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہ میں استدراج نہ ہو کیوں تم نے یہ کیسے کہا؟ میں نے کہا کہ طرسوس سے ایک شخص آیا ہے وہ کہتا ہے کہ ہم ملک و م میں جہاد کر رہے تھے، رات کے ستارے میں احمد کے لئے دعا کا شور ہوا، اور کہنے والے نے کہا کہ احمد کے لئے دعا کرو! ہم امام احمد کی طرف سے نیت کر کے منجیق بھی چلاتے تھے، اور ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دشمن کا ایک شخص قلعہ کی دیوار پر کھڑا ہوا تھا، اور سپر کو بالکل آڑ بنا دے ہوئے تھا، ہم نے احمد کی نیت کر کے منجیق چلائی، اس کا سر اور سپر اڑ گئی، پس کر امام احمد کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، اور فرمایا خدا کرے یہ استدراج نہ ہو!

بعض مرتبہ ان کو دیکھنے کے لئے غیر مسلم بھی دور دور سے آتے، ایک مرتبہ ایک عیسائی طبیب علاج کے لئے آیا، اس نے کہا کہ میں کئی سال سے آپ کی زیارت کا آرزو مند تھا، آپ کی زندگی صرف اسلام ہی کے لئے خیر و برکت کا باعث نہیں، ساری مخلوق کے لئے وہ خیر و برکت ہے، ہمارے سب دوست آپ سے بہت خوش ہیں، مروزی کہتے ہیں کہ جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ ساری دنیا اسلام میں آپ کے لئے دعا ہوتی ہوگی، انھوں نے فرمایا کہ بھائی انسان پر اپنی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو کوئی کچھ کہے اس کو دھوکہ نہیں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو اضع اور سبکت کے ساتھ ان کو رعب و وقار بھی اتنا بخشا تھا کہ اہل حکومت اور فوجی اور سپاہی بھی ان سے معروب ہو جاتے تھے، اور ان کا احترام کرنے پر مجبور تھے، ان کے ایک معاصر کہتے ہیں کہ

میں اسحاق بن ابراہیم (نائب بغداد) اور فلاں فلاں حکام کے پاس گیا ہوں، لیکن میں نے احمد بن حنبل سے زیادہ باعجب کسی کو نہیں دیکھا، میں ان سے ایک مسئلہ میں گفتگو کرنے گیا، مجھ پر ان کی ہیبت سے لرزہ طاری ہو گیا، ان زمانہ کے تمام اہل قلوب اور اہل خلوص ان کی عظمت کے قائل اور ان کا ادب کرتے تھے، علماء وقت اور ائمہ فن ان کے تبر و وسعتِ علم کے معترف اور اس سے متعجب ہیں، مشہور محدث ابراہیم احراری کہتے ہیں:-

رأيت احمد بن حنبل فرأيت كان الله
جمع له علم الاولين والاخرين من كل
منف يقول ما شاء ويمسك
میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
الله تعالیٰ نے ان کے سینہ میں اگلوں پھلوں کا قسم کا علم
جمع کر دیا ہے جس کا چاہتے ہیں، اظہار کرتے ہیں، اور جس کو
چاہتے ہیں اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔

امام احمد کا زہد ضرب المثل تھا، مامون، معتمد اور واثق کا دوران کے لئے اس حیثیت سے آزمائش کا تھا کہ وہ تینوں ان کے درپے آزار تھے، متوکل کا دور اس لئے آزمائش کا تھا کہ وہ ان کا عقیدت مند اور زہدیت قدر داں تھا، ان کو اس دور کی آزمائش زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی، اور اس سے ہمیشہ خائف رہتے تھے، کبھی کبھی فرماتے تھے کہ ان لوگوں کی ایذا و تعذیب کے باوجود میرا دین سلامت رہا، اب اس بڑھاپے میں اس دوری آزمائش میں مبتلا ہوں، لیکن جس طرح معتمد کے تازیانے ان کے اعتصام باسنۃ اور استقامت میں فرق نہ پیدا کر سکے، اسی طرح متوکل کی عقیدت مندی ان کے استغناء و توکل میں تغیر نہ پیدا کر سکی، ایک مرتبہ متوکل نے ایک ایسی بھاری تھیلی بھیجی جو خنجر پر رکھ کر لائی گئی تھی، انھوں نے صاف کہہ دیا کہ مجھے حاجت نہیں، لانے والے نے کہا کہ آپ کو واپس کرنا مناسب نہیں، بڑی مشکل سے خلیفہ کا دل صاف ہوا ہے، اس کو پھر بدگمانی ہو جائے گی، انھوں نے ایک جگہ ڈلوادی، آدھی رات کو انھوں نے اپنے چچا کو بلایا، اور کہا کہ مجھے اس تھیلی کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئی، میں یہ لے کر بڑا پشیمان اور پریشان ہوں، انھوں نے کہا کہ اس وقت تو آدھی رات ہے، لوگ غافل

سو رہے ہیں، صبح جیسا آپ کی سمجھ میں آئے کیجئے گا، صبح ہی انھوں نے بعض مستور اور بعض واقف کار لوگوں کو بلایا، اور ان لوگوں کی فہرست تیار کروائی جو صاع اور مستور احوال تھے، اور مال تقسیم کرنا شروع کیا یہاں تک کہ پھیلی میں ایک درہم بھی نہیں بچا، پھر پھیلی بھی ایک مسکین کو خیرات کر دی۔^{۱۵}

انھوں نے متوکل کے حکم و اصرار سے کچھ روز اس کی لشکر گاہ میں قیام فرمایا، اس عرصہ میں وہ شاہی مہمان تھے، روزانہ ان کے لئے پُر تکلف کھانا آتا تھا، جس کی قیمت کا اندازہ ایک سو بیس^{۱۶} درہم روزانہ ہے، انھوں نے اس کھانے کو کسی دیر تک کھا نگاہیں نہیں، وہ مسلسل روزہ رکھتے رہے، آٹھ روز انھوں نے روزہ پر روزہ رکھا یہاں تک کہ بے انتہا ضعیف ہو گئے، اگر جلدی ان کو رخصت نہ مل جاتی تو ان کی زندگی مشکل تھی، ان کے صاحبزادہ عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد لشکر گاہ میں سولہ روز رہے، انھوں نے اس عرصہ میں ایک چوتھائی ستو کھایا ہوگا، ان کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے، متوکل کے اصرار سے ان کے صاحبزادوں کے لئے شاہی رقم مقرر ہو گئی تھی، ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کے صاحبزادہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے تو ہمارے یہاں سے وہ کوئی چیز استعمال کے لئے منگوا بھی لیتے تھے لیکن جب شاہی رقم ہمارے گھر آنے لگی، انھوں نے یہ سلسلہ بالکل بند کر دیا، ایک مرتبہ طبیب نے ان کے لئے ایک بھنے ہوئے کدو کا پانی تجویز کیا، لوگوں نے کہا کہ اس کو صاع (امام احمد کے صاحبزادہ) کے تنور میں پکا لو، وہ ابھی گرم ہے، انھوں نے منع فرمایا، آخر میں ان کو خود اپنی احتیاط بھی کافی نہ معلوم ہوئی، صاع کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک روز فرمایا کہ صاع امیراجی چاہتا ہے کہ تم اس عطیہ شاہی کو چھوڑ دے، اس لئے کہ یہ تم کو میرے سبب سے ملتا ہے۔

۷۷ سال کی عمر ہوئی تھی کہ بیمار ہوئے، عیادت کرنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ لوگ فوج در فوج داخل ہوتے تھے، اور گھر بھر جاتا تھا، جب وہ چلے جاتے تو دوسرا انبوه آتا، سڑک آدمیوں سے بھر جاتی تھی ۹ روز وہ بیمار رہے، ہجوم بڑھتا جاتا تھا، سلطان کو اطلاع ہوئی تو ان کے دروازہ پر اور گلی میں پولیس کا پہرہ لگایا،

اور وقائع نگار متعین کر دیئے کہ حالات کی اطلاع برابر ملتی رہے، ہجوم دم نہ دم بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ گلی بند کر دی گئی، لوگ سڑکوں اور مسجدوں میں بھر گئے، یہاں تک کہ بازار میں خرید و فروخت مشکل ہو گئی، پیشاب خون کا آنے لگا تھا، طبیعت دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غم اور فکر نے ان کے پیٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، جمہورات کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، ان کے شاگرد مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو وضو کرایا، تو انھوں نے تکلیف کی حالت میں بھی مجھے ہدایت کی کہ انگلیوں میں خلال کراؤں، شب جمعہ میں حالت زیادہ نازک ہو گئی اور جمعہ ۱۲ ربیع الاول کو اس امام سنت نے انتقال کیا۔

فتنہ خلق قرآن

امون نے خلق قرآن کے مسئلہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی، ۲۱۸ھ میں اس نے والی بغداد اسحق بن ابراہیم کے نام ایک مفصل فرمان بھیجا جس میں عامر مسلمین اور بالخصوص محدثین کی سخت مذمت اور حقارت آمیز تنقید کی، ان کو خلق قرآن کے عقیدہ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے توحید میں ناقص، مردود الشہادۃ، ساقط الاعتبار اور شرار امت قرار دیا، اور حاکم کو حکم دیا کہ جو لوگ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوں، ان کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے، اور خلیفہ کو اس کی اطلاع کی جائے۔

یہ فرمان امون کی وفات سے چار مہینے قبل کا ہے، اس کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں کو بھیجی گئیں اور صوبہ داروں (گورنروں) کو ہدایت کی گئی کہ اپنے اپنے صوبوں کے قضاۃ کا اس مسئلہ میں امتحان لیں، اور جو اس عقیدہ سے متفق نہ ہو، اس کو اس کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔

اس فرمان کے بعد امون نے حاکم بغداد کو لکھا کہ سات بڑے محدثین کو (جو اس عقیدہ کے مخالفین کے

۱۔ ذہبی ص ۷۷ ۲۔ بخاری تاریخ کبیر وصغیر ۳۔ جنازہ و کفن کی تفصیل آگے آئے گی۔

۴۔ اس خط کا مکمل مضمون تاریخ طبری اور طیفور کی تاریخ بغداد میں موجود ہے۔

سرگروہ میں، اس کے پاس بھیج دیا جائے، وہ سب آئے تو مامون نے ان سے خلقِ قرآن کے متعلق سوال کیا، ان سب نے اس سے اتفاق کیا، اور ان کو بغداد واپس کر دیا گیا، جہاں انھوں نے علماء و محدثین کے ایک مجمع کے سامنے اپنے اس عقیدہ کا اقرار کیا، لیکن شورشِ ختم نہیں ہوئی، اور عام مسلمان اور تقریباً تمام محدثین اپنے خیال پر قائم رہے۔ انتقال سے پہلے مامون نے اسحق بن ابراہیم کو تیسرا فرمان بھیجا جس میں ذرا تفصیل سے پہلے خط کے مضمون کو بیان کیا تھا، اور امتحان کے دائرہ کو وسیع کر کے اہلکارانِ سلطنت اور اہل علم کو بھی اس میں شامل کر لیا تھا، اور سب کے لئے اس عقیدہ کو ضروری قرار دیا تھا، اسحق نے فرمانِ شاہی کی تعمیل کی، اور مشاہیر علماء کو جمع کر کے ان سے گفتگو کی، اور ان کے جوابات اور مکالمہ کو بادشاہ کے پاس لکھ کر بھیج دیا، مامون اس محضر کو پڑھ کر سخت برا فرختہ ہوا، ان علماء میں سے دو (بشر بن الولید اور ابراہیم ابن المہدی) کے قتل کا حکم دیا، اور لکھا کہ بقیہ میں سے جس کو اپنی رائے پر اصرار ہو، اس کو پابجولاں اس کے پاس بھیج دیا جائے چنانچہ بقیہ تیس علماء میں سے (جو پہلے قائل نہیں ہوئے تھے) چار اپنی رائے (عدمِ خلقِ قرآن) پر قائم رہے، یہ چار اشخاص امام احمد ابن حنبل، سجادہ، قواریری، اور محمد بن نوح تھے، دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کیا، اور صرف امام اور محمد بن نوح باقی رہے جن کو مامون کے پاس گھوس ستھکڑیوں اور بیڑیوں میں روانہ کر دیا گیا، ان کے ہمراہ انیس دوسرے مقامات کے علماء تھے، جو خلقِ قرآن کے منکر اور اس کے غیر مخلوق ہونے کے قائل تھے، ابھی یہ لوگ رقعہ ہی پہنچے تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر ملی، اور ان کو حاکم بغداد کے پاس بغداد واپس کر دیا گیا، راستہ میں محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، اور امام اور ان کے رفقاء بغداد پہنچے۔

مامون نے اپنے جانشین معتمد بن الرشید کو وصیت کی تھی کہ وہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک و عقیدہ پر قائم رہے، اور اسی کی پالیسی پر عمل کرے (وخذ بسیرۃ اخیک فی القرآن) اور قاضی ابن ابی دواد کو بدستور اپنا مشیر اور وزیر بنائے رہے، چنانچہ معتمد نے ان دونوں وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔

امام احمد ابتلا، و امتحان میں

اب مسئلہ اخلق قرآن کی مخالفت اور عقیدہ صحیحہ کی حمایت اور حکومت وقت کے مقابلہ کی ذمہ داری تنہا امام احمد بن حنبل کے اوپر تھی جو گروہ محدثین کے امام اور سنت و شریعت کے اس وقت امین تھے۔

امام احمد کو رقبہ سے بغداد لایا گیا، چار چار بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی تھیں تین دن تک ان سے اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا، لیکن وہ اپنے اس عقیدہ سے نہیں ہٹے پوچھے دن والی بغداد کے پاس ان کو لایا گیا، اس نے کہا کہ احمد بن نم کو اپنی زندگی ایسی دو بھر ہے، خلیفہ تم کو اپنی تلوار سے قتل نہیں کرے گا، لیکن اس نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم نے اس کی بات قبول نہ کی تو مار پر مار پڑے گی، اور تم کو ایسی جگہ ڈال دیا جائے گا جہاں کبھی سوچ نہیں آئے گا، اس کے بعد امام کو منقسم کے سامنے پیش کیا گیا، اور ان کو اس انکار و اصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے، ایک تازہ جلاوہ صرف دو کوڑے لگاتا تھا، پھر دوسرا جلاوہ بلایا جاتا تھا، امام احمد ہر کوڑے پر فرماتے تھے :-

اعطونی شیئاً من کتاب اللہ اوستة
میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی
رسولہ حتی اقول بہ
سنت سے کچھ پیش کرو تو میں اس کو مان لوں۔

واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے

امام احمد نے اس واقعہ کو خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں :-

”میں جب اس مقام پر پہنچا، جس کا نام باب البستان ہے تو میرے لئے سواری لائی گئی، اور مجھ کو سوار ہونے کا حکم دیا گیا، مجھے اس وقت کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا، اور میرے پاؤں میں بو جھل بیڑیاں تھیں، سوار ہونے کی کوشش میں کئی مرتبہ اپنے منہ کے بل گرتے گرتے بچا، آخر کسی نہ کسی طرح سوار ہوا اور منقسم کے محل میں پہنچا، مجھے ایک کو بٹھری میں داخل کر دیا گیا، اور دروازہ بند کر دیا گیا، اسی رات کا

وقت تھا، اور وہاں کوئی چراغ نہیں تھا، میں نے نماز کے لئے مسح کرنا چاہا، اور ہاتھ بڑھایا تو پانی کا لٹیک
 پیالہ اور طشت رکھا ہوا اٹلا میں نے وضو کیا، اور نماز پڑھی، اگلے دن معتم کا قاصد آیا اور مجھے خلیفہ کے
 دربار میں لے گیا، معتم بیٹھا ہوا تھا، قاضی القضاۃ ابن ابی ذؤاد بھی موجود تھا، اور ان کے ہم خیالوں کی
 ایک بڑی جمیعت تھی، ابو عبد الرحمن الشافعی بھی موجود تھے، اسی وقت دو آدمیوں کی گردنیں بھی اڑائی جا چکی
 تھیں، میں نے ابو عبد الرحمن الشافعی سے کہا کہ تم کو امام شافعی سے مسح کے بارے میں کچھ یاد ہے؟ ابن
 ابی ذؤاد نے کہا کہ اس شخص کو دیکھو کہ اس کی گردن اڑائی جانے والی ہے، اور یہ فقہ کی تحقیق کر رہا ہے،
 معتم نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ، وہ برابر مجھے پاس بلاتا رہا، یہاں تک کہ میں اس سے بہت قریب
 ہو گیا، اس نے کہا بیٹھ جاؤ، میں بیڑیوں سے تھک گیا تھا، اور بوجھل ہو رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے
 کہا کہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے، خلیفہ نے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول نے
 کس چیز کی طرف دعوت دی ہے؟ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی شہادت
 کی طرف، میں نے کہا تو میں اس کی شہادت دیتا ہوں، پھر میں نے کہا کہ آپ کے جہادچند ابن عباس کی روایت
 ہے کہ جب قتیبہ بن عبد القیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ایمان
 کے بارے میں آپ سے سوال کیا، فرمایا انھیں معلوم ہے کہ ایمان کیلئے، انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول
 کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ
 کے رسول ہیں، نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، اور مالی غنیمت میں سے پانچویں حصہ کا ہکانا، اس پر معتم
 نے کہا کہ اگر تم میرے پیش رو کے ہاتھ میں پہلے نہ آگئے ہوتے تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، پھر عبد الرحمن بن سنان
 کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ اس آزمائش کو ختم کرو، امام احمد کہتے ہیں کہ میں نے
 کہا اللہ اکبر اس میں تو مسلمانوں کے لئے کشائش ہے، خلیفہ نے علماء حاضرین سے کہا کہ ان سے مناظرہ کرو
 اور گفتگو کرو، پھر عبد الرحمن سے کہا کہ ان سے گفتگو کرو (یہاں امام احمد اس مناظرہ کی تفصیل بیان

کرتے ہیں)۔

ایک آدمی بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، دوسرا بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، معتمد کہتا، احمد! تم پر خدا رحم کرے، تم کیا کہتے ہو؟ میں کہتا امیر المؤمنین! مجھے کتاب الشریعت رسول میں کچھ دکھائیے تو میں اس کا قائل ہو جاؤں، معتمد کہتا کہ اگر یہ میری بات قبول کر لیں تو میں اپنے ہاتھ سے ان کو آزاد کروں، اور اپنے فوج و لشکر کے ساتھ ان کے پاس جاؤں اور ان کے آستانہ پر حاضر ہوں، پھر کہتا احمد! میں تم پر بہت شفیق ہوں اور مجھے تمہارا ایسا ہی خیال ہے، جیسے اپنے بیٹے ہارون کا، تم کیا کہتے ہو؟ میں وہی جواب دیتا کہ مجھے کتاب الشریعت رسول میں سے کچھ دکھاؤ تو میں قائل ہوں، جب بہت دیر ہو گئی تو وہ اٹا گیا اور کہا جاؤ، اور مجھے قید کر دیا اور میں اپنی پہلی جگہ پر واپس کر دیا گیا، اگلے دن پھر مجھے طلب کیا گیا، اور مناظرہ ہوتا رہا اور میں سب کا جواب دیتا بارہا یہاں تک کہ زوال کا وقت ہو گیا، جب اٹا گیا تو کہا کہ ان کو لیجاؤ، تیسری رات کو میں سمجھا کہ کل کچھ ہو کر رہے گا، میں نے ڈوری منگوائی اور اس سے اپنی بیڑیوں کو کس لیا، اور جس ازار بند سے میں نے بیڑیاں باندھ رکھی تھیں، اس کو اپنے پاؤں میں پھر ڈال لیا کہ میں کوئی سخت وقت آئے اور میں برہنہ ہو جاؤں، تیسرے روز مجھے پھر طلب کیا گیا، میں نے دربار بھرا ہوا ہے، میں مختلف ڈیوڑھیاں اور مقامات طے کرتا ہوا آگے بڑھا، کچھ لوگ تلواریں لئے کھڑے تھے، کچھ لوگ کوڑے لئے، اگلے دونوں دن کے بہت سے لوگ آج نہیں تھے، جب میں معتمد کے پاس پہنچا تو کہا بیٹھ جاؤ پھر کہا ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، لوگ مناظرہ کرنے لگے، میں ایک کا جواب دیتا، پھر دوسرے کا جواب دیتا، میری آواز سب پر غالب تھی، جب دیر ہو گئی تو مجھے الگ کر دیا اور ان کے ساتھ تحلیل میں کچھ بات کہی، پھر ان کو ہٹا دیا، اور مجھے بلایا، پھر کہا احمد! تم پر خدا رحم کرے، میری بات مان لو، میں تم کو اپنے ہاتھ سے رہا کروں گا۔ میں نے پہلا سا جواب دیا، اس پر اس نے ہم ہو کر کہا کہ ان کو پکڑو اور

معتمد امام احمد کے معاملہ میں نرم ہو گیا تھا، مگر احمد بن ذواد برابر اس کو گرم کرتا رہا، اور غیرت دلاتا رہا کہ لوگ کہیں گے کہ معتمد اپنے بھائی مامون کے مسلک سے ہٹ گیا۔

کھینچو اور ان کے ہاتھ اکھیر دو، مقسم کرسی پر بیٹھ گیا، اور جلا دوں اور تازیانہ لگائے والوں کو بلایا، جلا دوں سے کہا اگے بڑھو، ایک آدمی اگے بڑھتا اور مجھے دو کوڑے لگاتا، مقسم کہتا زور سے کوڑے لگاؤ، پھر وہ ہٹ جاتا، اور دوسرا آتا اور دو کوڑے لگاتا، انیس کوڑوں کے بعد پھر مقسم میرے پاس آیا، اور کہا کیوں احمد اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو، بخدا مجھے تمہارا بہت خیال ہے، ایک شخص عجیب مجھے اپنی تلوار کے دستے سے پھیرتا، اور کہتا کہ تم ان سب پر غالب آنا چاہتے ہو، دوسرا کہتا کہ اللہ کے بندے با خلیفہ تمہارے سر پر کھڑا ہوا ہے، کوئی کہتا کہ امیر المومنین آپ روزے سے ہیں، اور آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، مقسم پھر مجھ سے بات کرتا، اور میں اس کو وہی جواب دیتا، وہ پھر جلا دو حکم دیتا کہ پوری قوت سے کوڑے لگاؤ، امام کہتے ہیں کہ پھر اس اشار میں میرے حواس جاتے رہے جب میں پوش میں آیا تو دیکھا کہ بیڑیاں اکھول دی گئی ہیں، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم نے تم کو اوندھے منہ گردایا، تم کو روندنا، احمد کہتے ہیں کہ مجھ کو کچھ اس اس نہیں ہوا۔

بے نظیر عزیمت و استقامت

اس کے بعد احمد بن حنبل کو گھر پہنچا دیا گیا، جب سے وہ گرفتار کئے گئے، رہائی کے وقت تک اٹھائیس ہفتین ان کو صلیب میں گرزے، ان کو ۳۳-۳۴ کوڑے لگائے گئے، ابراہیم ابن مصعب جو سپاہیوں میں سے تھے، کہتے ہیں کہ میں نے احمد سے زیادہ جری اور دلیر نہیں دیکھا، ان کی نگاہ میں ہم لوگوں کی حقیقت بالکل کھلی کی سی تھی۔ محمد بن اسمعیل کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر پڑتا تو حیخ مار کر بھاگتا، ایک صاحب جو واقعہ کے وقت موجود تھے، بیان کرتے ہیں کہ امام روزے سے تھے، میں نے کہا بھی کہ آپ روزے سے ہیں، اور آپ کو اپنی جان بچانے کے لئے اس عقیدہ کا اقرار کر لینے کی گنجائش

ہے لیکن انھوں نے اس کی طوٹ انفات نہیں کیا، ایک مرتبہ پیاس کی بہت شدت ہوئی تو پانی طلب کیا آپ کے سامنے بوت کے پانی کا پیالہ پیش کیا گیا، آپ نے اس کو ہاتھ میں لیا، اور کچھ دیر اس کو دیکھا، پھر بغیر پیے واپس کر دیا۔

صاحبزادہ کہتے ہیں کہ انتقال کے وقت میرے والد کے جسم پر ضرب کے نشان تھے، ابو العباس الرقی کہتے ہیں کہ احمد جب رقیں محبوس تھے تو لوگوں نے ان کو سمجھانا چاہا، اور اپنے بچاؤ کرنے کی حدیثیں سنائیں انھوں نے فرمایا کہ خباب کی حدیث کا کیا جواب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پہلے بعض بعض لوگ ایسے تھے جن کے سر پر آرا رکھ کر چلا دیا جاتا تھا، پھر بھی وہ اپنے دین سے ہٹنے نہیں تھے۔

یہ سن کر لوگ ناامید ہو گئے اور سمجھ گئے کہ وہ اپنے مسلک سے نہیں ہٹیں گے اور سب کچھ برداشت کریں گے

وَبِكَ الْعِلَازِ الْحَسَنِي ۹۶۳
قَالَ رَضِيَ عَنْكَ رَبِّي ۱۱۲۱۳

امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ

امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اور مسلمان ایک بڑے دینی خطرہ سے محفوظ ہو گئے، جن لوگوں نے اس دینی ابتلا میں حکومت و وقت کا ساتھ دیا تھا، اور وقوع پرستی اور مصلحت شناسی سے کام لیا تھا، وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر گئے، اور ان کا دینی و علمی اعتبار جاتا رہا، اس کے بالمقابل امام احمد کی شان دو بالا ہو گئی، ان کی محبت اہل سنت اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا شعار اور علامت بن گئی، ان کے ایک معاصر قتیبہ کا منقولہ ہے کہ:-

اِذَا رَأَيْتَ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَحْمَدَ بْنَ حَنْبَلٍ فَاَعْلَمْ اَنَّهٗ صَاحِبُ سُنَّةٍ
جَبَّ تَمَّ كَسَى كَوْدِكِيْهُوْكَ اِسْكَوْ اَحْمَدَ بْنَ حَنْبَلٍ سَے
مَحَبَّتْ هَے تَوَسَّجْهُ لَوْ كَهْ وَهْ سُنَّتْ كَاتِبْ هَے۔

لہ تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الامام احمد ۴۹-۵۰ باختصار و تلخیص۔

ایک دوسرے عالم احمد بن ابراہیم الدورقی کا قول ہے۔

من معتمدیذکر احمد بن حنبل جس کو تم احمد بن حنبل کا ذکر برائی سے کرتے سنو
بسورۃ فاتحہ ص ۷ علی الا سلام۔ اس کے اسلام کو مشکوک نظر سے دیکھو۔

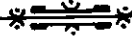
امام احمد حدیث میں امام وقت تھے، مسند کی ترتیب و تالیف ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے وہ مجتہد فی المذہب اور امام مستقل ہیں، وہ بڑے زاہد و عابد تھے، یہ سب فضیلتیں اپنی جگہ پر مسلم ہیں لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت امامت کا اصل راز ان کی عزیمت اور استقامت اس فتنہ عالم آشوب میں دین کی حفاظت اور اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہی کا تنہا مقابلہ تھا یہی ان کی قبول عام اور بقائے دوام کا اصل سبب ہے۔

آوازہ خلیل ز تعمیر کعبہ نیست
مشہور شد رازاں کہ در آتش نکوشت

ان کے معاصرین نے جنھوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی، ان کے اس کارنامہ کی عظمت کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے، اور اس کو دین کی بروقت حفاظت اور مقام صدیقیت سے تعبیر کیا ہے، ان کے ہم عصر اور ہم استاد مشہور محدث وقت علی بن المدینی (جو امام بخاری کے مایہ ناز استاد ہیں) کا ارشاد ہے:-

ان الله اعز هذا الدين برجليں الله تعالى نے اس دین کا غلبہ و حفاظت
ليس لهم ثالث، ابوبكره ماصديق کا کام دو شخصوں سے لیا ہے جن کا کوئی تیسرا ہم
يوم الردة واحمد بن حنبل يوم المحنة نظر نہیں آتا، ازمداد کے موقع پر ابوبکر صدیق
اور فتنہ و خلق قرآن کے سلسلہ میں احمد بن حنبل۔

اس عظمت و مقبولیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ۲۴۱ھ میں جب اس امامِ سنت نے انتقال کیا تو سارا شہر
امنڈ آیا، کسی کے جنازہ پر خلقت کا ایسا ہجوم اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا، نماز جنازہ
پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں۔



فتنہ اعتزال

اور

امام ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو

معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات

مقصد اور واقعہ کے انتقال پر (جو مذہب اعتزال اور معتزلہ کے سرپرست تھے) معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا، واقعہ کا جائزہ خلیفہ مستوکل مذہب اعتزال سے بیزار اور معتزلہ کا دشمن تھا، اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر معتزلہ کی عظمت و اقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بیدخل کر دیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا، خلق قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھو چکا تھا، لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے، معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کر لیا تھا، اور قضا، افتاء و حکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے، تیسری صدی کے وسط میں ان کا خاصا دور دورہ ہو گیا، عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر وسیع الفكر اور محقق ہوتے ہیں، اور ان کی آراء و تحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے، امام احمد کے بعد خاندان میں کوئی طاقت ور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی، محدثین اور ان کے ہم مسلک علماء نے علوم عقلیہ اور نہ طریقہ بحث و نظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج پڑ چلا تھا) توجہ نہیں کی، نتیجہ یہ نکلا کہ مباحثہ کی مجلسوں

اور درس کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی، اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پلہ ابھاری رہتا، اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے، اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطحی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے، اور بختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسن تقریر یا حاضر جوابی اور علمی موٹنگانی سے متاثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری، اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی تھی، خود محدثین اور ان کے تلامذہ کے گروہ میں بہت سے لوگ احساس کہتری کا شکار تھے، اور معتزلہ کی عقلیت اور فلسفہ سے مرعوب ہو رہے تھے یہ صورت حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لئے سخت خطرناک تھی، قرآن مجید کی تفسیر اور عقائد اسلام، ان فلسفی نما مناظرین کے لئے بازیچہ اطفال بنے جا رہے تھے مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی، یہ محض ایک ذہنی ویرانہ تھی، اور اصطلاحات کی معرکہ آرائی اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے نہ تو محدثین و حنابلہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا، نہ عابدوں و زاہدوں کا زہد و عبادت، اور نہ فقہاء کے فتاویٰ اور جزئیات و مسائل پر ان کا عبور و استحضار۔

سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت

اس کے لئے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں جو عقلیت کے کوچہ سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رد و ردہ چکا ہو جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت و فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں، اور ایسے پست و حقیر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیوقامت انسان کے سامنے پسندہ قد انسان اور نو عمر بچے اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امام سنت کی ضرورت تھی، اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔

امام ابو الحسن اشعری

ابو الحسن علی نام، والد کا نام اسمعیل تھا، مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اولاد میں تھے، ۲۶ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ نے ان کے والد اسمعیل کے انتقال کے بعد ابو علی ابجائی سے نکاح کر لیا تھا، جو اپنے وقت میں معتزلہ کے امام اور مذہب اعتزال کے علمبردار تھے، شیخ ابو الحسن نے ان کی انخوش میں تربیت پائی اور بہت جلد ان کے معتمد اور دست راست بن گئے، ابو علی ابجائی اچھے مدرس اور مصنف تھے، مباحثہ پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے تھے، ابو الحسن اشعری شروع سے زبان آور حاضر جواب تھے، ابو علی بحث و مناظرہ کے موقع پر انہی کو آگے کر دیتے تھے، بہت جلد وہ سرحلقہ اور مجالس بحث کے صدر نشین بن گئے، تمام ظاہری قیاسات و قرائن بتلاتے تھے کہ وہ اپنے مربی اور استاد کے جانشین ہوں گے اور مذہب اعتزال کی حمایت و اشاعت میں شاید ان سے بھی آگے بڑھ جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے انتظامات عجیب ہیں، اس نے سنت کی حفاظت و نصرت کے لئے اس شخص کو انتخاب کیا، جس نے ساری زندگی مذہب اعتزال کی حمایت و اثبات میں گزاری تھی، اور جس کے لئے اعتزال کی سندِ امامت تیار تھی، شیخ ابو الحسن کی طبیعت میں اعتزال کا رد عمل پیدا ہوا، ان کی طبیعت معتزلہ کی تاویلوں اور قیاس آرائیوں سے متنفر ہونے لگی، اور ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب ذہانت کی باتیں ہیں، اور اپنے مذہب کی پچ ہے، حقیقت کچھ اور ہے، اور وہ وہی ہے، جو صحابہ کرام اور سلف کا مسلک ہے، بالآخر عقل کو اسی آستانہ پر جھکنا پڑتا ہے، چالیس برس تک معتزلہ کے مذہب اور اعتقادات کی حمایت اور ان کو ثابت کرنے کے بعد ان کی طبیعت اس سے بالکل پھر گئی، اور ان کے ذہن میں اس کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی، پسندیدہ دن وہ گھر سے نہیں نکلتے، سولہویں دن وہ گھر سے سیدھے جامع مسجد پہنچے، جمعہ کا دن تھا، اور جامع مسجد

بھری ہوئی تھی، انھوں نے منبر پر چڑھ کر بلند آواز سے اعلان کیا "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا ہے اس کو بتلاتا ہوں کہ میں ابو الحسن اشعری ہوں، میں معتزلی تھا، فلاں فلاں عقیدوں کا قائل تھا، اب تو بے کرتا ہوں اپنے سابق خیالات سے باز آتا ہوں، آج سے میرا کام معتزلہ کی تردید اور ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کا اظہار ہے، وہ دن اور ان کی زندگی کا اخیر دن ان کی ذہانت، علمی تجربہ و قوت کو بانی اور استدلال تحریر و اعتزال کی تردید اور سلف کے مسلک اور اہل سنت کے عقائد کی تائید اور اثبات میں صرف ہوئی، جو کل تک معتزلہ کی زبان اور ان کا سب سے بڑا وکیل تھا، وہ اہل سنت کا ترجمان اور ان کا سب سے بڑا حامی بن گیا۔

امام ابو الحسن اشعری کا جذبہ تبلیغ و احقاق حق

وہ اس فرض کو تقرب الی اللہ اور جہاد و دعوت سمجھ کر انجام دیتے تھے، اور خود معتزلہ کی مجلسوں میں جا کر اور ان کے منازعوں سے مل کر ان کو مطمئن کرنے اور حق کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتے تھے، کسی نے ان کو کہا کہ آپ اہل بدعت سے کیوں ملتے جلتے ہیں، اور خود کیوں ان کے پاس چل کر جاتے ہیں، حالانکہ ان کے مقاطعہ کا حکم ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کیا کروں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں، ان میں سے کوئی حاکم شہر ہے، کوئی قاضی ہے، وہ اپنے عہدہ اور وجاہت کی وجہ سے میرے پاس آنے سے رہے، اب اگر میں بھی ان کے پاس نہ گیا تو حق کیسے ظاہر ہوگا، اور ان کو کیسے معلوم ہوگا کہ اہل سنت کا بھی کوئی مددگار اور دلائل سے ان کے مذہب کو ثابت کرنے والا ہے؟

ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات

امام ابو الحسن کو مناظرہ اور بحث و استدلال کا پہلے سے ملکہ تھا، اور یہ ان کا فطری ذوق اور خدا داد

صلاحیت تھی، مذہب حق کی حمایت کے جذبہ اور تائید الہی نے ان کی ان قوتوں اور صلاحیتوں کو اور جلادینا کی وہ اپنے زمانہ کی عقلی سطح سے بلند تھے، اور عقلیات و علم و کلام میں مجتہدانہ دماغ رکھتے تھے، مغز کے سوالات و اعتراضات کا جواب وہ اس آسانی سے دیتے تھے، جیسے کوئی کہتے مشق استاد اور ماہر فن، ہندی طالب علموں کے سوالات کا جواب دیتا ہے، اور ان کو خاموش کر دیتا ہے، ان کے ایک شاگرد ابو عبد اللہ بن خلیفہ اپنی پہلی ملاقات اور ایک مجلس کی کیفیت بیان کرتے ہیں :-

”میں شیراز سے بصرہ آیا، مجھے ابوالحسن اشعری کی زیارت کا شوق تھا، لوگوں نے مجھے ان کا پتہ دیا، میں آیا، تو وہ ایک مجلس مناظرہ میں تھے، وہاں معتزلہ کی ایک جماعت تھی، اور وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے، جب وہ خاموش ہوئے، اور انھوں نے اپنی بات پوری کر لی، تو ابوالحسن اشعری نے گفتگو شروع کی انھوں نے ایک ایک سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے یہ کہا تھا اور اس کا جواب یہ ہے، تم نے یہ اعتراض کیا تھا، اور اس کا جواب اس طرح ہے، یہاں تک کہ انھوں نے سب کا جواب دے دیا، جب وہ مجلس سے اٹھے تو میں ان کے پیچھے پیچھے چلا، اور ان کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا، انھوں نے فرمایا کہ تم کیا دیکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کی کتنی زبانیں ہیں، کتنے کان اور کتنی آنکھیں ہیں (کہ آپ سب کی سنتے، سب کی سمجھتے، اور سب کا جواب دیتے ہیں) وہ یہ سن کر سنسنے لگے۔“

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ ”آپ کی سب باتیں تو سمجھ میں آئیں، مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ آپ ابتداءً خاموش کیوں رہتے ہیں“ اور معتزلہ کو گفتگو کا موقع کیوں دیتے ہیں، آپ کی شان تو یہ ہے کہ آپ ہی گفتگو کریں“ اور اعتراضات کو خود رفع کر دیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل و اقوال کو اپنی زبان سے ادا کرنا جائز نہیں سمجھتا، البتہ یہ جب کسی کی زبان سے نکل جائیں تو پھر ان کا جواب دینا، اور ان اقوال کی تردید اہل حق کا فرض ہو جاتا ہے۔“

امام ابو الحسن اشعری مجتہد فن اور علم کلام کے بانی تھے، ان کے بعد تکلمین ان کی خداداد ذہانت، ان کے کلام کی گہرائی، ان کی نکتہ رسی، اور ان کی بالغ نظری کے قائل ہیں، قاضی ابوبکر باقلانی سے جس کو ان کے معاصرین نے ان کی فصاحت و حسن تقریر و قوت تحریر کی وجہ سے "لسان الائمہ" کا خطاب دیا تھا کسی نے کہا کہ آپ کا کلام ابو الحسن اشعری کے کلام سے زیادہ بلند اور واضح معلوم ہوتا ہے، انھوں نے کہا کہ "میری ہی سعادت ہے کہ میں ابو الحسن کے کلام کو سمجھ لوں"۔

علامہ ابو اسحق اسفرائینی کا پایہ علم کلام و اصول فقہ میں مسلم ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیخ ابو الحسن بابلی (امام ابو الحسن اشعری کے شاگرد) کے سامنے ایسا تھا، جیسے سمندر کے اندر قطرہ اور شیخ ابو الحسن بابلی کہتے تھے کہ میری حیثیت امام ابو الحسن اشعری کے سامنے ایسی تھی جیسے سمندر کے پہلو میں ایک قطرہ۔

ان کا مسلک اور ان کی خدمات

امام ابو الحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل و متوسط مسلک اختیار کیا، وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الہیات کے بارے میں اور ما بعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف اپنا عمل کر سکے اور اس کے جزئیات و تفصیلات اور ذات و صفات باری تعالیٰ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر سکے، اور اس کو معیار قرار دیا جاسکے، نہ بعض پر جوش محدثین و مخالفہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلامیہ کی حفاظت کے لئے عقل کا انکار اور اس کی تحقیر ضروری سمجھتے تھے، اور ان کلامی و اعتقادی مباحث سے جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے، احتیاط و سکوت واجب سمجھتے تھے، وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے جس سے مذہب و عقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا، ان کا اس پر عمل تھا کہ "کلموا الناس علی قدر عقولہم" اس میں

جس طرح عوام کی عقلی سطح کی رعایت ضروری ہے، اسی طرح اہل علم و عقلاء کی عقلی سطح کی رعایت بھی ضروری ہے۔
 ابوالحسن اشعری نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی کہ انھوں نے دین کے اخذ و فہم
 میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اپنے فرقہ کے پیشواؤں کی تقلید کی، اور کتاب و سنت کو اس کا اخذ نہیں
 بنایا، بلکہ جہاں قرآن کی آیات اور اپنے عقائد میں تعارض دیکھا، بے تکلف اس کی تاویل اور توجیہ کر لی۔
 ”کتاب الابانۃ من اصول الدیانۃ“ میں جو اعتزال سے علیحدگی کے بعد کی اولین تصنیفات میں سے ہے،
 تحریر فرماتے ہیں:-

أما بعد إفاناً من الزائغين عن الحق	حمد و صلوة کے بعد معلوم ہو کہ معتزلہ اور قدریہ فرقوں
من المعتزلة و أهل القدر مالت بهم	نے جو حق سے منحرف ہیں اپنی خواہشات کی پیروی میں
أهواهم إلى تقليد رؤسائهم و من مضى	اپنے پیشواؤں اور اپنے فرقہ کے پیش روؤں کی تقلید
من أسلافهم فتأولوا القرآن على أرائهم	کی، اور اپنی آراء کے مطابق کرنے کے لئے قرآن مجید کی
تأويل لم ينزل الله به سلطاناً و لا وضح	ایسی تاویلات کیں جن کی خدا نے کوئی سند نہیں
به برهاناً و لا نقولاً عن رسول الله	اتاری نہ ان کی کوئی واضح دلیل ہے، اور نہ وہ
سرب العالمين و لا من السلف	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف (صحابہ و
المتقدمين	تابعین) سے منقول ہیں۔

پھر اپنے منسلک کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں:-

قولنا الذي نقول به وديانتنا التي	ہمارا حقیقہ جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا مسلک
ندين بها الفسك بكتاب ربنا و قول	جس پر ہم قائم ہیں یہ ہے کہ قرآن مجید اور سنت
و بسنة نبينا عليه السلام و ما روي	رسول کو مضبوط پکڑا جائے اور صحابہ و تابعین

”کتاب الابانۃ من اصول الدیانۃ ص ۴، طبع دائرة المعارف حیدرآباد۔“

عن الصحابة والتابعين وأئمة الحديث
 ونحن بذلك معتمدون وبما كان
 يقول به أبو عبد الله أحمد بن محمد
 بن حنبل نصر الله وجهه ورفع رتبته
 واجزل مشيخته قائلون ولما خالف
 قوله مخالفون لأنه الإمام الفاضل
 والرئيس الكامل الذي أبان الله
 به الحق ورفع به الضلال وأوضح
 به المنهاج وقمع به بدع المبتدعين
 وزيع الزائغين وشك الشاكين فجمعة
 الله عليه من إمام مقدم وخليل
 معظم مفتخر له

اور ائمہ حدیث سے جو منقول ہے اس کو اختیار
 کیا جائے ہم اسی مسلک پر مضبوطی سے قائم ہیں اور
 امام احمد بن حنبل کے عقائد و مسلک کے (الشران
 کے چہرہ کو متوازعہ رکھے، اور ان کے درجات
 بلند فرمائے، اور ان کو اجر جزیل عطا فرمائے) قائل
 و متقدم ہیں، اور جو ان کے مسلک سے علیحدہ ہے ہم
 اس سے علیحدہ ہیں، اس لئے کہ وہ ایسے امام فاضل
 اور پیشوائے کامل تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے
 ہاتھوں حق کو واضح اور گمراہی کو زائل فرمایا اور
 صراطِ مستقیم کو روشن کیا اور مبتدعین کی بدعات
 اہل زینہ کی کجروی، اور اہل ترک کے شکوک کا ازالہ
 کیا، اللہ تعالیٰ ایسے بلند پایہ امام اور ایسے حق
 محبت و احترام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

لیکن ان کا اصلی کارنامہ اس مسلکِ سنت اور عقیدہ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی
 تائید نہیں ہے، یہ تو محدثین اور عام خابکہ کہہ رہے تھے، ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و
 سنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا، اور معتزلہ اور دوسرے
 فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے عقائد
 اہل سنت کی صداقت اور ان کا منقول و معقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔

دین کی اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے اس عظیم انسان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ مغز اور معرفت
فروق کے ”معتوب“ بنے، اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن وہ ان تشدد و محدثین اور جامد حنا بلہ کے اعتراضات
کا ہدف بھی بن گئے، جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا، اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور نقلی بحث
و مسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک ”زیغ و ضلال“ کی بات تھی۔

امام ابو الحسن اشعری خود اس بات کے قائل و داعی ہونے کے باوجود کہ عقائد کا ماخذ اور الہیات
و مابعد الطبیعیاتی مسائل کے علم کلام کا سرچشمہ کتاب و سنت اور تعلیمات نبوت ہے، نہ کہ عقل مجرد، اور قیاسات
یا یونانی الہیات اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ زمانہ کے اثرات سے یا دوسری قوموں اور فلسفوں کے اختلاط
سے عقائد کے بارے میں جو مسائل چھڑ گئے ہیں، اور ان کی بنیاد پر مستقل گروہ اور فرقے بن گئے ہیں، ان سے صرف
اسی بنا پر سکوت کیا جائے کہ حدیث میں ان مسائل و مباحث اور ان الفاظ و اصطلاحات کا ذکر نہیں ہے،
ان کے نزدیک اس سے سنت و شریعت کے وقار کو نقصان پہنچے گا، اور اس کو ان کی شکست اور کمزوری پر
محمول کیا جائے گا، نیز فرقہ باطلہ کو جو عقلی استدلال اور فلسفہ کی اصطلاحات سے کام لے رہے ہیں، خود اہل سنت
کے اندر نفوذ کرنے اور ان کے نوجوان اور ذہین عنصر کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع ملے گا، ان کے نزدیک عقائد
کا ماخذ یقیناً وحی و نبوت محمدی ہے، اور اس کا ذریعہ علم کتاب و سنت اور صحابہ کرام کے اقوال و روایات ہیں،
اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ و فلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے متوازی ہے، لیکن وہ ان تھاق و عقائد
کے ثبوت میں تائید کے لئے عقلی استدلال اور رائج الوقت الفاظ و اصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز
بلکہ وقت کے تقاضے کی بنا پر ضروری اور افضل الجہاد سمجھتے ہیں، نیز وہ مباحث جن کا تعلق عقلیات و حیات
سے ہے، اور معتزلہ و فلاسفہ نے ان کو (خوا مخواہ) عقائد کی بحث کا جزو بنادیا ہے، اور اپنی ذہانت اور زبان
آوری سے ان کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا ہے، امام ابو الحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا درست
نہیں، شریعت کے وکیل و ترجمان کو ان دائروں میں بھی ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اور عقلی و حسی حیثیت سے

ان کی نزدیک اور اہل حق کے مذہب کا اثبات فرض ہے، ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے سکوت کی وجہ لاعلمی نہ تھی، بلکہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں یہ مباحث اور یہ طرز استدلال پیدا نہیں ہوا تھا لیکن جس طرح زمانہ کے تغیرات اور نئے حالات نے بہت سی فقہی تفصیلات و جزئیات پیدا کر دیں اور نئے مسائل کے استنباط اور اجتہاد پر مجبور کیا، اور زمانہ شناس اور مخلص فقہاء و مجتہدین نے استنباط و اجتہاد سے کام لے کر نئے حوادث و مسائل کا جواب دیا، اور امت کو نئے فتنوں اور محاذوں پر علمی کے حلوں سے بچایا، اسی طرح محافظین بشریعت اور متکلمین اہل سنت کا فرض ہے کہ عقائد و الہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں، یا نئے اعتراضات کئے جا رہے ہیں، ان کا جواب دین اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائد حقہ کو ثابت و مدلل کریں، امام ابو الحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لئے ایک مستقل رسالہ استحسن التخصیص فی الکلام تصنیف کیا۔

بہر حال انھوں نے دونوں گروہوں کی رضامندی اور نارضامندی سے آنکھیں بند کر کے دین کی نصرت و حمایت اور ایمان و عقیدہ کی حفاظت کے لئے جو طرز عمل ضروری سمجھا، بڑی شجاعت اور ذہانت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی، اور تقریراً و تحریراً اس میں مصروف رہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتزلہ و فلاسفہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو تھام لیا، اور بہت سے اکھڑے ہوئے قدموں کو جادیا، عقائد اہل سنت اور طریقہ سلف کی طرف سے پُر زور و مدلل حمایت و وکالت کرنے کی وجہ سے اہل سنت میں نیا اعتماد اور نئی زندگی پیدا ہوئی، اور وہ احساس کہتری رک گیا، جو گھن کی طرح سوا دامت کو کھاتا جا رہا تھا، معتزلہ بھی ان کے پے درپے حلوں سے پیچھے ہٹ گئے، اور ان کو اپنی حفاظت اور اپنے مذہب کے وجود کو قائم رکھنے کی فکر لاحق ہو گئی، ابو بکر بن الصیرفی کہتے ہیں کہ معتزلہ نے بہت سراٹھایا تھا، ان کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے امام ابو الحسن اشعری کو پیدا کر دیا، انھوں نے معتزلہ کو اپنی ذہانت و استدلال سے بند کر دیا، ان کے اس کارنامہ کی وجہ سے لوگوں نے ان کو مجدد دین و محافظین سنت میں شمار کیا ہے، اور ابو بکر اسماعیلی جیسے بعض اہل نظر

نے تجدیدِ دین اور حفاظتِ شریعت کے سلسلہ میں امام احمد کے بعد ان کا نام لیا ہے۔

ان کی تصنیفات

امام ابوالحسن اشعری نے صرف بحث و مناظرہ اور زبانی تقریر و تفہیم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عقائد باطلہ کی تردید میں جلیل القدر کتابیں تصنیف کی ہیں، انھوں نے اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کی جو ذہبی کے بیان کے مطابق تفسیرِ اجزا میں ہے، بعض مؤلفین نے امام ابوالحسن اشعری کی تصنیفات ڈھائی سو سے تین سو تک بیان کی ہیں، جن میں سے اکثر معتزلہ کے رد میں ہیں، اور بعض دوسرے مذاہب اویان و فرق کی تردید میں ان میں ایک کتاب الفصول ہے، جس میں انھوں نے فلاسفہ طباغین (نیچری) دہریہ، ہندوؤں، یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کا رد کیا ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، اور بارہ کتابوں کا مجموعہ ہے، ابن خلکان نے کتاب "الملح" "الموجز" "ایضاح البرہان" "التبیین عن اصول الدین" "الشرح والتفصیل فی الرد علی اهل الافک والتفیل" کا بھی ذکر کیا ہے، علوم عقلیہ و کلام کے علاوہ علوم شریعت میں بھی ان کی متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے "کتاب القیاس" کتاب الاجتہاد خبر الواحد، ابن الراوندی کے انکارِ تواتر کے رد میں بھی ایک مستقل تصنیف ہے، انھوں نے خود اپنی کتاب (العمد) میں ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو وہ ۳۲۷ھ تک یعنی وفات سے چار سال پہلے تصنیف کر چکے تھے، یہ گنتی میں ۶۸ کتابیں ہیں، جن میں سے متعدد دس دس بارہ بارہ جلدوں میں ہیں، زندگی کے آخری چار سال کے اندر بھی انھوں نے بکثرت تصنیفات کیں "مقالات الاسلامیین" (جو ان کی مشہور کتاب ہے) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مکمل ہی نہ تھے، بلکہ علم عقائد کے ایک بلند پایہ اور محتاط مورخ بھی تھے، انھوں نے اس کتاب میں معتزلہ اور دوسرے فرقوں کے جو اقوال و مذاہب نقل کئے ہیں، ان میں بڑی احتیاط و دیانت سے کام لیا ہے، اور

خود ان فرقوں کی کتابوں سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

عبادت و تقویٰ

امام ابو الحسن محض علمی و عقلی آدمی نہ تھے، بلکہ علم و عقل میں درجہ امامت و اجتہاد کو پہنچنے کے ساتھ عبادت و تقویٰ اور اخلاق فاضلہ سے بھی آراستہ تھے، اور یہ ائمہ سلف کی عام خصوصیت ہے، احمد بن علی فقیہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو الحسن کی بیس سال خدمت کی، میں نے ان سے زیادہ متورع، محتاط، باحیا دنیاوی معاملات میں شرمیلا اور امور آخرت میں مستعد نہیں دیکھا، تکلم ابو الحسین ہر وی بیان کرتے ہیں کہ امام ابو الحسن نے برسوں عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے، ان کے خادم بندار بن الحسین کا بیان ہے کہ امام ابو الحسن صرف ایک جائیداد پر گزر کرتے تھے، جو ان کے دادا بلال ابن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعری نے وقف کی تھی، اور جس کی آمدنی سترہ درہم روزانہ تھی۔

وفات

۳۲۲ھ میں امام ابو الحسن اشعری نے انتقال کیا، اور بغداد محلہ مشرع الزوایا میں مدفون ہوئے، ان کے جنازہ پر اعلان کیا گیا کہ آج ناصر سنت کا انتقال ہو گیا۔

امام ابو منصور ماتریدی

اسی زمانہ میں دنیا میں اسلام کے ایک دوسرے سرے ماوراء النہر میں ایک دوسرے عالم اور

۱۔ مشہور متشرق WENSINK نے اپنی کتاب اسلامی عقیدہ MUSLIM CREED میں ص ۶۹ پر اور نیز نے مقالات اسلامیہ کے

مقدمہ میں اس کا بڑا اعتراف کیا ہے (الاشعری ابو الحسن) ۲۔ تمہین کذب المفتری ص ۱۴۱ ۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً ص ۱۴۲ و ابن خلکان ص ۴۶۵، بحوالہ خطیب، ۵۔ ابن خلکان ص ۴۶۵۔

مشکلم ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۲ھ) نے علم کلام اور عقائد اسلام کی طرف توجہ کی، وہ بڑے متوازن و بالغ کے آدمی تھے، معتزلہ سے ہر وقت برسرِ مقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابو الحسن کے علم کلام میں بعض انتہا پسندانہ باتیں آگئی تھیں، اور بعد کے اشاعرہ نے معاملہ کو اور آگے بڑھا دیا، امام ابو منصور نے حشوز و اذواء ایسے التزامات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جو بن گئے تھے، اور ان کا ثابت کرنا، اور نبایہا مشکل تھا، خارج کر دیا، اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح و تہذیب کی، اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنا دیا، امام ابو منصور اور ان کے تابعین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا، ایسے مسائل جن میں ماتریدی نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے، ان میں چالیس سے زائد نہیں، اور ان میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے، جس طرح شافعی علما و متکلمین حنفیہ و اصولاً اشعری ہیں، اسی طرح حنفی علما و متکلمین بالعموم ماتریدی ہیں، امام ابو منصور بہت بڑے مصنف بھی تھے، معتزلہ و رافضی اور قرامطہ کی تردید میں ان کی بڑی فاضلانہ تصنیفات ہیں، ان کی کتاب "تاویلات القرآن" اپنے موضوع پر ایک جلیل القدر تصنیف ہے جس سے ان کی خیر معمولی قابلیت علوم عقلیہ سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی ذکاوت کا اظہار ہوتا ہے۔

امام ابو الحسن اشعری نے چونکہ معتزلہ اور اعتزال کا براہ راست مقابلہ کیا تھا، اور وہ عالم اسلام کے علمی مرکز (عراق) میں تھے، جہاں معتزلہ کا بڑا زور تھا، اس لئے انھوں نے علمی حلقہ کو زیادہ متاثر کیا، اور علم کلام

لے یہ زمانہ اعتزال کے خلاف رد عمل اور نئی علم کلام و عقائد کی تدوین کا خاص دور تھا، امام ابو الحسن اشعری کے علاوہ تقریباً اسی زمانہ میں مصر میں طحاوی (م ۳۳۳ھ) اور سمرقند میں امام ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۳ھ) پیدا ہوئے، اول الذکر نے اپنے دونوں نامور محاصرین کے مقابلہ میں علم کلام میں شہرت حاصل نہیں کی، اور امام ابو منصور ماتریدی کا مدرسہ فکر بھی اشعری مدرسہ میں ضم ہو کر رہ گیا۔ امام عقائد ضد کے تعلقات میں شیخ محمد عبد نے ثابت کیا ہے کہ یہ مختلف فیہ مسائل تیس سے

کی تاریخ میں ان کا نام اور کام زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہے۔

اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر

امام اشعری کے بعد ان کے سلسلہ اور مکتب خیال میں بڑے جلیل القدر علمائے متکلمین اور سائنس دان پیدا ہوئے جنہوں نے تمام عالم اسلام پر اپنا ذہنی تفوق اور اپنی قابلیت کا سکہ قائم کر دیا، اور ان کی وجہ سے دنیا بھر اسلام کی علمی و ذہنی قیادت و منزلہ کے ہاتھ سے نکل کر علماء اہل سنت کے ہاتھ میں آگئی، پندرہویں صدی میں قاضی ابوبکر باقلانی (م ۳۸۵ھ) اور شیخ ابواسحق اسفرائینی (م ۴۱۸ھ) بڑے نامور متکلم اور با عظمت عالم تھے، پانچویں صدی میں علامہ ابواسحق شیرازی متوفی ۵۰۵ھ اور امام اکرمین ابوالمعالی عبدالملک الجونی (م ۶۸۸ھ) نے اپنے علم و فضل سے دنیا پر بادشاہت کی۔

علامہ ابواسحق شیرازی مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس تھے، خلیفہ مقتدی بانشہ نے ان کو ملک شاہ سلجوقی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہ بغداد سے نیشاپور اس شان سے پہنچے کہ جس شہر سے گذرتے شہر کا شہر ان کے استقبال کے لئے ہنگام آتا جو شہر عقیدت میں یہ لوگ ان کے پاؤں کے نیچے کی مٹی اٹھا لیتے، دوکاندار اپنا سامان تجارت ان پر نشان کرتے، مٹھائیوں، پھلوں، قیمتی کپڑوں کی بارش کرتے، نیشاپور پہنچے تو پورا شہر استقبال کے لئے امنڈ آیا، امام اکرمین ان کا فاضیہ اپنے کاندھوں پر رکھ کر خادم کی طرح ان کے سامنے چلتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے۔

ابو اسلان سلجوقی کی سلطنت اور نظام الملک کی وزارت میں سب سے بڑی اسلامی مملکت میں امام اکرمین کو سب سے بڑا دینی اعزاز حاصل تھا، وہ نیشاپور کے خطیب سلطنت کے اسلامی اوقاف کے ناظم و نگراں اور مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس تھے، ابن خلکان لکھتے ہیں :-

وَبَقِيَ عَلَى ذَلِكَ قَرِيبًا مِائَتَيْنِ سَنَةً
تیس سال تک وہ اس طرح رہے کہ علمی و دینی
غیر مزاحم و لامدافح مسلمہ المحارب
میدان میں ان کا کوئی ہمسرا اور حریف نہ تھا
وَالْمَنْبَرُ وَالْخُطَابَةُ وَالتَّدْرِيسُ وَمَجْلِسُ
وَمَنْبَرِکِی وہ زینت تھے، خطاب تدریس اور وعظ
التذکیر یوم الجمعة۔
وتذکیر انھیں کا منصب سمجھا جاتا تھا۔

ان کے اثر و رسوخ اور علوم مرتبت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ملک شاہ سلجوقی نے عید کے چاند کا اعلان
کرا دیا، امام احرارین کے نزدیک رویت ثابت نہیں تھی، انھوں نے منادی کروادی کہ ابوالمعالی (امام احرارین
کی کیفیت) کہتا ہے کہ کل تک ماہ رمضان ہے، جو میرے فتویٰ پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ کل بھی
روزہ رکھے، ملک شاہ نے باز پرس کی، تو فرمایا کہ جو امور فرمان سلطانی پر موقوف ہیں ان کی اطاعت ہم پر فرض
ہے، اور جو حکم فتویٰ سے متعلق ہے، وہ بادشاہ کو مجھ سے پوچھنا چاہئے، کیونکہ حکم شریعت علماء کا فتویٰ حکم حق ہے
کے برابر ہے، روزہ رکھنا عید کرنا یہ امور فتویٰ پر موقوف ہیں، بادشاہ وقت کو ان سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ
بادشاہ نے اعلان کرا دیا کہ میرا حکم درحقیقت غلط تھا، اور امام احرارین کا حکم صحیح ہے۔

ان کا انتقال ہوا تو نیشاپور کے بازار بند ہو گئے، جامع مسجد کا منبر توڑ دیا گیا، ان کے شاگرد
جو چار سو کے قریب تھے، سب نے دوات قلم توڑ ڈالے، لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کرتے تھے،
سال بھران کا غم تازہ رہا۔

نظام الملک طوسی (کے عہد وزارت سے) جو عقیدۂ اشعری تھا، اور اپنے وقت کی سب سے
بڑی اسلامی (سلجوقی) سلطنت کا نفس ناطقہ تھا، اشعریت کو بڑا فروغ ہوا، اور اس کو ایک طرح
کی سرکاری حمایت اور تائید حاصل ہو گئی، بغداد اور نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کے قیام نے جو اشعری

علماء و اساتذہ کے زیر اہتمام تھے، اشعریت کو علمی وسعت واستحکام بخشا، مدرسہ نظامیہ بغدادی
عالم اسلام کا سب سے بڑا دارالعلوم تھا جس کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اس میں پڑھانا
اور پڑھنا علماء و طلبہ کے لئے ایک فخر کی بات تھی، اس کے اثر سے طلبہ اور عوام کا اشعری عقائد و فکر سے
متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔



علم کلام کا انحطاط فلسفہ اور باطنیت کا فروغ

اور
ایک نئے متکلم کی ضرورت

علم کلام کا انحراف و انحطاط

اس وقت اگرچہ اشعری مکتب خیال کے علماء تمام عالم اسلام، نظام تعلیم اور مذہبی زندگی پر حاوی ہو گئے تھے، لیکن خود ان کے کلام اور ان کے اقتدار کو اندر سے گھن لگ گیا تھا، امام ابو الحسن اشعری کی طاقتور شخصیت و عقلیت اور مجتہدانہ دماغ نے مغز کے سحر کو باطل کر دیا تھا، اور سنت و شریعت کا اقتدار از سر نو قائم کر دیا تھا، اس میں ان کے اصول و قواعد کو تہا دخل نہ تھا، ان کی بلند ذہنی صلاحیتوں اور علمی ملک استدلال و اجتہاد کو بھی دخل تھا، یہ وقار ایسی ہی طاقت و شخصیتوں اور اجتہادی قابلیتوں سے قائم رہ سکتا تھا، لیکن ان کے پیرو رفتہ رفتہ لکیر کے فقیر بن گئے، اور علم کلام میں بھی بجائے تجدید و اجتہاد کے نقل و نقل کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن لوگوں نے زمانہ کی تبدیلی کا احساس کیا، اور جدت سے کام لیا، انھوں نے فلسفہ کی اصطلاحات اور فلسفیانہ طرز استدلال کو علم کلام میں داخل کر لیا، جو نہ قرآن مجید کے طریق استدلال کی طرح فطری، عام فہم اور دلکش تھا، نہ ان کے دعاوی کے ثبوت کے لئے قطعی دلائل فراہم کرتا تھا، اس میں خود قیل و قال کی بڑی گنجائش تھی، اور ہر وقت اس کا خطرہ تھا کہ اس کے مقدمات کو کمزور اور مشکوک ثابت کر دیا جائے، اس طرح نہ انھوں نے اہل سنت اور مسلک سلف کی صحیح نمایندگی کی، نہ خالص فلسفہ کے

لہ جیسا کہ ابن تیمیہ نے اپنی بعض تصنیفات خصوصاً الذی علی المنطقیین میں کیا۔

حلقوں میں احترام و عظمت حاصل کی۔

فلسفہ کا رواج

دوسری طرف مامون کی قدر دانی اور دلچسپی اور ترجمین کی محنت اور توجہ سے سریانی، یونانی اور فارسی سے یونانی فلسفہ کی بکثرت کتابیں خصوصاً ارسطو کی تصنیفات عربی میں منتقل ہو گئی تھیں اور وہ تیز طبیعت اور خام عقلیت مسلمانوں پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں، اس ذخیرہ میں کچھ تو منطق، طبیعیات، عنصریات، ریاضیات کی کتابیں اور علوم تھے، جن کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہ تھا، اور کچھ الہیات اور مابعد الطبیعیات کے مباحث اور دفر تھے، الہیات کا یہ ذخیرہ درحقیقت یونانیوں کا علم الاصفام (دیوالا) تھا، جس کو انھوں نے بڑی چالاکی سے فلسفیانہ زبان اور علمی اصطلاحات میں منتقل کر دیا تھا، یہ مفروضات اور تخیلات کا ایک طلسم تھا، جس کا نہ کوئی ثبوت تھا نہ کسی عالم میں ان کا وجود، اس میں کہیں عقول و افلاک کا شجرہ نسب، کہیں ان فرضی اور خیالی چیزوں کے افعال و حرکات کا زائچہ کھینچا گیا ہے، ایک ایسی امت کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی دولت سے سرفراز فرمایا تھا، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی ذات و صفات کے صحیح معرفت اور نوع انسان اور کائنات کی ابتدا و انتہا اور آغاز و انجام کا یقینی علم بخشا تھا، اس یونانی افسانہ اور طلسم ہو شربار کی طرف التفات کرنے اور اس کی تفصیلات و جزئیات پر وقت ضائع کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی، مگر جو لوگ یونانیوں کے منطق و طبیعیات اور ریاضیات سے مرعوب تھے، انھوں نے الہیات کے اس دفتر پارینہ کو بھی صحیفہ آسمانی کی طرح قبول کر لیا، اور اس کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ گویا ان کے پاس پتھر اور آسمانی کتاب کے ذریعہ کوئی علم نہیں پہنچا تھا، اور وہ جاہل قوموں کی طرح الہیات و دنیات میں بھی اسی طرح بے بصارت اور تہی دامن تھے، جیسے ریاضیات و طبیعیات میں۔

فلسفہ یونان کے عرب ناقل و شارح

دوسری طرف فلسفہ یونان کو یعقوب کندی (م ۲۵۵ھ) ابو النصر فارابی (م ۳۳۵ھ) اور شیخ بوعلی ابن سینا (م ۴۲۸ھ) کے سے پرورش وکیل حاصل ہوئے کہ خود یونان میں بھی ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، انھوں نے ارسطو کو عصمت و تقدیس اور علم و حکمت کے ایسے مقام پر پہنچا دیا جو یونانی الہیات میں شاید مبدراول (واجب الوجود) کو بھی حاصل نہیں، یہ بھی ایک بدقسمتی تھی کہ مسلمانوں کے حصہ میں یونان کے علمی ذخیرہ میں سے زیادہ تر ارسطو کی تصنیفات و افکار آئے، جو پیغمبروں کی تعلیمات، اور دین کی روح و مزاج سے زیادہ اختلاف اور کم از کم مناسبت رکھتے ہیں، پھر دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ فلاسفہ عرب میں سے کوئی بھی ان کے اصل مآخذوں اور ان کی اصل زبانوں سے واقف نہیں تھا، ان کا تمام تر انحصار تراجم پر تھا، اور ان سے خود ان فلاسفہ کا منشاء سمجھنے میں غلطیاں ہوئیں، پھر ان پر ارسطو کا ایسا علمی رعب اور اس کی شخصیت کا ایسا سحر غالب تھا کہ انھوں نے اس کے افکار و آراء پر نقد و جرح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور مقولات کو بھی منقولات بنا دیا۔

جماعت اخوان الصفا اور اس کے رسائل

چوتھی صدی کے آخر میں تمام عالم اسلام پر فلسفہ یونان کا اثر پڑ رہا تھا، ہر ذہن و متحسب فوجوان اس کو شوق و عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، چوتھی صدی کے وسط ہی میں اخوان الصفا کے نام سے فری سین کے طرز کی ایک خفیہ انجمن بنی، انجمن کا مقصد علم و فلسفہ یونان کو معیار قرار دے کر دینی مباحث اور عقائد پر گفتگو ہوتی تھی، اور مسائل کو طے کیا جاتا تھا، اس انجمن کا منشور ان کے الفاظ میں یہ تھا۔

بالجہالات واختلطت بالضلالات
ولا سبيل الى غسلها وتطهيرها الا بالفلسفة
لانها حادية للحكمة الاعتقادية والمصلحة
الاجتهادية وانه متى انتظمت الفلسفة
اليونانية والشريعة المحمدية فقتد
حاصل الکمال^۱۔
گندی ہو گئی ہے اس کو صرف فلسفہ کے ذریعہ
دھویا اور پاک کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ فلسفہ
اعتقادی علوم و حکمت اور اجتہادی مصلحتوں
پر حاوی ہے اب صرف فلسفہ یونان اور شریعت
محمدی کے امتزاج سے کمال مطلوب حاصل
ہو سکتا ہے۔

ان کی اپنے رفقا کو خاص ہدایت تھی کہ وہ پختہ کار اور سن رسیدہ لوگوں پر وقت ضائع کرنے کے
بجائے نوجوانوں اور کم عمریوں کی طرف توجہ کریں اور ان کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کریں،
اس لئے کہ عمر رسیدہ لوگوں میں نیکی اور جہود ہوتا ہے، جو نئی چیز کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے، نوجوان نئی چیز
کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

انھوں نے اس بحث و نظر کے نتیجہ میں ۵۲ رسالے مرتب کئے، جو ان کے فلسفہ کی نابیندگی کرتے ہیں اور
رسائل اخوان الصفا کے نام سے تاریخ و ادب میں مشہور ہیں اور طبیعیات، ریاضیات، عقلیات کے مباحث پر
مشتمل ہیں، معتزلہ اور ان کے ہم مذاق لوگوں نے ان رسائل کو ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ اپنی مجلسوں میں ان کو پڑھتے
تھے اور جہاں جاتے تھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر وہ اندلس پہنچ گئے۔

معتزلہ و فلاسفہ کا فرق

معتزلہ سے اگرچہ دانستہ یا نادانستہ شریعت کو نقصان پہنچا تھا، اور انھوں نے عقل کی طاقت کو
غیر محدود سمجھ کر ذات و صفات کے نازک و مادی عقل (نکر مخالف عقل) مسائل کو باریک اطفال بنا دیا

تھا، لیکن وہ اصلاً مذہبی ذہن کے لوگ تھے، وحی نبوت پر ایمان رکھتے تھے، اور عموماً متقشف، معاصی سے مجتنب و محتاط تھے، عبادت اور دینی دعوت کا ذوق رکھتے تھے، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سختی کے ساتھ پابند تھے، اور یہ سب ان کے اصول و عقائد کا اقتضا تھا، اس لئے اعتراض کے فروغ اور معتزلہ کے اقتدار سے عالم اسلام میں کفر و افساد و انکار نبوت، انکار معاد اور بے علی اور تعطل کا رجحان پیدا نہیں ہو سکا، اور مسلمانوں کا مذہبی شعور مجروح یا کمزور نہیں ہونے پایا۔

لیکن فلاسفہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، فلسفہ نبوت کے بالکل متوازی چلتا ہے، اور کہیں جا کر نہیں ملتا، وہ دین کے اصول و کلیات اور اس کے بنیادی عقائد و مسائل سے متصادم ہے، اس لئے جس قدر فلسفہ کی مقبولیت اور عظمت بڑھتی گئی، قدرتی طور پر دین کی وقعت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت کم ہوتی گئی، اور عقائد سے کراخلاق و اعمال تک اس ذہنی تبدیلی سے متاثر ہوئے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا، جو دین کی علانیہ تحقیر کرتا، اور اسلام سے فخر یہ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتا، جو لوگ اتنی اخلاقی جرات نہیں رکھتے تھے، وہ ظاہری طور پر رسم و رواج کے پابند تھے، لیکن اندر سے وہ کسی معنی میں مسلمان نہیں تھے۔

باطنیت کا فتنہ

فلسفہ کے ساتھ ساتھ اور اس کے اثر سے ایک نیا فتنہ پیدا ہوا، جو اسلام کے حق میں اور نبوت کی تعلیمات کے لئے فلسفہ سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ باطنیت کا فتنہ ہے، اس کے بانی اور داعی اکثر ان قوموں کے افراد تھے، جو اسلام کے مقابلہ میں اپنی سلطنتیں اور اقتدار کھوپکے تھے، اور ظاہری مقابلہ اور جنگ سے ان کی بازیافت کی، کوئی امید نہ تھی، یا شہوت پرست اور لذت پسند لوگ تھے، اور اسلام ان کی زندگی پر

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ضخی الاسلام ج ۳، فصل اول ۱۵۔ ان کے نزدیک کبیرو کے ارتکاب سے آدمی مخلد فی النار

ہوتا ہے، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض ہے۔

حدود و قیود عائد کرتا تھا، یا شخصی اقتدار اور سرداری کے حریص تھے، ان تمام مختلف مقاصد کے لوگ باطنیت کے نشان کے نیچے جمع ہو گئے، انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام کو جنگی طاقت سے شکست نہیں دے سکتے، یہ مسلمانوں کو کفر و احماد کی کھلی ہوئی دعوت دے سکتے ہیں، اس لئے کہ اس سے ان کے مذہبی احساسات بیدار ہو جائیں گے اور مقابلہ کی قوت ابھر آئے گی، انھوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

ظاہر و باطن کا مغالطہ

انھوں نے دیکھا کہ شریعت کے اصول و عقائد اور احکام و مسائل کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور انسانوں کے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ایسا ضروری تھا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ
اور ہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا مگر اپنی قوم ہی
لِسَانِهِمْ۔ (سورہ ابراہیم ۴) کی زبان میں تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کر دے۔

ان الفاظ کے معنی مفہوم متعین ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ان کی تشریح اور اپنے عمل سے ان کی تعبیر کر دی ہے، یہ معنی و مفہوم امت میں عملی و لفظی طور پر تواتر و تسلسل سے چلے آ رہے ہیں، اور ساری امت ان کو جانتی اور مانتی ہے، نبوت و رسالت، ملائکہ، معاد، جنت، دوزخ، شریعت، فرض و واجب، حلال و حرام، صلاۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، یہ سب وہ الفاظ ہیں جو خاص دینی خالق کو بیان کرتے ہیں، اور جس طرح یہ دینی خالق محفوظ چلے آ رہے ہیں، اسی طرح ان دینی خالق کو ادا کرنے والے یہ الفاظ بھی محفوظ چلے آ رہے ہیں، اور اب دونوں لازم ملزوم بن گئے ہیں۔

جب نبوت و رسالت، یا نبی یا صلوٰۃ یا زکوٰۃ کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے اس کی وہی حقیقت سمجھ میں آئے گی، اور وہی عملی شکل سامنے آئے گی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور صحابہ کرامؓ نے اس کو سمجھا، اس پر عمل کیا، اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، اور اسی طرح نسل بعد نسل وہ چیز امت تک

منقول ہوتی رہی انھوں نے اپنی ذہانت سے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ و معانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و علمی نظام کی بنیاد ہے، اور اسی سے اس کی وحدت اور اپنے سرشتہ اور اپنے ماضی سے اس کا ربط قائم ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں یا مشکوک ہو جائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے، اور اس کے سنگین قلعہ میں سیکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شکاف پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس نکتہ کو پا جانے کے بعد انھوں نے اپنا سارا زور اس تبلیغ پر صرف کیا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہونے ہیں اور ایک حقیقی اور باطنی، اسی طرح قرآن و حدیث کے کچھ ظاہر ہیں اور کچھ خائف، ان خائف سے ان ظواہر کو وہی نسبت ہے جو گودے اور مغز سے پھلکے اور پوست کو ہے، پہلا صرف ان ظواہر کو جانتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں پوست ہی پوست ہے، عقلاً خائف کے عالم ہیں اور ان کے حصہ میں مغز آیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ دراصل خائف کے رموز و اشارات ہیں ان سے وہ مراد نہیں جو عوام سمجھتے اور عمل کرتے ہیں ان سے مراد کچھ اور چیزیں ہیں جن کا علم صرف اہل اسرار کو ہے اور انھیں سے دوسروں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان خائف تک نہیں پہنچا، اور ظواہر میں گرفتار ہے، وہ ظاہری بیڑیوں اور شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے اور نہایت نیچی سطح پر ہے، جو خائف و رموز کی بلند سطح تک پہنچ جاتا ہے اس کی گردن کے طوق و سلاسل اترا جاتے ہیں اور وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، یہی اس آیت کا مفہوم ہے۔

وَيَمْنَعُ عَنْهُمْ إِغْوَاهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي

(یعنی) اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دے ہو

لے تعیل شریعت کا مستقل عقیدہ بھی پایا جاتا تھا، ایک باطنی امام و داعی میدان اور پس لکھتے ہیں۔

نَعَتْ اَللّٰهُ مُحَمَّدٌ بِنِ اَمْتِ مُحَمَّدٍ نَاطِقٌ سَمِعَ شَرِيعَةَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم (محمد بن اسمعیل کو الشریعۃ نے بنی ناطق کی حیثیت سے معوث فرمایا، اور انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو نسخ کر دیا، (عاصمۃ نفوس المہندین و عاصمۃ ظہور المعتدین لیسیدنا ادریس) معز لدین الشرفاطی سے بھی ایسے ہی اقوال منقول ہیں۔

كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اعراف ۱۵۴) ہیں، ان چندوں کے نکالے گا جن میں گرفتار تھے۔

جب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا، اور حقائق و ظواہر کے اس فلسفہ کو قبول کر لیا گیا تو انھوں نے نبی و وحی نبوت، ملائکہ، آخرت اور اصطلاحات شرعیہ کی من مانی تشریح کرنی شروع کر دی جس کے بعض نادروں نے یہ ہیں:

”نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ صافیہ کا فیضان ہو، جس پر کسی ہستی کا نام نہیں، صرف فیضان

کا نام ہے، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف واپس آنا ہے، جنابت سے مراد افشاءئے راز ہے

خس سے مراد تجدید عہد، زنا سے مراد علم باطن کے نقطہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد میں شریک

نہ ہو، طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے علاوہ ہر مذہب کے برأت، تیمم سے مراد مذہب (اجازت یافتہ)

سے علم کا حصول، صلوٰۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوٰۃ سے مراد اہل استعداد و صفائیں

اشاعت علم، صیام (روزہ) سے مراد افشاءئے راز سے پرہیز و احتیاط، حج سے مراد اس علم کی طلب جو

عقل کا قبلہ اور منزل مقصود ہے، جنت، علم باطن، بہنم علم ظاہر، کعبہ خود نبی کی ذات ہے، باب کعبہ سے

مراد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات قرآن مجید میں طوفانِ نوح سے مراد علم کا طوفان ہے، جن میں

اہل شہادت عرف کر دیئے گئے، آتش خرد سے مراد خرد کا غصہ ہے، نہ کہ حقیقی آگ، ذبح سے مراد جس کا

ابراہیم کو حکم دیا گیا تھا، بیٹے سے عہد لینا، یا جوج ماجوج سے مراد اہل ظاہر ہیں، عصائے موسیٰ سے مراد

ان کی دلیل اور محبت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

نبوت محمدی کے خلاف بغاوت

الفاظ شرعی کے متواتر و متوارث معنی و مفہوم کا انکار اور قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن اور

مغزوہ پوست کی تقسیم، ایسا کامیاب حربہ تھا جس سے اسلام کے نظام، اعتقاد و نظام فکر کے خلاف سازش

کرنے والوں نے ہر زمانہ میں کام لیا، اسلام کی پوری عمارت کو اس طرح آسانی سے ڈالنا میٹ کیا جاسکتا تھا اور اسلام کے ظاہری قول کے اندر ریاست اندرون ریاست قائم کی جاسکتی تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں جن فرقوں نے اور منافقین کی جس جماعت نے نبوت محمدی کے خلاف بغاوت کرنی چاہی، اس نے باطنیت کے اسی حربے سے کام لیا، اور اس معنوی تواتر و توارث کا انکار کر کے پورے نظام اسلامی کو مشکوک و مجروح بنا دیا، اور اپنے لئے دینی سیادت بلکہ نئی نبوت کا دروازہ کھول لیا، ایران کی بہائیت اور ہندوستان کی قادیانیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

لے قادیانیوں نے بھی باطنیوں کی طرح الفاظ کو قائم رکھتے ہوئے ان کا نیا مفہوم بیان کیا ہے اور معنوی توارث و تواتر کا عمل انکار کیا ہے، ختم نبوت، مسیح و نزول مسیح، ہجرات، دجال وغیرہ سب الفاظ وہی ہیں مگر ان کی تشریح و تطبیق میں باطنیوں کی طرح اختراع و ایجاد سے کام لیا ہے، مرزا صاحب کی کتابیں اور مولوی محمد علی کی تفسیر اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں۔

بہائیوں نے بالکل نئی شریعت وضع کی ہے جس کے بعض دفعت یہ ہیں روزہ سال میں ایک ہی ہمدینہ کا ہے، مگر مہینہ ۱۹ دن کا ہے، روزہ کی ابتداء صبح صادق کے بجائے طلوع آفتاب سے ہے اس سال سے ۴۷ سال تک انسان احکام شرعی کا مکلف رہتا ہے، پھر پابندیاں اٹھ جاتی ہیں، وضو فرض نہیں ہے مستحب ہے عورتوں پر نظر جائز ہے کوئی پردہ نہیں جس گھر میں بانی مذہب (باب) کی ولادت ہوئی ہے، اس کی زیارت واجب ہے، جماعت کی نماز صرف جنازہ میں مشروع ہے ایمان کے بعد کوئی چیز نجس نہیں بلکہ محض مذہب بانی کی پیروی سے آدمی ظاہر ہو جاتا ہے، پھر کبھی گندہ نہیں ہوتا، بلکہ جس چیز کو اس کا ہاتھ لگ جاتا ہے وہ بھی ظاہر ہو جاتی ہے، پانی ہمیشہ ظاہر و مظهر رہتا ہے، بہائیوں کا قانون میراث علیحدہ ہے (حاضر ابعالم الاسلامی بحوالہ فرینچ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) موسیو ہوارٹ نے اپنے مقالہ ”بابیت“ میں صحیح لکھا ہے کہ باب نے اسلام میں اصلاح کے نام سے ایک نئے دین کی تشکیل کی ہے جس کے عقائد و اصول علیحدہ ہیں اور اس کو نئی سوسائٹی اور مہلت اجتماعیہ کے منشور کے طور پر پیش کیا ہے، یہی صورت حال قادیانیت کی ہے، دونوں جگہ ایک نئی نبوت اور ایک نئے نظام دینی کی تاسیس ہے، درحقیقت یہ سب باطنیت کی صدائے بازگشت ہے۔

ظاہر ہے کہ ان "مکتہ آفرینیوں" کو (جن کی چند مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں) کوئی "سلیم الطبع آدمی قبول نہیں کر سکتا تھا، لیکن علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام میں ایسا ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا، اور فلسفہ کے اثر سے لوگوں میں پیچیدہ اور غامض مضامین کا (خواہ اس کے اندر کوئی مغز نہ ہو) ایسا مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ ایک طبقہ پر باطنیوں کا جادو چل گیا، جنہوں نے قدیم علم ہدیت، علم طبیعیات اور یونانی الہیات کے مسائل اور یونانی اصطلاحات عقل اول وغیرہ کو آزادی سے استعمال کیا تھا، اور مختلف اثرات اور مختلف اغراض سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے، کچھ جذبہ انتقام میں کچھ اسرار و رموز کے شوق میں کچھ غلط قسم کی ظاہریت اور تقشف کے رد عمل میں کچھ بوالہوسی اور نفس پرستی کی آزادی کے لالچ میں کچھ اہل بیت کے نام سے اس طرح باطنیوں نے ایسی خفیہ تنظیم قائم کر لی جس سے طاقتور اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشان رہیں، عالم اسلام کی بعض لائق ترین اور مفید ترین ہستیاں (نظام الملک طوسی و فخر الملک وغیرہ) ان کا شکار ہوئیں، عرصہ تک کسی بڑے عالم اور مسلمان بادشاہ یا وزیر کو اس کا اطمینان نہیں تھا کہ صبح وہ صحیح سلامت اٹھے گا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اصفہان میں اگر کوئی شخص عصر تک اپنے گھر واپس نہ جاتا تو سمجھ لیا جاتا کہ وہ کسی باطنی کا شکار ہو گیا، اس بد امنی کے علاوہ انہوں نے ذہن و ادب اور علم کو بھی متاثر کرنا شروع کیا، اور دین کے اصول و نصوص اور قطعیات کی تاویل و تحریف اور عام احکام کا دروازہ کھل گیا۔

ایک نئی شخصیت کی ضرورت

فلسفہ اور باطنیت کے ان اسلام کش اثرات کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس کو علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں پوری بصیرت اور دستگاہ حاصل ہو، اور وہ تمام علوم میں مجتہدانہ نظر اور اپنا خود مقام رکھتا ہو، جو اپنے ذہن خدا داد، وجود طبع اور وقت نظریں فلاسفہ یونان اور بہت سے

۱۔ باطنیوں کے ہاتھ سے شہید ہونے والوں کی مفصل فہرست کے لئے ملاحظہ ہو "نظام الملک طوسی" ص ۵۶۰، ۵۶۱

قدیم ائمہ فکر سے کم نہ ہو، جو بہت سے علوم کو نئے طریقہ سے مدون کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو فوری علم اور وسعتِ نظر کے ساتھ دولتِ یقین سے بھی مالا مال ہو، اور اس نے اپنے ذاتی فکر، تلاش و تحقیق اور ریاضت و عبادت سے دین کے ان ابدی حقائق پر نیا ایمان حاصل کیا ہو، اور وہ نئے اعتماد، تازہ یقین کے ساتھ علی و جبر البصیرۃ دین کی پیروی اور رسولؐ کے اقتداء کی طرف دعوت دیتا ہو، نیز عالمِ اسلامی اور علمی دنیا میں اپنے علم و یقین اور فکر و نظر سے ایک نئی روح اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دے، پانچویں صدی کے عین وسط میں اسلام کو ایسی شخصیت عطا ہوئی، جس کی عالمِ اسلام کو سخت ضرورت تھی، یہ شخصیت امام غزالی کی تھی۔



امام غزالیؒ

تعلیم اور علمی عروج

امام غزالیؒ کا نام محمد کنیت ابو حامد والد کا نام بھی محمد تھا، طوس کے ضلع میں ۴۵۰ھ میں طہران میں پیدا ہوئے، والد کی وصیت کے مطابق جو ایک مخلص علم دوست اور غریب مسلمان تھے، اُن کے ایک صوفی دوست نے تعلیم کا انتظام کرنے سے معذرت کی، اور کسی مدرسہ میں داخل ہو جانے کا مشورہ دیا، چنانچہ وہ ایک مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔

امام غزالیؒ نے اپنے وطن میں شیخ احمد الراذکانی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی پھر حیرجان میں امام ابو نصر اسماعیلی سے پڑھا، اس کے بعد نیشاپور جا کر امام احرارین کے حلقہٴ درس میں شامل ہوئے، اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے رفقاء میں جو ۴۰ کی تعداد میں تھے، ممتاز ہو گئے، اور اپنے نامور استاد کے نائب (معیذ) بن گئے، امام احرارین ان کی تعریف میں فرماتے تھے کہ غزالیؒ بحر خزائے امام احرارین کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نکلے، اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال کی تھی، لیکن بڑے بڑے کبار السن علماء سے وہ زیادہ ممتاز اور باکمال سمجھے جاتے تھے۔

درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالیؒ نظام الملک کے دربار میں پہنچے نظام الملک نے ان کی شہرت اور ممتاز قابلیت کی بنا پر بڑے اعزاز و اکرام سے دربار میں ان کو لیا، یہاں اہل کمال کا مجمع تھا، علمی مباحثے اور دینی مناظرے درباروں اور مجلسوں میں ان تک کہ تقریبات شادی وغنی کا ایک ضروری عنصر تھے۔

امام غزالیؒ ان مباحث میں سب پر غالب رہتے تھے، ان کی نمایاں قابلیت دیکھ کر نظام الملک نے ان کو مدرسہ نظامیہ کی صدارت کے لئے انتخاب کیا جو اس وقت ایک عالم کے لئے سب سے بڑا اعزاز اور فہماکی ترقی تھا، اس وقت ان کی عمر ۳۷ سال سے زیادہ نہ تھی، ۴۸۴ھ میں وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ میں درس شروع کیا، تھوڑے ہی دن میں ان کے درس حسن تقریر اور تجربہ علمی کی بناء میں دھوم مچ گئی، طلبہ و علمائے استفادہ کے لئے ہر طرف سے ہجوم کیا، ان کی مجلس درس مرجع خلافت بن گئی تین تین سو انتہی طالب علم اور سو سوا امر اور و سارا اس میں شرکت کرتے تھے، رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی عالی دماغی، علمی فضیلت اور طاقتور شخصیت سے بغداد میں ایسا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا کہ ارکان سلطنت کے ہمسرن گئے، اور بقول ایک معاصر (شیخ عبدالغافر فارسی) کے ان کے جاہ و جلال کے سامنے امر اور وزراء اور خود بارگاہ خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑ گئی، یہاں تک کہ ۴۸۵ھ میں ان کو خلیفہ عباسی (مقتدی باللہ) نے ملک شاہ سلجوقی کی سکیم ترکان خاتون کے پاس (جو اس وقت سلطنت کی مالک تھی) اپنا سفیر بنا کر بھیجا، خلیفہ مستظہر جو مقتدی باللہ کا جانشین تھا، امام سے خاص ربط و ارادت رکھتا تھا، اسی کی فرمائش سے امام غزالیؒ نے باطنیہ کے رد میں کتاب لکھی، اور اس کا نام خلیفہ کی نسبت سے ”مستظہر“ رکھا۔

گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات

اس انتہائی عروج کا جو کسی علمی و دینی شخصیت کو حاصل ہو سکتا ہے، نقاضا تھا کہ امام غزالیؒ اس پر فطرت کریں اور اسی کے دائرہ کے اندر پوری زندگی گزار دیں، جیسا کہ ان کے بعض اساتذہ نے کیا اور لوگ عموماً کیا کرتے ہیں، مگر ان کی بے چین طبیعت اور بلند حوصلہ طائر ہمت اس بلندی پر راضی نہ تھا، اور دراصل اسی بلندی ہی نے ان کو امام اور حجت الاسلام بنا دیا، دنیا میں جاہ و اعزاز کی قربانی اور مقصد کی دھن اور سچی لگن

کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، امام غزالیؒ نے خود ان حالات و اسباب کو بیان کیا ہے جنھوں نے ان کو ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ کیا، اور ان کو تعلیم و تدریس کے کام کا نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ اقلیم علم کے بادشاہی چھوڑ کر یقینی علم اور دولت باطن کی تلاش میں نکل گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر پلٹے ”المنقذ من الضلال“ میں وہ لکھتے ہیں:-

”عفو ان شباب سے میری طبیعت تحقیقات و معلومات کی طرف مائل تھی ہر فرقہ اور جماعت کے لئے، اور اس کے عقائد و خیالات معلوم کرنا رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی، جو عقائد بچپن سے ذہن میں جمے ہوئے تھے، وہ متزلزل ہو گئے، میں نے خیال کیا کہ عیسائی اور یہودی کے بچے بھی اپنے عقائد پر پرورش پاتے ہیں حقیقی علم تو یہ ہے کہ کسی قسم کے شبہ کا احتمال تک نہ رہ جائے مثلاً مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دس کا عدد تین سے زائد ہوتا ہے، اگر کوئی شخص کہے نہیں بلکہ تین زائد ہے اور میرے دعویٰ کی دلیل ہے کہ لامٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے تب بھی مجھے اپنے علم میں کوئی شک نہیں ہوگا، مجھے اس پر تعجب ضرور ہوگا لیکن پھر بھی میرا یقین باقی رہے گا کہ دس تین سے زائد ہے، میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف حیات اور بدیہیات کے دائرہ میں ہے لیکن جب نہ بادہ کدو کاوش سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی شک کی گنجائش ہے، میں نے دیکھا کہ جو اس میں سب سے زیادہ قوی حائر بصارت کا ہے لیکن اس میں غلطی ہوتی ہے، میرا یہ شک یہاں تک بڑھا کہ مجھے محسوسات کے یقینی ہونے کا اطمینان نہیں رہا، پھر میں نے عقلیات پر غور کیا تو وہ مجھے حیات سے بھی زیادہ مشکوک و مرکب نظر آئے، تقریباً دو ہجرت تک میری یہ ارنیابی کیفیت رہی اور مجھ پر فسطائیت کا غلبہ رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفا دی اور طبیعت صحت و اعتدال پر آگئی، اور بدیہیات عقلی پر اطمینان پیدا ہو گیا، لیکن کسی استدلال اور ترتیب کی بنا پر نہ تھا، بلکہ ایک جدائی اور وہی بات تھی، اس مرض سے شفا پانے کے بعد اب میرے سامنے چار گروہ تھے، جو طالب حق معلوم ہوتے تھے، متکلمین جو اہل عقل و نظر ہوتے

کے مدعی تھے باطنیہ جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خاص تعلیمات و اسرار ہیں، اور انھوں نے براہ راست امام معصوم سے علم حقائق حاصل کیا ہے، فلاسفہ جن کا کہنا ہے کہ وہی اہل منطق و اہل استدلال ہیں، صوفیہ جو اپنے کو صاحب کشف و شہود کہتے ہیں، میں نے ہر ایک گروہ کی کتابوں اور خیالات کا مطالعہ کیا تو کسی سے بھی مطمئن نہیں ہوا، علم کلام کے متعلق اس فن کے محققین کی تصنیفات پڑھیں اور خود بھی اس موضوع پر تصنیفات کیں، میں نے دیکھا کہ اگرچہ یہ فن اپنے مقصود کو پورا کرتا ہے، لیکن میری تسلی کے لئے وہ کافی نہیں، کیونکہ اس میں ایسے مقدمات پر بنا رکھی گئی ہے، جو فریق مقابل کے پیش کئے ہوئے ہیں، اور متکلمین نے ان کو محض تقلید تسلیم کر لیا ہے، یا اجماع یا قرآن و حدیث کے نصوص ہیں، اور یہ چیزیں اس شخص کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کارآمد نہیں، جو بدیہیات کے سوا کچھ اور تسلیم نہ کرتا ہو، فلسفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے پہلے میں نے اس کا تحقیقی مطالعہ ضروری سمجھا، اگرچہ مجھے تصنیف و تدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقہ درس میں بغداد میں تین تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لئے وقت نکالا، اور دو سال کے اندر اندر میں نے ان کے تمام علوم کا مطالعہ کر ڈالا پھر تقریباً ایک سال تک ان پر غور و فکر کرتا رہا، میں نے دیکھا کہ ان کے علوم چھ قسم کے ہیں، ریاضیات، منطق، طبیعیات، سیاسیات، اخلاقیات اور انبیات، ابتدائی پانچ علوم کا مذہب سے نفیاً و اثباتاً کچھ تعلق نہیں، اور مذہب کے اثبات کے لئے ان کے انکار کی ضرورت ہے، طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا کہیں کہیں مذہب سے تضاد ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں اصولاً یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ طبعیات اللہ تعالیٰ کے اختیاریں ہیں، وہ خود مختار نہیں، البتہ جو لوگ ان علوم و مضامین میں فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں وہ عمومی طور پر ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کا یہی حال ہوگا، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو، وہ ہر فن میں ماہر ہو، پھر جب ان کی بے دینی اور ان کے انکار کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار و استحقاق کرنے لگتے ہیں،

دوسری طرف اسلام کے بعض نادان دوست فلاسفہ کے ہر نظریہ اور ہر دعویٰ کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ طبیعیات کے سلسلہ میں ان کی تمام تحقیقات کا بھی انکار کرنے لگتے ہیں، اس کا ایک مضرت اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علمی نظریات و تحقیقات کی صداقت کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک وہ چیزیں پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں، ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جاتا ہے، اور بجائے فلسفہ کے انکار کرنے کے وہ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، لے دے کہ جو فن مذہب سے متصادم ہوتا ہے، وہ الہیات ہے، اسی میں انھوں نے زیادہ تر ٹھوکریں کھائی ہیں، و حقیقت انھوں نے منطق میں جو شرطیں رکھی تھیں، ان کو وہ الہیات میں نباہ نہیں سکے، اسی لئے اس یہ سخت اختلاف پایا جاتا ہے، غرض میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ فلسفہ سے میری تشفی نہیں ہوگی، اور عقل تنہا تمام مقاصد کا احاطہ نہیں کر سکتی، اور تمام مشکلات کی نقاب کشائی کر سکتی ہے، رہے باطنیہ تو مجھے اپنی کتاب ”مستطہری“ کی تالیف کے سلسلہ میں ان کے مذہب کے مطالعہ کرنے کا اچھی طرح موقع ملا، میں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا دار و مدار امام وقت کی تعلیم پر ہے، لیکن امام وقت کا وجود اور اس کی صداقت خود محتاج دلیل ہے، اور یہ دونوں حدود پر مشتبہ ہیں، اب صرف تصوف باقی رہ گیا میں بہت تن تصوف کی طرف متوجہ ہوا، تصوف علمی بھی ہے، عملی بھی ہے، میرے لئے علم کا معاملہ آسان تھا، میں نے ابوطالب کی کثرت القلوب اور عارث عباسی کی تصنیفات اور حضرت جنید شہیدی و بایزید بسطامی وغیرہ کے ملفوظات پڑھے، اور ظلم کے راستے سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا، وہ میں نے حاصل کر لیا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اصلی تھائی تک تعلیم کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ ذوق و حال اور حالات کی تبدیلی سے پہنچا جاسکتا ہے، جو علوم میرا سراپہ تھے خواہ وہ شرعی ہوں یا عقلی، ان سے مجھے وجود باری، نبوت اور معاد پر ایمان راسخ حاصل ہو چکا تھا، لیکن یہ بھی کسی دلیل محض سے نہیں، بلکہ ان اسباب و قرائن اور تجربوں کی بنا پر جن کی تفصیل شکل ہے، مجھ پر یہ اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ سعادتِ آخری کی صورت

صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے اور اس کی تدریس یہ کہ دارفانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان و کشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاقہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ و مال سے اعراض اور موانع و علاقے سے فرار کے بغیر ممکن نہیں، میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سر تا پا علاقائی ذبیوی میں غرق ہوں میرا سب سے افضل عمل تدریس و تعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن ٹوٹنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم پر ہے، جو نہ تو اہم ہیں اور نہ آخرت کے سلسلہ میں کچھ فائدہ پہنچانے والے ہیں، میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص توجہ اللہ تھی، بلکہ اس کا باعث و محرک بھی محض طلب جاہ و حصولِ شہرت تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوا ہوں، اگر میں نے اصلاحِ حال کی کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے، میں ایک عرصہ تک اس سب کو چھوڑ دینے اور ابتداء سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن اس کا فیصلہ نہ کر سکا، کچھ ہینے اسی کشش میں گذر گئے کہ کبھی تو دنیاوی خواہشات کشش کریں اور کبھی ایمان کا منادی پکارتا، کہ کوچِ قریب ہے، تھوڑی عمر باقی ہے، طویل سفر پڑیش ہے، اور یہ سب علم و عمل محض ریا و تخیلات ہیں، کبھی نفس کہتا کہ یہ عارضی حالت ہے، اللہ نے جو کچھ جاہ و عزت دے رکھی ہے، چھوڑنے کے بعد اگر پھر واپس آنے کا خیال ہو تو اس کا دوبارہ حصول مشکل ہے، غرض اسی لیت وعل میں کچھ ہینے گذر گئے، یہاں تک کہ اب معاملہ بس سے باہر ہو گیا زبان بھی رک گئی، جیسے اس میں تالا پڑ گیا ہو، میں کوشش کرتا تھا کہ آنے جانے والوں کی خوشی کے لئے ایک ہی دن پڑھاؤ لیکن زبان بالکل ساتھ نہیں دیتی تھی، اور ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا، زبان کی بندش سے قلب میں ایک رنج و غم کی کیفیت پیدا ہوئی جس کے اثر سے قوتِ ہاضمہ نے بالکل جواب دے دیا، کھانے پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی، یہاں تک کہ ایک گھونٹ پانی، کھانے کے ایک لقمہ کا ہضم کرنا بھی میرے لئے دشوار ہو گیا، رفتہ رفتہ تمام قوائے جسمانی پر ضعف کا غلبہ ہوا، یہاں تک کہ اطبانے علاج سے ہاتھ اٹھالیا اور کہا کہ قلب پر

کوئی اثر ہے اور اس سے مزاج متاثر ہو گیا ہے، جب تک قلب پر اثر نہ جائے، اس وقت تک علاج کچھ سودمند نہیں، جو میں نے دیکھا تو میں اس معاملہ میں بالکل بے بس ہوں تو میں نے الشریک طرف رجوع کیا اور اضطراری کیفیت کے ساتھ اس سے دعا کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جاہ و مال اور اہل و عیال کا چھوڑ دینا مجھے آسان معلوم ہونے لگا، میں نے کما قصدا ظاہر کیا، اور میرے دل میں یہ تھا کہ میں شام کا سفر کروں گا اور بڑے لطافت و اہل سے میں نے بغداد سے نکلنے کا سامان کیا، اہل عراق کو جب میرا قصد معلوم ہوا تو انہوں نے چاروں طرف سے مجھے ملامت کرنی شروع کی اس لئے کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اس ترک و انقطاع کا کوئی دینی سبب بھی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ان کے خیال میں مجھے دین کا بلند ترین منصب حاصل تھا، اِنَّ الْاِلٰهَ مَبْتَخِنُہُمْ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ پھر لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کیں، جو مرکز حکومت سے دور تھے، انہوں نے خیال کیا کہ اس میں کچھ حکام کا اشارہ ہے، اور ان کے ایسا سے یہ خدمت ترک کی جا رہی ہے، لیکن جن لوگوں کا حکومتی حلقوں سے تعلق تھا، وہ دیکھتے تھے کہ اہل حکومت کو کس قدر میرے قیام پر اصرار ہے، اور ان کی کیسی شدید خواہش ہے کہ میں اپنے کام میں مشغول رہوں، وہ یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی اس رونق اور مسیحی چہل پہل کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ یہ شخص سب چھوڑ چھاڑ کر جا رہا ہے، غرض میں نے بغداد کو الوداع کہی اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا، اس میں سے بقدر کفایت رکھ کر سب بانٹ دیا، بغداد سے میں شام آیا، اور وہاں دو سال کے قریب رہا، وہاں میرا کام عزیمت و خلوت اور مجاہدے کے سوا کچھ نہ تھا، میں نے علم تصوف سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کے مطابق نفس کے تزکیہ، اخلاق کی درستی و تہذیب اور ذکر الشریک کے لئے اپنے قلب کو مصفا کرنے میں مشغول رہا، میں مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں معتکف رہا، مسجد کے منارے پر چڑھ جاتا، اور تمام دن دروازہ بند کئے وہیں بیٹھا رہتا، دمشق سے میں بیت المقدس آیا، وہاں بھی روزانہ صفحہ کے اندر چلا جاتا، اور دروازہ بند کر لیتا، سیدنا ابراہیم کی

زیارت کے بعد میری طبیعت میں حج و زیارت کا شوق اور کم کر رہا و بدینہ منورہ کے برکات سے استفادہ کا خیال ہوا، چنانچہ میں حجاز گیا، حج کرنے کے بعد اہل و عیال کی کشش اور بچوں کی دعاؤں نے مجھے وطن پہنچایا حالانکہ میں وطن کے نام سے کوسوں بھاگتا تھا، وہاں بھی میں نے تنہائی کا اہتمام رکھا، اور قلب کی صفائی سے غافل نہیں ہوا، لیکن حوادث و واقعات اہل و عیال کے افکار اور معاشی ضرورتیں طبیعت میں انتشار پیدا کرتی رہتی تھیں اور دیکھی اور سکون قلب مسلسل نہیں رہتا تھا، لیکن میں اس سے ایسے نہیں ہوتا تھا، اور وقتاً فوقتاً اس سے لذت یاب ہوتا رہتا تھا، دس برس اسی حالت میں گزر گئے، ان تنہائیوں میں مجھے جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا، اس کی تفصیل اور اس کا استقصاء تو ممکن نہیں، لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا، کہ صوفیاء ہی البشر کے راستے کے مالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم، اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت، اور شریعت کے رمزنا سوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر نہ لانا چاہے تو ممکن نہیں، ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے اخذ ہیں، اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے۔

خلوت سے جلوت کی طرف

ممکن تھا کہ امام غزالیؒ اس خلوت و عزلت کی حالت میں رہ جاتے اور یقیناً عمر بھی روحانی لذت اور یکسوئی کے سکون و اطمینان میں گزار دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے جو عظیم الشان کام لینا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس خلوت سے نکلیں اور درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور اجتماعی زندگی اختیار کریں تاکہ خلائی کو نفع ہو، اسحاق و فلسفہ کی تردید اور عقلی و علمی طور پر اسلام کی برتری اور صداقت ثابت کرنے کے لئے، خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یقین و مشاہدے کے مقام تک پہنچا دیا تھا، عالم اسلام

میں ان سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں تھی، چونکہ یہ کام خدا کو منظور تھا، اور اسلام کو اس کی سخت ضرورت تھی، اس لئے خود ان کی طبیعت میں اس کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا، اور ان پر اس چیز کا غلبہ ہوا کہ یہی عریضیت کا کام اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور وقت کا فریضہ اور افضل عبادت ہے، اپنے ان احسان کو وہ خود بیان کرتے ہیں، اور خلوت سے جلوت میں آنے کا سبب تحریر کرتے ہیں :-

”میں نے دیکھا کہ فلسفہ کے اثرات بہت سے مدعیان تصوف کی گمراہی بہت سے علماء کی بے عملی اور مشکلیں کی غلط اور کمزور نمایندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے، اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند بھی ہیں، لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں، بعض محض موسیقی، اہل شہر کی عادت کی پیروی، اور اپنی حفاظت کے لئے بعض احکام شرعی کی مادی منفعتیں اور ان کے نہ کرنے کے دنیاوی نقصانات بتلاتے ہیں، اور اگر ان نقصانات سے بچا جاسکے تو ان کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، میں نے دیکھا کہ میں ان شہادت کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور آسانی اس پر قادر ہوں، یہاں تک کہ ان لوگوں کی پردہ دری مجھے اپنے مطالعہ اور ان کے علوم سے گہری واقفیت کی وجہ سے پانی پینے سے بھی زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہیے، اور یہی وقت کا فریضہ ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ تجھے یہ خلوت و عزلت کب جائز ہے، مرض پھیل گیا ہے، اور طبیب خود بیمار ہیں، اللہ کی مخلوق ہلاکت کے کنارے پہنچ گئی ہے، پھر میں نے کہا کہ عظیم الشان کام تم سے کیسے انجام پاسکے گا، عہد نبوت سے بہت بعد ہو گیا ہے، باطل کا ہر طرف دور دورہ ہے، اگر تم نے خلق خدا کو ان کی محبوبہ مانوس چیزوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو سارا زمانہ تمہارا مخالف ہو جائے گا، تم تنہا کیسے ان کا مقابلہ کر سکو گے، اور کیسے زندگی بسر کرو گے، یہ تو جب ممکن تھا کہ زمانہ مساعد ہوتا، اور سلطان وقت دین دار اور صاحب اقتدار

ہوتا، میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو بچھالیا، اور اپنے لئے عزت و خلوت کی زندگی کو جائز قرار دے لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا، اس نے سلطان وقت کے دل میں خود ہی تحریک پیدا کر دی اس نے مجھے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے نیشاپور پہنچنے کا تاکید کر دی، یہ حکم سلطانی کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی تعمیل نہ کی تو ناراضی تک نوبت پہنچے گی، میں نے خیال کیا کہ اب میرے لئے مذر باقی نہیں رہا، اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سُستی اور رستہ طلبی اور تن آسانی کے لئے ہوگی اور آزمائش اور تکالیف سے گریز، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

”أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۚ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ“ نیز اپنے رسول کریم سے جو اس کے بندوں میں سب سے معزز و مکرم تھے، اس کا ارشاد ہے:-

”وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأَوْدُوا حَتَّىٰ آتَاهُم نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبِيِّكَ الْمُرْسَلِينَ ۝“

میں نے چند اہل قلوب اور اہل مشاہدات سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا، انھوں نے بھی بالافتقار مجھے ترک عزت کا مشورہ دیا، اس کی تائید میں بہت سے صلحاء نے متواتر خواب بھی دیکھے، جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر و برکت کا باعث ہوگا، اور پانچویں صدی کے شروع میں جس میں ایک ہی مہینہ باقی تھا، کوئی شاید عظیم الشان تجدیدی کام ہوگا، اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے آدمی کو پیدا کرتا ہے، جو اس امت کے دین کو تازہ کر دیتا ہے، ان سب آثار و قرائن سے مجھے بھی اس کی امید پیدا ہوئی، اللہ تعالیٰ نے میرے لئے نیشاپور کا سفر کر دیا اور میں نے اس کا عظیم کارادہ کر لیا، یہ ۴۹۹ھ کے ماہ ذیقعدہ کا قصہ ہے، بغداد سے ذیقعدہ ۵۰۰ھ میں نکلا تھا، اس طرح سے میری گوشہ نشینی کی مدت ۱۱ سال ہوتی ہے،

یہ سب تقدیر الہی کی کار فرمائی تھی جس طرح بغداد سے نکلنا اور وہاں کے جاہ و اعزاز کو خیر آباد کہنا
 تصور میں نہیں آتا تھا، لیکن اللہ کے حکم سے وہ سب کچھ آسان ہو گیا، اسی طرح سے اس عزت کے
 زمانہ میں خلوت کی طرف دوبارہ آنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تھا لیکن وقت پر اس کا بھی سامان ہو گیا۔
 غرض ذیقعدہ ۱۲۹۹ھ میں امام صاحب نے پھر نیشاپور کا رخ کیا، اور مدرسہ نظامیہ کی مسند درس کو
 زینت دی اور دوبارہ تدریس و افادہ کا کام شروع کیا، لیکن اب امام غزالیؒ کے درس و تدریس اور
 اصلاح و ارشاد اور اس انقلاب سے پہلے کے تدریسی مشاغل اور وعظ و ارشاد میں فرق تھا، پہلے وہ
 نفس کے تقاضے اور طبیعت کے جذبہ سے کرتے تھے، اب وہ اپنے کو موز اور آلہ کار سمجھتے تھے چنانچہ
 خود پوری صاف گوئی سے لکھتے ہیں:۔

”مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے، لیکن حقیقت
 اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے، میری اس پہلی اور دوسری حالت میں
 زمین و آسمان کا فرق ہے، میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا، جو حصول جاہ کا ذریعہ ہے، اور میں اپنے
 قول و عمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا، اور یہی میرا مقصود و نیت تھی، لیکن اب میں اس علم کی دعوت
 دیتا ہوں جس سے جاہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا
 ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہنچوں گا، یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا، لیکن
 اپنے یقین و مشاہدہ کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے، اسی سے آدمی مگر اہی
 اور شر سے بچ سکتا ہے، اور ہدایت و طاعت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے، دراصل میں نے اپنی
 طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ مجھے حرکت میں لایا ہے، میں نے خود کام نہیں شروع کیا ہے، اللہ نے مجھے
 کام میں لگایا ہے، میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے، پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح
 ہو، پہلے مجھے راہ پر لگائے پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے، حق مجھ پر منکشف ہو جائے، اور اس کے

فضل سے مجھے اتبارع کی توفیق ہو، باطل مجھ پر واضح کرے اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے۔

امام غزالیؒ کا تجدیدی کام

- امام غزالیؒ نے اس کے بعد جو مجددانہ کام انجام دیا، اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔
- ۱۔ فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر حملہ۔
 - ۲۔ زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید و اصلاح۔

فلسفہ پر عمل جراحی

ان کے پہلے اور سب سے بڑے کارنامہ کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفہ، اسما و باطنیت کے خلاف اس وقت تک جو کچھ کیا جاتا رہا تھا، اس کی حیثیت صرف مدافعت و جواب ہی کی تھی، اس وقت تک فلسفہ اسلام پر حملہ آور تھا، اور متکلمین اسلام صفائی کے وکیل تھے، فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر پیشہ چلاتا تھا، اور علم کلام سپر بننے کی کوشش کرتا تھا، اس وقت تک متکلمین و علماء اسلام کے گروہ میں کسی نے خود فلسفہ کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی، ”فلسفہ جن“ مفروضات پر قائم تھا، ان پر جرح کرنے اور خود ان کی علمی تنقید کرنے کی صدیوں تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی، امام ابو الحسن اشعری کو چھوڑ کر جن کو فلسفہ سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا، پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعتی تھا، امام غزالیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفہ کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کیا، اس کے بعد مقاصد الفلاسفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقہ پر منطق، الہیات اور طبیعیات کا خلاصہ پیش کیا، اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات اور مباحث کو مدون کر دیا، کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ

لکھ دیا ہے کہ ریاضیات میں قیل وقال کی گنجائش نہیں، اور دین کا اس سے نفیاً و اثباتاً کوئی تعلق نہیں، لیکن اصل مذہب کا تصادم الہیات سے ہے، منطقیات میں بھی شاذ و نادر غلطیاں ہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو اصطلاحات کا، طبیعیات میں ضرورت و باطل کی آمیزش ہے، اس لئے ان کا موضوع بحث دراصل الہیات اور کسی قدر طبیعیات ہے، منطق محض تہید و اصطلاحات کے لئے۔

اس کتاب سے فارغ ہو کر جس کی علم کلام کے حلقے میں سخت ضرورت تھی، انھوں نے اپنی معرکہ الآراء کتاب ”تہافت الفلاسفہ“ لکھی جس کی خاطر انھوں نے مقاصد الفلاسفہ لکھی تھی، اس میں انھوں نے فلسفہ کے الہیات و طبیعیات پر اسلامی نقطہ نظر سے تنقید کی، اور اس کی علمی کمزوریوں، اس کے استدلال کے ضعف اور فلاسفہ کے باہم تناقض و اختلاف کو پوری حرأت و قوت کے ساتھ ظاہر کیا، اس کتاب میں ان کا لہجہ پُر از اعتماد ان کی زبان طاقت ور اور سنگین ہے، یہ کہیں وہ طنزیہ اور شوخ طرزیان بھی اختیار کر لیتے ہیں جس کی فلسفہ سے مرعوب حلقوں میں ضرورت تھی، اور جو بڑا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مقابلہ میں احساس کہتری کے ہر ثائبہ سے پاک اعتماد اور یقین سے لبریز اور فلسفہ سے بالکل غیر مرعوب ہے، وہ فلاسفہ یونان کو اپنی صفت اور طرح کا آدمی سمجھتا ہے، اور ان سے مساویانہ و حریفانہ باتیں کرتا ہے، اس وقت ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی، جو فلسفہ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے، اور بجائے مدافعت اور جواب دہی کے فلسفہ پر پورا وار کرے، امام غزالی نے ”تہافت الفلاسفہ“ میں یہی خدمت انجام دی ہے، اول سے آخر تک اس کتاب میں ان کا طرز ہی ہے کہ کتاب کی تہمیدیں لکھتے ہیں۔

”ہمارے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں

سے ممتاز ہے، یہ لوگ مذہبی احکام و قیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس کی وجہ صرف

یہ ہے کہ انھوں نے سقراط و پلوتارک، افلاطون و ارسطو کے پرہیز نام سنے، اور ان کی شان میں ان

مقلدوں کی مبالغہ آرائیاں اور قصیدہ خوانی سنی، ان کو معلوم ہوا کہ ریاضیاً، منطقیاً، طبیعیاً و الہیاتاً

میں انھوں نے بڑی موٹنگافیاں کی ہیں، اور ان کا عقل و ذہن میں کوئی ہمسر نہ تھا، اس عالی دماغی اور ذہانت کے ساتھ وہ مذاہب اور ان کی تفصیلات کے منکر تھے، اور ان کے نزدیک ان کے اصول و قواعد فرضی و مصنوعی ہیں، بس انھوں نے بھی تقلید انکار مذہب کو اپنا شعار بنالیا، اور ہم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کے شوق میں مذاہب کا انکار کرنے لگے، تاکہ ان کی سطح عوام سے بلند بھی جائے اور وہ بھی عقلا و حکما کے زمرہ میں شمار ہونے لگیں، اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکما نے انیت پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچہ اطفال اور ان کے بہت سے اقوال و نظریات حد درجہ کے مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں!

اس کتاب میں آگے چل کر ان کا زور بیان اور طنز آمیز طریقہ تحریر اور شوخ ہو جاتا ہے اور ذات و صفات باری کے متعلق فلاسفہ کے عجائبات اور عقول و افلاک کا پورا شجرہ نسب لکھ کر جو فلاسفہ نے تصنیف کیا ہے لکھتے ہیں :-

قلنا ما ذكرناه حكماً وهي على التحقيق تمہارا یہ سارا بیان اور تفصیلات محض دعاوی اور
ظلمات فوق ظلمات و حكاہ الانسا حکما ہیں بلکہ حقیقت تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں اگر
عن منام رأك لا استدل على سوء مزاجه^{۵۲} کوئی شخص اپنا ایسا خواب بھی دکھنا بیان کرے
تو اس کے سوء مزاج کی دلیل ہوگی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

لست ادرى كيف يشق الجنون من نفسي بل مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ
هذه الاوضاع فضلاً عن العقلاء الذين باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے جو جاکید و عقلا
يشقون الشعر بزعمهم في المعقولات^{۵۳} جو بزم خود معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

اتتھى بھما التعمق فى التعظيم الى ان
الطلواكل مايفهم من العظمة وقر بوا
حاله من حال المیت الذی لاخبر له
بمایحی فی العالم الا انّه فارق المیت
فی شعوره بنفسه فقط، وهكذا يفعل
الله بالرائعین عن سبيله والناکین
عن طریق الهدی المنکرین لقوله تعالى
”مَا أَشْهَدُ لَهُمُ الْسَّمَوَاتِ وَالْأَرْضُ مِنْ
وَلَا خَلْقُ أَنْفُسِهِمْ“ الطائین باالله ظنّ
السوء المعتقدین انّ امور الربوبیة
تستعلی علی کھما القوی البشريّة
المخرویین بعقولهم زاعمین انّ فیها
مندوحة عن تقلید الرسل واتباعهم
فلاجرم اضطروا الى الاعتراف بانّ
لباب معقولاتهم رجع الى مالوکی
فی المنام لتعجب منه۔

(مبدأ اول) کی تعظیم میں مبالغہ کرنے سے ان کو اس
حد تک پہنچا دیا کہ انھوں نے عظمت کے تمام شرائط و لوازم کو
باطل قرار دے دیا، اور اللہ تعالیٰ کو (اپنے فلسفہ میں)
اس مردہ کی طرح بنا دیا جس کو کچھ خبر نہیں کہ عالم میں
کیا ہو رہا ہے، صرف اس بات میں وہ مردہ سے غنیمت ہے
کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو اپنا شعور بھی
نہیں ہوتا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ایسا ہی
حشر کرتا ہے، جو اس کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں
اور ہدایت کے راستے سے کترا جاتے ہیں جو
اس آیت کے منکر ہیں، ”میں نے ان کفار و
مشرکین کو آسمان اور زمین کی پیدائش کے
وقت گواہ نہیں بنایا، اور نہ ان کی پیدائش
کے وقت جو اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کرتے ہیں،
اور برا عقائد رکھتے ہیں جن کا خیال ہے کہ امر
ربوبیت کی حقیقت پر انسانی قویٰ حاوی ہو
سکتے ہیں جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں اور سمجھتے ہیں کہ
ان کی موجودگی میں پیغمبروں کی تقلید اور ان کے

اتباع کی ضرورت نہیں، لامحالہ اس کا انجام یہ ہوگا
ان کی زبان سے (معقولات کے نام سے) ایسی ایسی
مضحکہ خیز باتیں نکلیں کہ اگر کوئی خواب بھی ایسا بیان
کرے تو لوگ تعجب کریں۔

”تہافت افلاسفہ“ کا اثر

فلسفہ پر یہ دلیرانہ تنقید اور کسی حد تک تحقیر علم کلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس کا سہرا
امام غزالیؒ کے سر پہ بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس کی تکمیل کی اور فلسفہ اور منطق کی لاش کی تشریح ”پوسٹ
مارٹم“ کا فرض انجام دیا، فلسفہ کی جراحی کے اس سلسلہ کا آغاز امام غزالیؒ ہی کی تصنیفات سے ہوتا ہے۔

”تہافت افلاسفہ“ نے فلسفہ کے خیالی طلسم پر کاری ضرب لگائی، اور اس کی عظمت، ذہنی تقدس کو کافی
نقصان پہنچایا، اس کتاب کی تصنیف نے فلسفہ کے حلقوں میں ایک اضطراب اور غم و غصہ پیدا کر دیا، مگر
تئو برس تک اس کے جواب میں کوئی شایان شان کتاب تصنیف نہیں ہوئی، یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری
کے آخر میں فلسفہ کے مشہور پرچوش وکیل اور ارسطو کے حلقہ گوش ابن رشد (م ۱۱۹۵ھ) نے ”تہافت التہافت“
کے نام سے اس کا جواب لکھا، علما و مغرب کہتے ہیں کہ اگر ابن رشد فلسفہ کی حمایت کے لئے نہ کھڑا ہو جاتا تو
فلسفہ غزالیؒ کے حلوں سے نیم جان ہو چکا تھا، ابن رشد کی حمایت نے اس کو تئو برس تک کے لئے پھر زندگی
عطا کر دی۔

باطنیت پر حملہ

فلسفہ کے علاوہ امام غزالیؒ نے فتنہ باطنیت کی طرف بھی توجہ کی انھوں نے قیام بغداد اور

مدرسہ نظامیہ کی تدریس کے زمانہ میں باطنیوں کی تردید میں خلیفہ وقت کے اشارہ سے المستطریؒ تالیف کی تھی جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی خود نوشت تلاش حق کی کہانی ”المنقذ من الضلال“ میں کیا ہے اس کتاب کے علاوہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں اور ہیں، جو غالباً اس بازگشت زمانہ کی تصنیف ہیں ”حجۃ الحق“، ”مفصل الاختلاف“، ”قاصم الباطنیہ“ ان کی تصنیفات کی فہرست میں اس موضوع پر دو کتابیں ”فضائح الاباحیہ“ اور ”مواہم الباطنیہ“ اور بھی ملتی ہیں، باطنیت کے رد کے لئے درحقیقت اہل سنت کے حلقہ میں ان سے زیادہ موزوں آدمی ملنا مشکل تھا، وہ فلسفہ و تصوف اور ظاہری علوم اور خفائی و معارف دونوں کو چوں سے واقف تھے، اور باطنیہ کی اسرار فروشی اور ان کی عقلی سازش کا آسانی سے پردہ فاش کر سکتے تھے، باطنیہ کا بڑا اثر فلسفہ اور اس کی اصطلاحات تھیں، اس لئے امام غزالیؒ جیسا جامع شخص اور عقلیات کا مبصر ان کی تردید کا کام کر سکتا تھا، چنانچہ اس کام کو انھوں نے بخوبی انجام دیا اور ان کو علمی طور پر بے وقعت اور بے اثر بنا دیا۔

زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ

امام غزالیؒ کا دوسرا اصلاحی کا نامہ زندگی و معاشرت کا اسلامی جائزہ اور اس کی اصلاح و تجدید کی کوشش تھی، ان کی اس کوشش کا نمونہ اور کامیاب نتیجہ ان کی زندہ جاوید تصنیف ”احیاء علوم الدین“ ہے۔

احیاء علوم الدین

تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے اور جن سے اسلامی حلقے طویل عرصہ تک متاثر رہے ہیں، ان میں ”احیاء علوم الدین“ کو ممتاز مقام

ملے۔ ان تینوں کتابوں کا تذکرہ امام غزالیؒ نے ”جواہر القرآن“ میں کیا ہے۔

حاصل ہے، حافظ زین الدین العراقي صاحب "لغیہ" (م ۷۸۸ھ) جنھوں نے احیاء کی احادیث کی تخریج کی ہے، کہتے ہیں کہ امام غزالیؒ کی احیاء العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات ہے، بعد انفا فراسی جو امام غزالیؒ کے معاصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ احیاء العلوم کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی، شیخ محمد کا زرونی کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیے جائیں تو میں "احیاء العلوم" سے ان کو دوبارہ زندہ کر دوں گا، حافظ ابن جوزی نے بھی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود اس کتاب کی تاثیر اور مقبولیت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کا خلاصہ منہاج القاصدین کے نام سے لکھا۔

یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، بغداد سے انھوں نے طلب حق اور تلاش یقین کا جو سفر شروع کیا تھا، اور جو دس برس کے مجاہدات اور بادیہ پیمائی کے بعد گلیا بی پر ختم ہوا، احیاء العلوم اس سفر کی سوغات تھی، جو امام غزالیؒ اپنی وطن کے لئے لائے، یہ ان کے قلبی تاثرات، علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے۔

مولانا شبلی نے الغزالیؒ میں لکھا ہے :-

"بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا، تمام مذاہب کو چھانا کسی سے تسلی نہیں ہوئی آخر تصوف کی طرف رخ کیا، لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی، بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا، اور اس کا پہلا زینہ اصلاح باطن اور تزکیہ نفس تھا، امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدا رہا تھے، قبول عام و ناموری جاہ و منزلت، مناظرات و مجادلات اور پھر تزکیہ نفس شَتَائِیَ بَيْنَهُمَا ع

اسی رہ کہ می روی تو بمنزل نمی رود

آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کلی میں بغداد سے نکلے، اور دشت پیمائی شروع کی سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد برم راز تک رسائی پائی، یہاں پہنچ کر کم سن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جائے لیکن۔

ع بیاد آر حریفان بادہ پیمیا را

کے لحاظ سے افادہ عام پر نظر پڑی دیکھا تو آئے کا آؤ لگا ہوا ہے، امیر و عزیز عام و خاص عالم و جاہل،
رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں، علماء و جوہیل راہ بن سکتے تھے، طلب جاہ میں مہروں
ہیں، وہ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے، اور اس حالت میں یہ کتاب لکھی، دیا چاہیں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے
تمام عالم کو چھایا ہے، اور سعادت اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں، علماء و جوہیل راہ تھے، زمانہ ان سے خالی
ہونا چاہتا ہے، جو رہ گئے ہیں، وہ نام کے عالم ہیں، جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، اور
جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے، مناظرہ (جو فخر و خود کا ذریعہ
ہے) و عطا (جس میں عوام کی دلفریبی کے لئے رنگین اور مستح فخرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ
(جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے) باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے، اور
لوگ اس کو بھول بھلا چکے، یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور مہر سکوت ٹوٹ گئی،^۱

تنقید و احتساب

کتاب کی تالیف سے جو اصلاح و تربیت امام غزالی کے پیش نظر تھی، اس کے لئے آمادگی اور شوق
اور اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کا تقاضا پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کمزوریوں اور خرابیوں کی
نشاندہی کی جائے، جو علمی و دینی حلقوں اور مسلم معاشرہ میں بالعموم پھیلی ہوئی تھیں، نیز اس حقیقت کو
آشکارا کیا جائے کہ نفس و شیطان نے کس کس طرح سے مختلف طبقوں کو قریب دے رکھا ہے، دینی مفاد پر
حقائق کس طرح تبدیل ہو گئے ہیں، لوگ حقائق و مقاصد سے ہٹ کر ظواہر و اشکال اور رسوم میں کس طرح
گرفتار ہیں، اور مقصد اصلی سعادت اخروی اور رضا الہی سے کس طرح غافل ہیں، اس کے لئے انھوں نے

اپنے زمانہ کی زندگی اور معاصر سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا، اور اس کی بے لاگ تنقید کی، اور ہر طبقہ کے امراض اور مغالطوں کو صفائی کے ساتھ بیان کیا، مقاصد اور وسائل و آلات میں فرق کیا، علوم میں دنیاوی علوم اور دینی علوم اور پھر علوم محدودہ اور علوم مذمومہ فرض اور فرض کفایہ کی تقسیم کی، وقت کے فریضہ اور اصل کام کی طرف توجہ دلائی، اہل دولت اور اغنیاء کی کوتاہیوں اور ان کی مخصوص بیماریوں کو کھول کر بیان کیا، اسلامی حکام پر جرات کے ساتھ تنقید کی، اور ان کے جبر و ظلم، خلاف شرع اعمال و قوانین کی مذمت کی، اس کے علاوہ جمہور و عوام کے امراض اور مختلف طبقوں اور مقامات کے منکرات، مذموم عادات اور مخالف دین رسوم و بدعات کی تفصیل کی، اس طرح یہ کتاب اسلام میں پہلی مفصل و مدلل کتاب ہے جس میں پوری زندگی اور بگڑے ہوئے اسلامی معاشرہ کا قوت کے ساتھ احتساب کیا گیا ہے، اور اخلاقی بیماریوں کے عوارض و اسباب و ران کا طریق علاج بتایا گیا ہے۔

علماء و اہل دین

امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، دینی و اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی ذمہ داری علماء پر ہے، جو ان کے نزدیک امت کا نمک ہیں، اگر نمک بگڑ جائے تو اس کو کون سی چیز درست کر سکتی ہے، بقول شاعر:-

یا معشر القراء یا ملح البلد ما یصلح الملح ازا ملح فسد

اے جماعت علماء! وہ جو شہر کا نمک ہے۔ بھلا یہ تیلاد کہ جب نمک ہی بگڑ جائے تو پھر اس کی اصلاح کس سے کی جائے

ایک جگہ امراض قلب کی کثرت اور عام غفلت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

الثالثة وهو إلقاء العضال فقد

الطبيب فان الأطباء هم العلماء

وقد مرضوا في هذا الأعصار مرضاً

شدیداً و محجوزاً عن علاجه۔

تیسرا سبب اور وہ لاعلاج مرض کی حیثیت رکھتا

ہے، یہ ہے کہ مرضی موجود ہیں اور طبیب مفقود،

طبیب علماء ہیں، اور وہ خود اس زمانہ میں بری

طرح بیمار ہیں، اور علاج سے عاجز ہیں۔

ان کے نزدیک سلاطین و حکام کی خرابی کا سبب بھی علماء کی کمزوری اور اپنے فرائض سے غفلت ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وبالجملة انما فسدت الرعية خلاصہ یہ ہے کہ رعیت کی خرابی کا سبب سلاطین
 بفساد الملوك وفساد الملوك کی خرابی ہے اور سلاطین کی خرابی کا سبب علماء
 بفساد العلماء فلولاً القضاء الشوع کی خرابی ہے اس لئے کہ اگر خدا نافرست قاضی اور
 والعلماء الشوع لقل فساد الملوك علماء و سوز نہ ہوتے تو سلاطین اس طرح نہ بگڑتے
 خوفا من انكارهم اور ان کو علماء کی روک ٹوک کا کھٹکا ہوتا۔

ان کو علماء و وقت سے شکایت ہے کہ وہ علماء سلف کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور کلمہ حق
 عند سلطان جابر کا فریضہ انجام نہیں دیتے، ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ خود بہت سے علماء دنیا
 طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہو گئے ہیں، وہ سلاطین و وقت اور ارباب حکومت کے سامنے علماء حق کی جرأت و
 بیباکی اور احتساب و انکار کے موثر واقعات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:-

”یہ تھا علماء کا طرز عمل اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شان، ان کو سلاطین کی شان و شوکت کی
 ذرا پرواہ نہ تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد رکھتے ہیں، اور ان کو اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت
 فرمائے گا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر بھی راضی تھے کہ ان کو شہادت نصیب ہو، چونکہ ان کی نیت
 خالص تھی، اس لئے ان کے کلام سے پتھر موم ہو جاتے تھے، اور بڑے سے بڑے سنگدل متاثر ہوتے تھے، اب تو
 حالت یہ ہے کہ طمع دنیا نے علماء کی زبانیں گنگ کر رکھی ہیں، اور وہ خاموش ہیں، اگر بولتے بھی ہیں تو ان کے
 اقوال و حالات میں مطابقت نہیں ہوتی، اس لئے کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر آج بھی وہ خلوص و صداقت سے
 کام لیں، اور علم کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو ان کو ضرور کامیابی ہو، کیونکہ رعیت کی خرابی سلاطین کی خرابی

کا نتیجہ ہے، اور سلاطین کی خرابی علماء کی خرابی کا نتیجہ ہے، اور علماء کی خرابی کی وجہ دولت اور جاہ کی محبت کا غلبہ ہے، اور جس پر دنیا کی محبت غالب آجائے وہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر بھی احتساب اور روک ٹوک نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ سلاطین و اکابرؑ

امام غزالی کے زمانہ میں ایک عالم کا کلمہ فقہ کی جزئیات اور اختلافی مسائل میں مشغول تھا، مباحثہ و مناظرہ کا بازار گھگھرا اور ملک کے چپہ چپہ پر گرم تھا، مجالس و تقریبات اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق بھی انہی مذہبی و فقہی مباحثوں اور مناظروں سے تھی، اس بارہ میں علماء و طلبہ کا انہماک اور قیادت بڑھ گیا تھا کہ تمام دوسرے علوم و مشاغل اور خدمتِ دین کے شعبے نظر انداز ہوتے جا رہے تھے، حد یہ ہے کہ اصلاحِ نفس تہذیبِ اخلاق اور سعادتِ اخروی کا جس علم اور کوشش پر انحصار تھا، اس سے بھی توجہ ہٹ گئی تھی، امام غزالی اس صورتِ حال کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”اگر کسی فقیہ سے ان مضامین (صبر و شکر، خوف ورجاء وغیرہ) بالغض و حسد و کینہ، ناشکری، دغا، فریب وغیرہ) میں سے کسی کی بابت حتیٰ کہ اخلاص و توکل اور ریاضے بچے کے طریقوں کے متعلق سوال کیا جائے جس کا جاننا اس کے لئے فرض عین ہے، اور اس کی طرف سے غفلت کرنے میں آخرت کی تباہی کا خطرہ ہے تو وہ جواب نہ دے سکے گا، اور اگر آپ نوان و ظہارِ سبق و رمی کو دریافت کریں تو وہ ایسی ایسی باریک جزئیات کے دفتر کے دفتر سناے گا، جس کی ضرورت مدتوں پیش نہیں آتی، اور اگر کبھی ضرورت پیش آجائے تو شہر میں ان کے متعلق فتویٰ دینے والا، اور تہانے والا ہر وقت موجود ہے، لیکن یہ عالم دن رات انہی جزئیات کے سلسلہ میں محنت کرتا رہے گا، اور ان کے حفظ و درس میں مشغول رہے گا اور اس چیز سے غفلت برتے گا، جو دینی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے، اگر اس سے کبھی اس بارہ میں سوال ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اس علم میں اس لئے مشغول ہوں کہ وہ علم دین ہے اور فرض کفایہ ہے اور وہ اس کے تعلیم و تعلم کے بارہ میں اپنے کو بھی

مخالفت دیتا ہے اور دوسروں کو بھی، حالانکہ سمجھدار آدمی خوب جانتا ہے کہ اگر اس کا مقصد فرض کفایہ کے حق کو ادا کرنا ہو، اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہو تو وہ اس فرض کفایہ پر فرض عین کو مقدم رکھتا، بلکہ دوسرے فرض کفایہ بھی ہیں جن کو مقدم ہونا چاہیے مثلاً کتنے شہر ہیں جن میں صرف غیر مسلم طبیب ہیں جن کی شہادت احکام فقہ میں قبول نہیں کی جاسکتی، لیکن ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی عالم (اس کی اور ضرورت کو محسوس کر کے) علم طب کی طرف توجہ کرتا ہو اس کے بالمقابل علم فقہ یا مخصوص خلافیات و جدیدیات پر طلبہ ٹوٹ پڑتے ہیں، حالانکہ شہر ایسے علماء سے بھرا ہوا ہے جن کا مشغلہ فتویٰ نویسی اور مسئلہ بتلانا ہے، میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ علماء دین ایسے فرض کفایہ میں مشغول ہونے کو کیسے درست سمجھتے ہیں جن کو ایک جماعت کی جماعت سنبھالے ہوئے ہے اور ایسے فرض کو انھوں نے کیسے چھوڑ رکھا ہے جس کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہیں کیا اور کما سبب اس کے علاوہ اور کچھ ہے کہ طب کے ذریعہ سے اوقات کی تولیت و صیتوں کی تنفیذ اور یتیموں کے مال کی نگرانی و انتظام اور منصب قضاء و افتاء پر تقرر اور بمعصروں اور سمجھپٹوں میں فوقیت و امتیاز اور دشمنوں اور حریفوں پر حکومت وغلبہ حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

”کوئی شہر بھی ایسا نہیں ہے جہاں کچھ ایسے کام نہ ہوں جو فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہیں، اور علماء کو ان کی طرف مطلق التفات نہیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک طبیب کو ایچے اگر اکثر اسلامی شہروں میں مسلمان طبیب موجود ہوں جن کی شہادت شرعی امور میں معتبر ہو، علماء اس مشغلہ سے کوئی بچہ نہیں رکھتے، اس طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض کفایہ ہے (لیکن متروک ہو رہا ہے)“

وہ ایک جگہ عام بہالت و غفلت، دین سے ناواقفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور تبلیغ اور عمومی تعلیم کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

”اس شخص کے لئے جس کو اپنے دین کی واقعی فکر ہے، یہ (تبلیغ و تعلیم) خود ایسا مشغلہ ہے کچھ اس نادار وقوع جزئی
دور از کا تفصیلات اور ان علوم میں موٹنگائی کرنے کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی جو خود فرض کفایہ ہیں۔“

امام غزالی متفقانہ و مورخانہ حیثیت سے اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ اختلافی مسائل نے پچھلے دور میں کیوں
اس قدر اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لی، اور علمائے اس کو اپنی ذہانتوں اور محنتوں کا میدان بنالیا،
اور ان کی بہترین توجہات اس میں صرف ہونے لگیں، امام غزالی کے نزدیک اس کے کچھ تاریخی اسباب ہیں،
اور ان کے نتیجہ میں ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:-

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین حضرات خلفائے راشدین خود بڑے عالم، فقیر اور صاحب
فتویٰ تھے، ان کو شاذ و نادر کسی خاص موقع پر دوسرے اہل علم صحابہ سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی تھی، اس لئے
علماء صحابہ علوم آخرت کے لئے فارغ اور ان میں منہمک تھے، اگر کوئی فتویٰ کا موقع پیش آتا، تو وہ ایک دوسرے
پر محمول کرتے اور بہترین متوجہ الی الشریعہ تھے جیسا کہ ان کے حالات میں منقول ہے، جب ان لوگوں کی ذہانت اور
خلافت کا استحقاق اور قابلیت نہیں رکھتے تھے، اور ان میں خود فیصلہ کرنے اور فتویٰ دینے کی صلاحیت
نہیں تھی تو ان کو مجبوراً دوسرے علماء سے مدد لینا پڑی اور ان کو ساتھ رکھنا پڑا، تاکہ ان کے وہ فتویٰ حاصل
کرتے رہیں، علماء تابعین میں ابھی ایسے لوگ زندہ تھے، جو قدیم روش پر تھے، اور جن میں دین کی حقیقت اور
سلف کی شان تھی، جب ان کو بلایا جاتا تو وہ گریز کرتے، اور اعراض کرتے، خلفاء (بنی امیہ و بنی عباس)
کو ان کو تلاش کرنا پڑتا، اور جہدہ قضا اور حکومت کے لئے ان سے اصرار کرنے کی کوشش پیش آتی، ان کے
زمانہ کے لوگوں نے جب علماء کی یہ شان، سلاطین و حکام کا ایسا رجوع اور اہل علم کا یہ استغفار اور بے پرواہی
دیکھی تو وہ سمجھے کہ حصول جاہ و عزت کے لئے فقہ کا علم بہترین نسخہ ہے، اسی سے حکام کا تقرب اور قضا و
افتا کا منصب حاصل ہوتا ہے پس وہ اسی طرف متوجہ ہو گئے، انھوں نے حکام کے سامنے خود اپنی پیش کش کی اور

ان سے مراسم پیدا کئے، اور عہدوں اور انعامات کے خود امیدوار اپنے بعض کو کچھ ہاتھ زد کیا، بعض کامیاب ہوئے، جو کامیاب بھی ہوئے وہ امیدواری کی ذلت سے محفوظ نہیں رہے، اور ان کو اپنے مقام سے نیچے اتارنا، اور عیسا نہ اور مبتذل سطح پر آنا پڑا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء جو پہلے مطلوب تھے، اب طالب بن گئے پہلے حکام سے استغناء اور اعراض کی وجہ سے معزز تھے، اب ان کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو گئے، البتہ اس کلیہ سے ہر دور میں کچھ اللہ کے بندے مستثنیٰ رہے ہیں۔

ان زمانوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور توجہ احکام اور فتاویٰ کی طرف تھی، اور انتظامات اور فقہاء کے سلسلہ میں ان کی ضرورت بھی زیادہ تھی، اس کے بعد بعض رؤسا و حکام کو اصول و عقائد سے کچھ پیدا ہوئی، اور اس کا شوق ہوا کہ ہر فرقہ کے دلائل و مباحث میں اور ان کا بحث و مباحثہ دیکھیں، لوگوں کو ان رؤسا و حکام کے اس ذوق کا علم ہوا تو وہ علم کلام کی طرف رجوع ہوئے، مصنفین نے اس موضوع پر بہ کثرت تصنیفات کیں اور مناظرے کے اصول و قواعد کو مرتب کیا، اور رد و قدح کو ایک فن بنادیا، ان لوگوں کا یہ بیان تھا کہ ان کا مقصود دین کی طرف سے مدافعت و جواب ہی سنت کی نصرت، اور بدعت کی تردید و مخالفت ہے، ٹھیک جیسے ان لوگوں کے پہلے کے لوگ یہ کہتے تھے کہ فتاویٰ میں مشغولیت سے مقصود محض دین، خدمتِ خلق، اور بندگانِ خدا پر شفقت اور خیر خواہی ہے، اس کے بعد کچھ رؤسا و حکام ایسے ہوئے، جو علم کلام و مناظرہ کو بنظر استعسان نہیں دیکھتے تھے، ان کا خیال تھا، کہ اس سے تعصب، جنگ و جدال اور بعض اوقات خوریزی و فساد کی نوبت آجاتی ہے، ان کو فقہی بحث و مناظرہ سے رنجت تھی، اور اس شخص کا شوق تھا کہ خصوصیت کے ساتھ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی میں کس کا مذہب زیادہ صحیح ہے، لوگوں نے دیکھ کر کلام و عقائد کو بالائے طاق رکھ دیا، اور اختلافی مسائل بالخصوص امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کو موضوعِ سخن بنالیا، اور امام مالک، امام سفیان ثوری اور امام احمد حنبلہ کے مذاہب اختلاف کو نظر انداز کر دیا (اس لئے کہ ان کے اختلافات سے حکام کو کچھ نہ تھی) ان کا کہنا تھا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کثرتِ طبع کی باریکیوں کو

ظاہر کریں، مذاہب کے وجوہ و اسباب کو بیان کریں، اور فتاویٰ کے اصول کو مرتب و مدون کریں انھوں نے اس میں کثرت سے تصنیفات کیں، اور استنباطات کئے، اور مجادلہ اور تصنیف کے فن کو ترقی دی، اور شیخہ ابھی تک جاری ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کیا دکھائے گا، اور اس میں کیا تغیر ہوگا تو دراصل اختلافی مسائل اور مناظرہ سے علماء کی کچھ اور ان کے انہماک کا سبب یہ ہے جو ہم نے بیان کیا اگر اہل نیا اور باب اقتدار کو (امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے علاوہ) کسی اور امام یا (اختلافی مسائل و مناظرہ کے علاوہ) کسی اور علم سے کچھ ہو جائے تو علماء بھی اسی کی طرف جھک پڑیں گے، اور اس کی وجہ یہی بیان کریں گے کہ ان کا مقصد علم دین اور قربت خداوندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔^{۱۵}

اس کے بعد امام غزالی نے تفصیل کے ساتھ مناظرہ اور بحث و مجادلہ کے اخلاقی و روحانی نقصانات و مفسد اور اس کے شرور و افات بیان کئے، وہ عرصہ تک اس میدان کے شہسوار رہ چکے تھے، اس لئے اس سلسلہ میں ان کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، اور مشاہدات اور ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔^{۱۶} اس سلسلہ میں ایک بڑا مغالطہ الفاظ کا تھا، امام غزالی کے زمانہ کے علوم مروجہ اور ان کی گوی ہوئی شکلوں کے لئے جو الفاظ عنوان کا کام دیتے تھے، وہ قدیم الفاظ تھے، جو قرآن و حدیث، صحابہ کے کلام اور علماء سلف کی سیرتوں میں بہ کثرت آتے ہیں، مثلاً اختلافی مسائل فقہ کی ناوردہ وقوع جزئیات اور باریکیوں کے لئے بے تکلف ”فقہ“ کا لفظ استعمال ہوتا تھا، ہر طرح کے علمی اشغال اور شرعی و غیر شرعی علم کے لئے مطلق علم کا لفظ بولا جاتا تھا، علم کلام اور اس کے فلسفیانہ مباحث کو ”توحید“ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بے سروپا روایات و سطحیات اور عبارات آرائی و رنگین بیانی کو ”تذکیر“ کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، ہر طرح کے نامانوس مضامین اور پیچیدہ عجارتوں کو ”حکمت“ کا خطاب یا جاتا تھا، اور پھر ان سب خود ساختہ اعمال و اشغال پر وہ سب فضائل چسپاں کئے جاتے تھے، جو قرآن و حدیث میں ان علوم کی حقیقتوں کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں مثلاً فقہ

کی اس بڑی ہوئی شکل (محض اختلافات و جزئیات کے لئے) قرآن مجید کی آیت لیتفقہوا فی الدین اور

حدیث من یردد اللہ بہ غیر یرفقہ فی الدین، فلسفہ اور پانچویں صدی کے علم کلام کے لئے وَمَنْ یُؤْتَ الْحِکْمَ فَقَدْ أُوتِيَ خَیْرًا کَثِیْرًا کی بشارت، جاہل اور ناخدا ترمذی اعظموں کے حامیانہ مواعظ کے لئے فَقَدْ کُنَّا ذَمًّا اَنْتَ مُذَكِّرٌ اور دوسری آیات و احادیث منطق کی جاتی تھیں امام غزالی نے اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا اور تفصیل سے بتلایا کہ یہ الفاظ اپنی اصل حقیقت کھو چکے ہیں اور اپنے اصل مفہوم سے دور ہوتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں، قرونِ اولیٰ میں ان کا جو مفہوم تھا، اس سے علماء کے ان موجودہ مشاغل کو کوئی مناسبت نہیں ان کی بحث الفاظ کے سفر کی ایک کچھپ روداد اور اصطلاحات اور عنوانات کے تغیر کی ایک سبق آموز تالیف ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ ہے، جو علمی اور دینی حلقوں میں اس وقت پھیلی ہوئی تھیں۔

حکام و سلاطین

دوسرا جو امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار تھا، وہ اہل حکومت اور سلاطین و امراء کا طبقہ تھا، امام غزالی سے دو سو برس پہلے حضرت عبداللہ ابن مبارک نے انہی دونوں (علماء و سلاطین) کے گروہوں کو دین کا گائے والا قرار دیا تھا۔

وهل افسد الدین الا الملوك ولبار سوء وفسادها

امام غزالی نے ایک ایسے زمانہ میں کہ بادشاہ مطلق العنان اور ہر طرح کے قوانین و ضوابط سے بالاتر تھے، اور ان پر اعتراض کرنا موت کو پیام دینا تھا، اس طبقہ کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا اور ان پر آزادانہ تنقید کی، ان کے زمانہ میں بادشاہوں کے عطیوں اور پیشکشوں کو قبول کرنے کا عام رواج

لے چنانچہ فلسفہ کی درسی کتابوں پر حتیٰ کہ طب کی بعض بعض کتابوں کے سرورق پر اب بھی یہ آیت نظر آتی ہے۔

تھا، امام غزالی نے اموال سلطانی کو ناجائز اور بالعموم مشتبہہ اور حرام بتلایا۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

اغلب اموال السلاطین حرام فی
ہذا الاعصار والجلال فی ایدیہم
معدوم وعزیز۔
بادشاہوں کے مال اس زمانہ میں عموماً حرام
سے خالی نہیں، جلال ال ان کے پاس یا تو سر
سے ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

ان اموال السلاطین فی عصرنا حرام
کلھا واکثرھا وکیف لا والجلال
هو الصدقت والفق والغبۃ ولا
وجود لها وليس یدخل منها فی ید السلطان
ولم یبق الا الجزیۃ وانھا تؤخذ بالوعاء
من الظلم لا یحل اخذھا بے فانہم یجوز
حدود الشرع فی الماخوذ والمأخوذ منه
والوفاء لہ بالشرط ثم اذا نسب ذالک
الی ما ینصب الیہم من الخراج المضروب
علی المسلمین ومن المصادرات والرشا
صنوع الظلم لم ینلغ عشر معشر
عشیرۃ۔
سلطانیں کے مال ہمارے زمانہ میں یا تو سب حرام ہیں
یا ان میں کا بڑا حصہ اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ
جلال مدین نکوۃ دے اور مال غنیمت کی ہیں اور ان کا
کہیں موجود نہیں اور ان میں سے کوئی چیز بادشاہ تک پہنچنے
نہیں پاتی، لے دے کے صرف جزیہ کی حد اور اس کا حال
یہ ہے کہ وہ مختلف ظالمانہ طریقوں سے وصول کیا جاتا ہے
جن سے اس کا وصول کرنا جائز ہی نہیں حال سلطنت
حدود شریعت تجاوز کرتے ہیں نہ مال کی مقدار میں شریعت
کا کچھ پاس کیا جاتا ہے نہ جزیہ سے وصول کیا جاتا ہے
اس بارہ میں شریعت کے احکام کا خیال کیا جاتا ہے نہ اس
شرائط پورے کئے جاتے ہیں پھر مسلمانوں پر فرقہ و خراج
مالوں اور جائیدادوں کی ضبطی اور انواع و اقسام
کے ظلم سے ان پر سونے چاندی کی جو بارش ہوتی ہے، اس کو

اس جزیہ کو بھی کوئی نسبت نہیں۔

امام غزالی اس سے ترقی کر کے یہاں تک لکھتے ہیں کہ سلاطین وقت سے ان رقوم کا قبول کرنا بھی مناسب نہیں جن کے متعلق تحقیق یا گمان غالب ہے کہ وہ مشتبہ اور ناجائز نہیں ہیں اس لئے کہ اس میں بہ کثرت دینی مفاسد ہیں، اس موقع پر گذشتہ عہد کی مثالیں دی جاسکتی تھیں کہ سلف میں بعض علماء و صلحا نے اپنے زمانہ کے خلفاء و سلاطین کی پیشکش بعض اوقات قبول کی ہیں، امام غزالی اس عہد کے ملوک و سلاطین اور ان دونوں زمانوں کے حالات کا فرق بیان کرتے ہیں:-

”دور اول کے ظالم سلاطین خلفاء راشدین کے عہد کے قرب کی وجہ سے اپنے ظالمانہ رویہ کا احساس رکھتے تھے، اور ان کو صحابہ و تابعین کی بدحوئی اور استمال کا خیال رہا کرتا تھا، اور اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ وہ کسی طرح ان کے عطیے اور انعامات قبول کر لیں، وہ ان کے پاس یہ قمیص اور نذرانے بغیر ان کی طلب کے اور ان کی شان اور مرتبہ پر حروت آئے بغیر ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے، بلکہ ان کے قبول کر لینے پر ان کے احسان مند ہوتے تھے، اور سرت کا اظہار کرتے تھے، وہ حضرات بھی ان چیزوں کو لے کر تقسیم کر دیا کرتے تھے، وہ سلاطین کی اغراض میں ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے، نہ ان سے ملاقات کرنے آتے تھے، نہ ان کے ساتھ اجتماع کو پسند کرتے تھے، نہ ان کو ان کی درازی عمر اور جاہ و اقبال کے باقی رہنے کی خواہش تھی، بلکہ وہ ایسے ظالموں کے لئے بددعا کرتے تھے، ان کے بارہ میں آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے، اور ان کے منہ پر ان کے خلاف شرع امور پر ٹوک دیا کرتے تھے، اور تردید کرتے تھے، اس لئے اس کا خطرہ نہ تھا کہ جن ان کو سلاطین سے قائدہ پہونچا ہے، اتنا ہی ان کو سلاطین کے اس تعلق سے دینی نقصان پہونچے گا، اس لئے ان کے قبول کرنے میں کوئی قیاحت نہ تھی۔

لیکن اس کے برعکس آج سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں جن کے متعلق ان کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ ان سے کام لے سکیں گے، ان سے ان کو سہارا حاصل ہوگا، وہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے، ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی، اور وہ ہمیشہ دعا گوئی، ثنا خوانی اور

حاضر وغائب ان کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے اس سلسلہ میں پہلا درجہ سوال کی ذلت کا ہے دوسرا خدمت کے لئے آمد و رفت کا، تیسرا تعریف و دعا گوئی کا، چوتھا یہ کہ ضرورت کے وقت ان کے اعراض میں ان کی مدد کی جائے، پانچواں حاضر باشی اور دربار داری، جلوس کی شرکت، چھٹا انظار محبت، دوستی، اور حریفوں کے مقابلہ میں ان کی امداد و نصرت، ساتواں ان کے ظلم اور ان کے عیوب اور بد اعمالیوں کی پردہ پوشی اگر کوئی شخص ان میں سے کسی درجہ کے لئے تیار نہیں ہے، تو خواہ وہ امام شافعی کے مرتبہ کا ہو، سلطان ایک پیسہ بھی ان پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے اس لئے اس زمانہ میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ حلال ہے، اس لئے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس مال کا نوکیرا ذکر جس کے متعلق معلوم ہے کہ حرام یا مشتبہ ہے، اب اگر کوئی شخص ان سلطان کے اموال کو جوأت کے ساتھ قبول کرتا ہے، اور صحابہ و تابعین کی مثال دیتا ہے تو وہ درحقیقت فرشتوں کو لوہاروں پر قیاس کرتا ہے، اس لئے کہ ان کے اموال کو قبول کرنے کے بعد ان سے ملنے جلنے اور اختلاط کی ضرورت پیش آئے گی، ان کا لحاظ کرنا پڑے گا، ان کے اہلکاروں اور عمال کی خدمت کرنا پڑے گی، اور ان سے دینا اور ان کے سامنے جھکنا گوارا کرنا پڑے گا، پھر ان کی تعریف اور ان کے در پر حاضری دینے سے چارہ نہیں، اور یہ سب محصیت کی باتیں ہیں۔

جب گذشتہ بیان سے سلاطین کی آمدنی کے ابواب اور اس میں سے حلال و حرام کی... تفصیل معلوم ہو گئی تو اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ انسان شاہی رقوم میں سے اتنا جو بیع قبول کرے جو حلال ہے، اور وہ اس کا حق ہے، اور وہ رقم اس کے پاس گھر بیٹھے آتی ہو، اور کسی حاکم یا ملازم کی تلاش و خدمت اور ان سلاطین و حکما کی تعریف و تصدیق کی ضرورت بھی نہ ہو، اور زنان کی امداد و اعانت کی شرط نہ ہو، تو پھر (مسئلہ کے اعتبار سے) ایسی رقم کا قبول کرنا حرام نہیں ہے، لیکن دوسری خرابیوں اور بعد کے نتائج کے لحاظ سے مکروہ ضرور ہے۔

ایک دوسری جگہ سلاطین سے کنارہ کشی اور ان کے افعال و مظالم سے نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں:-

الحالة الثامنة ان يعتزل عنهم فلا يرام
ولا يرون وهو الواجب والسلامة
فيه فعليه ان يعتقد بغضهم على
ظلمهم ولا يحب بقائهم ولا يثق
عليهم فلا يستخبر عن احوالهم ولا يتقرب
الى المصلين بهم-
دوسری حالت یہ ہے کہ انسان ان سلاطین سے الگ
ٹھگ رہے کہ ان کا سامنا ہی نہ ہونے پائے اور یہ واجب
ہے اور اسی میں حفاظت انسان کو ان کے مظالم کی بنا
پر ان سے بغض کا اعتقاد رکھنا چاہیے وہ نہ ان کی
زندگی کا خواہشمند ہو نہ ان کی تعریف کئے نہ ان کے
حالات کی جستجو رکھے نہ ان کے مقربین سے میل جول۔

شخصی سلطنت اور جابر و مستبد بادشاہوں اور خود مختار وزراء و حکام کے اس دور میں کہ جب
پوری کی پوری قوم اور اس کے بیش قیمت سے بیش قیمت افراد کی زندگی ان کے رحم و کرم پر تھی، اور جب شبہ
پر قتل عام ہو سکتا تھا، امام غزالی کی یہ صاف گوئی اور سلطنت کے نظام مایات، آمد و صرف پر یہ کھلی
ہوئی تنقید اور علماء کو سلاطین و حکام کے عطیوں کو قبول نہ کرنے کی ترغیب و تبلیغ (جو حکومت سے
عدم تعاون اور اظہار ناراضگی یا بے تعلقی کی علامت سمجھی جاتی تھی) ایک چھانچا خاصا جہاد تھا جس کی
نزاکت کا اندازہ اخبارات اور تقریروں کی آزادی کے اس عہد اور جمہوری اور دستوری (خواہ
برائے نام) دور میں صحیح طور پر نہیں لگایا جاسکتا۔

امام غزالی نے صرف تحریر و تصنیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ جب ان کو بادشاہ وقت
سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں بھی انھوں نے کلمہ حق بلند کیا، ملک شاہ سلجوقی کا
بیٹا سلطان سنجر پوپے خراسان کا فرمانراوا تھا، امام غزالی نے ملاقات کے وقت اس سے
خطاب کر کے کہا کہ:-

۱۰ افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی

گردنیں طوقہائے زین کے بار سے لٹے

محمد بن ملک شاہ کو جو سنجر کا بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوفِ خدا اور اصلاحِ ملکی کی طرف متوجہ کیا۔

مشرقی سلطنتوں میں عموماً حکومت کا تمام نظم و نسق چونکہ وزراء کے ہاتھ میں ہوتا تھا، اور وہی دروہست حکومت کے منظم اور ذمہ دار ہوتے تھے اس لئے انہی کی اصلاح و توجہ سے مملکت کی اصلاح ہو سکتی تھی، امام غزالی اس حقیقت سے واقف تھے اس لئے انھوں نے سلاطین کو قیہ سے زیادہ ان کے وزراء کی طرف توجہ کی، ان کو مفصل خطوط اور ہدایت نامے لکھے، اور بڑی جرأت و صفائی کے ساتھ حکومت کی بددیواریوں کی پامالی، حکام کی مروجہ آزاری، اہل کاران دولت کی دولت ستانی، ذمہ داروں کی غفلت کی طرف توجہ دلائی اور خدا کا خوف دلا کر اور پچھلے وزراء اور صدور حکومت کا انجام یاد دلا کر اصلاح و تنظیم کی طرف متوجہ کیا، ان کے خطوط شخصی جرأت، انہماج اور تاثیر و قوت انشاء و تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

فخر الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”بدان کہ ایں شہر از قحط و ظلم و یران بود و تاخیر قوا از اسفرائین و دامغان بود ہمہ می ترسیدند و ہفتانہ از بیم غلامی فروختند و ظالمان از مظلومان عذری خواستند اکنون کہ اینجا رسیدی ہمہ ہر اس و خوف بر قات و دہقانان و خجاندان تبدیل بر غلامان دوکان نہادند و ظالمان دیگر گشتند اگر کسی کار ایں شہر بخلاف ایں شکایت می کند دشمن دین تست، بدان کہ دعائے مردمان طوس بہ نیکی و بدی مجرب است و عجب در ایں نصیحت بسیار کہ دم پذیرفت تا حال دے عبرت ہمہ گشت بشو ایں سخنہائے تلخ با منفعت از کسی کہ او طبع گاہ خویش را بہم سلاطین و دواع کردہ است تا ایں سخن می تواند گفت و قدر ایں بشارت کہ نہ ہمانا از کسے دیگر تنویری

لے مکتوبات امام غزالی ص ۱۹۱ لے یہ ہدایت نامہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے، اور نصیحت الملوک کے نام سے موسوم ہے

چونکہ محمد شاہ کی زبان فارسی تھی، اس لئے یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔

بدانکہ ہر کس کو خبر ایسی گویا با تو طبع دے حجاب است میان او و کلہ ریحی

مجر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”اما فریاد رسیدن خلق بر عیون و احباب است کہ کار ظلم از حد گذشتہ و بعد از ان کہ من شاہد این حال

می بودم قریب یک سال است کہ از طوس ہجرت کردہ ام تا بآنکہ از شاہدہ ظالماں بے رحمت

و بے رحمت خلاص یام چون حکم ضروری معاودت افتاد ظلم بچنان متواتر است“

پھر وزیر اسبقین کا انجام لکھ کر مجیر الدین کو متنبہ کرتے ہیں۔

”و بحقیقت شناسد کہ ہیچ وزیر بدیں بلا مبتلا نہ بود کہ فی درد روزگار ہیچ وزیر آن ظلم و خرابی نہ

رفت کہ اکنون می رود، و اگر چہ فی کارہ است و لیکن در خبر چنین است کہ چون ظالماں را روز قیامت

مواخذہ کنند ہم متعلقاں را ہم ایشاں را بدن ظلم بگیرند، مسلماناں را کار با ستواں رسیدت اگل گشتند

و ہر دینارے کہ قسمت کردند اضعاف آن از رحمت بشد و سلطان ز رسید در میانہ ازال عواماں و

ظالماں بردند“

مسلمانوں کے دوسرے طبقے

طبقہ علماء و طبقہ سلاطین و حکام کے علاوہ انھوں نے عام زندگی کا بھی جائزہ دیا ہے اس میں جس قدر

غیر دینی عناصر بدعات و منکرات، مغالطے اور خود فریبیاں داخل ہو گئی ہیں ان کی تنقید کی ہے احیاء العلوم

کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال اور عالمانہ زندگی کے باوجود وہ اس وقت کی سوسائٹی اور

عام زندگی سے واقف ہیں اور ان کا زندگی کا مطالعہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے انھوں نے مسلمانوں کی عمومی

زندگی اور امت کے مختلف طبقات اور ان کی مختلف بیماریاں اور کمزوریوں کی جو نشاندہی کی ہے اس سے

ان کی قوت مشاہدہ اور قوت نظر کا اندازہ ہوتا ہے انھوں نے ایک مستقل باب ان منکرات کی تفصیل میں

لکھا ہے جو عادات میں داخل ہو چکے ہیں اور لوگوں کو ان کا منکر (خلافت شرع و اخلاق) ہونا محسوس نہیں ہوتا، اس سلسلہ میں انھوں نے پوری شہری زندگی پر نظر ڈالی ہے اور اس کے نمایاں منکرات کا تذکرہ کیا ہے اور مساجد سے لے کر بازاروں، سڑکوں، حمام اور دعوت کی محفلوں تک کے منکرات کو شمار کر دیا ہے۔ انھوں نے احیاء العلوم کا ایک مستقل حصہ (کتاب فی الغرور) ان لوگوں کے متعلق لکھا ہے جو مختلف قسم کے مغالطوں اور فریب نفس میں مبتلا ہیں اس سلسلہ میں انھوں نے ہر طبقہ کے فریب خوردہ اشخاص اور ان کی غلط فہمیوں اور خود فریبیوں کا حال بیان کیا ہے اور ان کے بعض ایسے نفسیاتی امراض اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے جن کو صرف ایک دقیق النظر مصلح اور ایک تجربہ کار ماہر نفسیات ہی دیکھ سکتا ہے اس باب میں انھوں نے صلابت و جادہ اذام اور اغیار اور اہل تصوف سب کا جائزہ لیا ہے اور سب کے خصوصی امراض اور بے اعتدالیوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ہر ایک کے متعلق بڑے پتہ کی باتیں لکھی ہیں جس سے ان کی ذہانت و دقیقہ رسی اور حقیقت شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے زمانہ کے علمائے جن جن علوم کے اشتغال میں حد سے تجاوز کر رکھا تھا مثلاً فقہی جزئیات و خلافیات علم کلام و مباحثہ و مجادلہ و حفظ و تذکرہ علم حدیث اور اس کے متعلقات نحو، لغت، شعر و مفردات کی تحقیق و حفظ میں غلو و مبالغہ اور زاہدوں کے لمفوعات و حالات کے یاد رکھنے پر لگنا اور اس سب پر انھوں نے تنقید کی اور ان کو اپنے ان مضامین کے بارہ میں جو غلط فہمی اور خوش گمانی تھی اس کی تحقیق کی اور حقیقت حال بیان کی اور آخر میں اپنا یہ تجربہ بیان کیا، جو بالکل قرین قیاس ہے کہ دنیاوی علوم مثلاً طب و حساب اور محنتوں کے علم میں اس قدر خوش گمانی اور خود فریبی نہیں ہے جتنی علوم شرعیہ میں ہے اس لئے کہ کسی شخص کا یہ خیال نہیں ہے کہ دنیاوی علوم فی نفسہ ذریعہ مغفرت ہیں، بخلاف علوم شرعیہ کے کہ وہ اپنے نتائج و مقاصد سے قطع نظر کر کے بجائے خود بھی ذریعہ مغفرت و تقرب سمجھ جاتے ہیں، اپنے زمانہ کے مجاہد و زاہد اور اہل تصوف

کو بھی انھوں نے بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور ان کی بڑی باریک باریک کوتاہیوں خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کو محسوس کیا ہے، ان کے بہت سے ظاہری اعمال و رسوم کی تہ میں ان کو نفس پرستی، جاہ طلبی، ریا کاری، ظاہری نقالی اور بے روح رسمیت نظر آئی ہے، اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ اس کو ظاہر کر دیا۔ اہل دولت اور اغنیاء پر بھی انھوں نے بڑی صحیح گرفت کی ہے، اور اس سلسلہ میں ان کے قلم سے حقائق نکل گئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں:-

”ان دولت مندوں میں بہت سے لوگوں کو حج پر روپیہ صرف کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے، وہ بار بار حج کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھوکا بھیوڑ دیتے ہیں، اور حج کرنے چلے جاتے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحیح فرمایا ہے کہ اخیر زمانہ میں بلا ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہو گئی، سفر ان کو بہت آسان معلوم ہو گا، روپیہ کی ان کے پاس کمی نہ ہوگی، وہ حج سے محروم و تہی دست واپس آئیں گے، وہ خود ریتوں اور چٹیل میدانوں کے درمیان سفر کرتے ہوں گے، اور ان کا ہمسایہ ان کے پہلو میں گرفتار بلا ہوگا، اس کے ساتھ کوئی سلوک اور غنچاری نہیں کریں گے۔

ابو نصرؒ تار کہتے ہیں کہ ایک شخص بشر بن الحارث کے پاس آئے اور کہا کہ میرا قصد حج کا ہے، آپ کا کچھ کام ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تم نے خرچ کے لئے کیا رکھا ہے؟ اس نے کہا دو ہزار درہم، بشر نے کہا کہ تمہارا حج سے مقصد کیا ہے؟ اظہار زہد یا شوق کعبہ یا طلب رضا، اس نے کہا طلب رضا انھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر میں تمہیں ایسی تدبیر بتا دوں کہ تم گھر بیٹھے اللہ کی رضا حاصل کر لو، اور تم یہ دو ہزار درہم خرچ کر دو، اور تم کو یقین ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہوگی تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا بخوشی فرمایا کہ اچھا پھر جاؤ، اس مال کو ایسے دس آدمیوں کو دے آؤ جو مقروض ہیں، وہ اس سے اپنا قرض ادا کر دیں، فقیر اپنی حالت درست کرے، صاحب حمال اپنے بال بچوں کا سامان کرے، یتیم کا منظم یتیم کو کچھ دے کر اس کا دل خوش کرے اور

اگر تمہاری طبیعت گوارا کرے تو ایک ہی کو پورا مال دے اور اس لئے کہ مسلمان کے دل کو خوش کرنا، بیکس کی آمد کو کسی کی مصیبت دور کرنا، کمزور کی اعانت سونفلی جوں سے افضل ہے، جاو جیسا میں تم سے کہا ہے ویسا ہی کر کے اور نہ اپنے دل کی بات ہم سے کہہ دو، اس نے کہا کہ شیخ سچی بات یہ ہے کہ سفر کا رجحان غالب ہے، بشر سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ مال جب گندہ اور مشتبہ ہوتا ہے تو نفس تقاضا کرتا ہے کہ اس سے اس کی خواہش پوری کی جائے اور وہ اس وقت اعمال صالحہ کو سامنے لاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد فرمایا ہے کہ صرف متقین کے عمل کو قبول فرمائے گا۔^{۱۵}

دولت مندوں کا ایک گروہ بر بنائے نفل دولت کی حفاظت میں مشغول رہتا ہے، اور ایسی بدنی عبادت اس کو دھسپی ہوتی ہے جس میں کچھ خرچ نہیں، مثلاً دن کا روزہ، رات کی عبادت اور تم قرآن وہ بھی فریب میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ مہلک نفل ان کے باطن پرستولی ہے، اور اس کے ازالہ کے لئے مال کے خرچ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن وہ ایسے اعمال میں مشغول ہیں جس کی ان کو کوئی خاص ضرورت نہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کے کپڑے کے اندر سانپ گھس گیا ہے، اور اس کا کام تمام ہونے والا ہے، اور وہ سکنجین کے تیار کرنے میں مشغول ہے، تاکہ صفر کو تسکین ہو، حالانکہ جو سانپ کا مارا ہے، اس کو سکنجین کی ضرورت کب پڑے گی؟ بشر سے کسی نے کہا کہ فلاں دولت مند کثرت سے روزہ رکھتا ہے، اور نمازیں پڑھتا ہے، انھوں نے فرمایا کہ بیچارہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں مشغول ہے، اس کے مناسب حال تو یہ تھا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا، مساکین پر خرچ کرتا، یہ اس سے افضل تھا کہ اپنے نفس کو بھوکا رکھتا ہے اور اپنے لئے (نفلی) نمازیں پڑھتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دنیا بھی سمیٹنے میں مشغول ہے، اور فقیر کو محروم رکھتا ہے۔^{۱۶}

عوام کے امراض اور خود فریبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”عوام دولت مندوں اور فزادین سے کچھ لوگ ہیں جن کو مجالس وعظ کی شرکت سے دھوکا لگا ہے، ان کا اعتقاد ہے کہ محض ان مجالس میں شرکت کافی ہے، انھوں نے اس کو ایک معمول بنالیا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ عمل اور نصیحت پذیری کے بغیر بھی مجلس وعظ میں شرکت باعث اجر ہے، وہ بڑے دھوکہ میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ مجلس وعظ کی فضیلت محض اس لئے ہے کہ اس سے خیر کی ترغیب ہوتی ہے، اگر اس سے خیر کی آگاہی اور اس کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تو اس میں کچھ خیر نہیں، رغبت بھی اس لئے محمود ہے کہ وہ محل کی حرکت ہے، اگر اس میں عمل پر آمادہ کرنے کی قوت نہیں تو اس میں بھی کوئی خیر نہیں، جو بجز کسی مقصد کا ذریعہ ہوتی ہے اس کی قیمت محض مقصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو تو وہ بے قیمت ہے، کبھی واعظ سے مجلس وعظ اور گریہ و بکا کی فضیلتیں سن کر اس کا دھوکا ہوتا ہے، کبھی کبھی اس پر عورتوں کی طرح ایسی رقت طاری ہوتی ہے، اور وہ رونے لگتا ہے، لیکن عزم کا کبھی پتہ نہیں ہوتا، کبھی کبھی کوئی ڈرنے والی بات سنتا ہے اور وہ تالیاں پیٹتا ہے، اور کہتا ہے، الہی توبہ! خدا تیری پناہ، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا، حالانکہ وہ دھوکہ میں ہے، اس کی مثال اس مرض کی کسی ہے، جو کسی طبیع کے مطب میں بیٹھتا ہے، اور نسخے سنتا رہتا ہے، لیکن اس سے اس کو صحت نہیں ہو سکتی، یا ایک بھوکا آدمی کسی سے کھانے کے انواع و اقسام کی فہرست سنتا ہے، اس صحت کی بھوک نہیں مٹ سکتی، اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا، اسی طرح سے طاعات و اعمال کی تشریک و تفصیل کا سنتے رہنا اللہ کے یہاں کچھ کام نہیں آئے گا، اسی طرح سے ہر وعظ جو تمہاری حالت میں ایسا تغیر نہ پیدا کرے جس سے تمہارے اعمال میں تغیر ہو جائے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف اتنا ہمت اور رجوع (قوی ہونا ضعیف) پیدا ہو، اور دنیا سے بے رغبتی اور اعراض پیدا ہو، وہ وعظ تمہارے لئے وبال اور تمہارے خلاف ایک دلیل کا کام دے گا، اگر تم خالی فونی وعظ کو وسیلہ نجات اور ذریعہ مغفرت سمجھتے ہو تو دھوکہ میں۔“

ایک اصلاحی و تربیتی کتاب

لیکن احیاء العلوم نری تنقیدی کتاب نہیں ہے، وہ اصلاح و تربیت کی ایک جامع اور مفصل کتاب ہے، اس کے مصنف نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کی کوشش کی ہے، جو ایک طالب حق کے لئے اپنی اصلاح و تربیت اور دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کے لئے تنہا کافی ہو سکے اور بڑی حد تک ایک وسیع اسلامی کتب خانہ کا قائم مقامی کر سکے اور دینی زندگی کا دستور العمل بن سکے، اس لئے یہ کتاب عقائد و فقہ، تزکیر نفس و تہذیب و خلاق اور حصول کیفیت احسانی (جس کے مجموعہ کا نام تصوف ہے) تینوں شعبوں کی جامع ہے اس کتاب کی ایک نمایاں صفت اس کی تاثیر ہے، مولانا شبلی کے اس تاثر میں ہزاروں پڑھنے والے شریک ہوں گے کہ ”احیاء العلوم“ میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چھب جاتا ہے، ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی، خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے، مصنف کے ان حالات و کیفیات کا (جو اس سفر اور کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ان پر طاری تھیں) اور جن سے یہ کتاب متاثر ہوئی ہے، پڑھنے والوں پر بعض اوقات یہ اثر پڑتا ہے کہ دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو جاتا ہے، زہد و تقشف کا ایک شدید اور بعض اوقات غیر معتدل رجحان پیدا ہوتا ہے، خوف و ہیبت کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو کبھی کبھی صحت و مشاغل پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ خود مصنف پر اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہیبت کا غلبہ تھا، اس لئے بہت سے مشائخ و بندگان کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ نہیں دیتے، اعتدال کامل اور توازن صحیح تو صرف سیرت نبویؐ اور احادیث اہل امام غزالی چونکہ شافعی ہیں اور فقہ شافعی کا اس زمانہ میں زور بھی تھا، اس لئے اس کتاب میں انھوں نے فقہ شافعی ہی کو

کے مجموعہ کے مطالعہ اور کسی نمونہ کمال کی صحبت و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

احیاء العلوم اور فلسفہ اخلاق

امام غزالی صرف ایک بلند پایہ فقیہ، ایک صاحب اجتہاد متکلم اور ایک صاحبِ دل صوفی نہیں ہیں، اخلاقیات اسلامی اور فلسفہ اخلاق کے ایک نامور مصنف اور ایک دقیق النظر اور نکتہ رس ماہر اخلاق و نفسیات بھی ہیں، اخلاق اسلامی اور فلسفہ اخلاق کی کوئی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، احیاء العلوم اس موضوع پر بھی ان کا ایک کارنامہ ہے، امراضِ قلب اور کیفیاتِ نفسانی پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی وقت نظر اور سلامتِ فکر کا نمونہ ہے، یہاں اس کا بھی ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

حبِ جاہ

احیاء العلوم میں ”بیان سبب کون الجاہ محبوباً بالطبع حتی لا یغلو عنه قلب لا یشدید المجاہدۃ“ (جاہ انسان کو کیوں طبعی طور پر محبوب ہے؟ یہاں تک کہ شدید مجاہدہ کے کسی قلب کا بھی اس سے خالی ہونا مشکل ہے) کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:-

”معلوم ہونا چاہئے کہ جس بنا پر سونا چاندی اور مال کی بقیہ اقسام محبوب ہیں البینۃ اسی بنا پر جاہ بھی محبوب ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سونا چاندی سے زیادہ محبوب ہے، خواہ وہ مقدار میں برابر ہی کیوں نہ ہوں اسی طرح جاہ کو مال پر فوقیت حاصل ہونا چاہئے، یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ درہم و دینار کی ذات میں کوئی کشش اور معنویت نہیں، اس لئے نہ وہ کھانے کے کام کے ہیں نہ پینے کے، نہ شادی بیاہ کے، نہ پوشاک لباس کے اپنی

لے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ استاد جامعۃ القاہرہ کی تصنیفات ”تاریخ الاخلاق“ اور ”فلسفۃ الاخلاق“

وصلاتہا بالفلسفۃ الآخریۃ“

ذات کے لحاظ سے تو وہ اور تکیاں برابر ہی ہیں، لیکن ان دونوں کی کشش اور محبوبیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ محبوبات کا ذریعہ اور خواہشات کی تکمیل کا سامان ہیں، یہی معاملہ جاہ کا ہے، اس لئے کہ جاہ دلوں کی تسخیر کا نام ہے، اور جن طرح سے سونے چاندی کی ملکیت ایسی قدرت عطا کرتی ہے جس سے انسان اپنے تمام اغراض و مقاصد تک پہنچ سکتا ہے، اسی طرح سے بندگان خدا کے قلوب کی تسخیر تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر سونا چاندی اور جاہ انسان کو محبوب ہے۔

لیکن محبوبیت میں شریک ہونے کے ساتھ جاہ کو مال پر کئی وجوہ سے ترجیح حاصل ہے، اور اس کی محبوبیت مال کی محبوبیت سے کمیں بڑھی ہوئی ہے، اس کے تین نمایاں اسباب ہیں، پہلا سبب تو یہ ہے کہ جاہ کے ذریعہ سے مال تک پہنچنا، مال کے ذریعہ سے جاہ تک پہنچنے کے مقابل میں آسان ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عالم بازار چرس کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بٹھا ہوا ہے، اگر مال حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں اس لئے کہ لوگوں کے مال و دولت ان لوگوں کے دلوں کے تابع ہوتے ہیں، اب اگر ان کے دل کسی کے تابع ہو جائیں تو ان کے مال بھی اسی کے تابع ہو جائیں گے، اور وہ اپنی دولت بھی اسی کے قدموں پر نشا کر دیں گے، اس کے برخلاف ایک کم مرتبہ اور ذلیل آدمی جس میں کمال کی کوئی صفت نہیں ہے، اگر اس کو کوئی خزانہ بھی مل جائے اور اس کو وہ جاہ حاصل نہیں ہے، جس سے وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے، اگر اس مال کے ذریعہ جاہ تک پہنچنا چاہے گا تو نہیں پہنچ سکے گا اس لئے کہ جاہ مال کا آراہ اور وسیلہ ہے، جو جاہ کا مالک ہے، وہ باسانی مال کا بھی مالک بن سکتا ہے، لیکن جو مال کا مالک ہے، وہ ہر حالت میں جاہ کا مالک نہیں بن سکتا، اس لئے جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مال کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی آزمائش میں آجائے، پوری یا غصب کے ذریعہ تلف ہو جائے، بادشاہ اور ظالم بھی اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں، یوں بھی اس کو کچا فٹوں پہرہ داروں اور محفوظ صندوقوں کی ضرورت ہے، پھر بھی اس کے لئے ہزار خطرے ہیں لیکن دل جب کسی کا غلام بن جائے

توان کے لئے کوئی آفت نہیں وہ دراصل محفوظ تر لے رہے ہیں، جو چوروں غارت گروں اور غاصبین کی دست رس سے باہر ہیں ملکیتوں میں سب محفوظ ملکیت زمین اور جائیداد ہے، لیکن اس میں بھی غاصبانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا خطرہ ہے، اور پھر وہ اور حفاظت کی اس کو بھی ضرورت ہے لیکن دلوں کے خزانے خود ہی محفوظ و مامون ہیں، اور جاہ کو کسی غصب سرقہ کا خطرہ نہیں ہاں دلوں پر بھی ٹھوڑا بہت تصرف کیا جاسکتا ہے، اور جس سے عقیدت مندی ہے، اس کی طرف سے اعتقاد پھیرا جاسکتا ہے اور بدگمانی پیدا کی جاسکتی ہے، لیکن اس کا ازالہ مشکل نہیں اور ایسا عمل ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی ملکیت میں از دیاد و نمود اور اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور اس کے لئے کسی محنت و جفاکشی کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ قلوب جب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے حلقہ بگوش اور حقد ہو جاتے ہیں تو زبانیں اس کے کلمات کا کلمہ بڑھنے لگتی ہیں، لوگوں و مسروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں، اور نئے نئے دل اس کے مفتوح ہوتے جاتے ہیں، اسی بنا پر انسان طبعی طور پر شہرت اور ناموری کا دلدادہ ہے، اس لئے کہ جب اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتا ہے، نئے نئے دل شکار ہوتے ہیں، اور اس کے حلقہ بگوش بنتے ہیں، اسی طرح اس کی محبت و عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی، اور بڑھتی رہتی ہے، اور کہیں جا کر کئی نہیں برخلاف مال کے کہ جو جتنی مقدار کا مالک ہے اس کا مالک ہے، اس میں بغیر محنت و محنت اور جانفشانی کے اضافہ نہیں ہو سکتا، لیکن جاہ خود بخود نمود پزیر ہے، اور اس کی کوئی حد نہیں، مال میں ٹھہراؤ اور وقوف ہے، جاہ پھلتا پھوٹتا رہتا ہے، اسی لئے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے، اور شہرت عام حاصل ہو جاتی ہے، اور لوگ کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں تو مال دولت اس کی نظر میں جمع ہو جاتا ہے، یہ تو مال کی جاہ پر ترجیح کے نمایاں اسباب ہیں، اگر تفصیل کی جائے تو اور بہت سے وجوہ نکلیں گے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ ہے کہ انسان کو مال و جاہ سے اسی قدر محبت ہونی

چاہئے کہ ان کے ذریعہ لذتیں حاصل کر کے اور کھفتیں دور کر دے، اس لئے کہ مال و جاہ محبوبہ کا ذریعہ ہیں، اور محبوبات کے حصول کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ بات یہیں جا کر نہیں رکتی اور انسان اموال کے جمع کرنے، خزانہ پر خزانہ اور ذخیرہ پر ذخیرہ کرنے میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ضروریات کی سرحد کو بھی پار کر جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہو جاتا ہے (جو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے) کہ اگر بندے کے پاس سونے کی دو گھاٹیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہشمند ہو گا اسی طرح سے انسان جاہ میں وسعت و ترقی کی فکر میں رہتا ہے، اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت ان دور دراز ملکوں تک بھی پہنچ جائے، جن کے متعلق وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ ان ملکوں میں کبھی قدم بھی نہیں رکھے گا، اور کبھی وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کی بھی امید نہیں کہ ان کی تعظیم سے اس کو خوشی حاصل ہوگی یا وہ اپنی دولت اس پر خرچ کریں گے، یا اس کی غرض برآری کریں گے، یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو ایسی بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے، اور دل میں اس کا مزہ لیتا رہتا ہے کہ اس کا ان ملکوں میں چرچا ہو، اور اس کو وہاں جاہ حاصل ہو، بظاہر یہ ایک حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز کی خواہش ہے جس کا دنیا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی جاہ کی ایسی محبت دلوں کی ایک عمومی کیفیت ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں اس کے دو سبب ہیں، ایک، جلی جس کا ادراک سب کر سکتے ہیں، ایک، مخفی جوڑا سبب ہے، لیکن اتنا نازک ہے کہ مخفی تو مخفی ذکی بھی اس کو مشکل محسوس کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اس کا تعلق نفس و طبیعت کی ایک ایسی خاصیت ہے جس کا علم ہر ایک میں اور ان اشخاص کو ہے جو طوائف انسانی کی گہرائیوں میں غوطہ کھا سکتے ہیں پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان فطرۃً محبوب کے بارہ میں بدگمان اتع ہوئے اور خطرات کو دور کرنا چاہتا ہے

عشق است و ہزار بدگمانی

انسان کی بسراوقات کے لئے خواہ ضروری سامان موجود ہو، لیکن اس کی آرزو کی بہت

طویل ہوتی ہیں، اس کے دل میں بار بار بیخبرہ گزرتا ہے کہ جو مال فی الحال اس کی ضروریات کے لئے کافی ہے شاید تلف ہو جائے اور اس کو دوسرے مال کی ضرورت ہو، جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو اس کے دل میں فکر و غم کا جوش اٹھتا ہے، غیظ اس کی بھی دور ہو سکتی ہے، جب اس کو دوسرے مال کے مل جانے سے اطمینان حاصل ہو جائے کہ اگر یہ پہلا مال ضائع ہو گیا، یا اس پر کوئی آفت آئی تو یہ دوسرا مال موجود ہے، اپنی ذات سے کسی اور زندگی کی محبت کی بناء پر اپنی زندگی کا بہت طویل اندازہ لگاتا ہے، اور نئی نئی ضرورتوں کے پیش آنے کا حق رکھتا ہے، اور نئے نئے خطروں اور نئی نئی آفتوں کو فرض کرتا رہتا ہے، اور ان کے تصور سے لرزہ بر اندام رہتا ہے، اس لئے ان خطروں کو زائل کرنے کے وسائل سوچتا رہتا ہے، اور اس کا سب سے بڑا وسیلہ اس کی نظر میں یہ ہے کہ مال اتنا کثیر ہو کہ اگر اس کے کسی حصہ پر کوئی زد پڑے تو دوسرے حصہ سے وہ اپنا کام نکال سکے، یہ خوف اور فکر مندی اس کو مال کی کسی مخصوص مقدار پر قانع نہیں ہونے دیتی، اور وہ کسی حد پر بھی جا کر نہیں ٹھہرتا، یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی ملک بنا لینے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”دو دریں ایسے ہیں، جو کبھی سیر نہیں ہوتے، علم کا حریص، اور مال کا حریص، بعینہ یہی مملکت دور دراز کے شہروں اور بیگانہ لوگوں کے دلوں میں اعتقاد اور جاہ پیدا ہونے کی خواہش میں ہوتی ہے، حب جاہ کا مرعہ بھی ان خیالی خطرات کو سوچتا رہتا ہے، جو پیش آ سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے وطن کو خیر یا دکھنا پڑے، ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کے شہر میں آجائیں اور اس کو ان سے کام پڑ جائے، اور جب تک یہ سب کچھ ممکن ہے اور یہ کوئی ناممکن الوقوع بات نہیں ہے کہ اس کو ان کی ضرورت پڑے، نفس کو اس بات کی فرحت و لذت ہوتی ہے کہ اس کا اعتقاد اور مملکت ان بعید الوطن لوگوں کے دل میں قائم ہے جن سے کبھی کام پڑ سکتا ہے۔

دوسرا سبب جو زیادہ طاقت ور ہے، وہ یہ کہ روح ایک مریبان ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے
 "وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرَّفْجِ قُلِ الرَّفْجُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" حکم ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم
 مکاشفہ کے اسرار میں سے ہے، اور اس کے اظہار کی اجازت نہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی
 حقیقت کا اظہار نہیں فرمایا، لیکن اس کی حقیقت کا علم حاصل کئے بغیر بھی تم کو اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ
 قلب میں ایک تو ایسی صفات (کھانے پینے اور جماع) کا میلان پایا جاتا ہے، ایک میلان درندوں کی صفات
 قتل و ضرب و ایذا کا، اور ایک شیطانی صفات کروفریہ کا اور اسی کے ساتھ ایک میلان صفات ربوبیت
 کبر و عظمت، عزت و تجبر اور سر بلندی کا بھی پایا جاتا ہے، اس لئے کہ قلب انسانی مختلف اصول و عناصر
 سے مرکب ہے، جن کی شرح و تفصیل میں بڑی طوالت ہے، قلب میں امر ربانی کا جو حصہ ہے اس کی بنا پر انسان
 کے اندر طبعی طور پر ربوبیت کی خواہش پائی جاتی ہے، ربوبیت کیا ہے؟ کمال میں کیتائی اور مستقل وجود جو
 کسی کا شرمندہ احسان نہ ہو، اس لئے کمال صفات الوہیت میں سے ہے، اور وہ انسان کو باطریق محبوب ہے
 اور کمال یہی ہے کہ وجود میں کیتا ہو، اس لئے کہ وجود میں کسی اور کی شرکت یقیناً ایک نقص ہے، آفتاب کا
 کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے، اگر کوئی دوسرا آفتاب ہوتا، تو یہ اس آفتاب کے چہرہ کمال کے لئے داغ
 ہوتا، اس لئے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں کیتا نہ ہوتا اور وجود کی کیتائی اللہ تبارک تعالیٰ ہی کو حاصل
 ہے، اس لئے اس کے سامنے کوئی موجود (حقیقی) نہیں، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، وہ اس کی قدرت کا
 ایک کرشمہ ہے، جو اپنے بل بوتے پر نہیں رہ سکتا، وہ اسی کے سہارے قائم ہے، تو وہ حقیقت اس کے
 سامنے کوئی موجود ہی نہیں، اس لئے کہ سمیت کے لئے رتبہ کی مساوات ضروری ہے، اور رتبہ کی مساوات
 کمال کے لئے نقص ہے، کامل وہی ہے، جس کا کوئی ہم مرتبہ نہ ہو، اور جس طرح سے آفتاب کے نور کی تابش
 آفاق عالم میں آفتاب کا نقص نہیں، بلکہ اس کا کمال ہے، آفتاب کے لئے نقص تو دوسرے ہم مرتبہ آفتاب کا
 وجود ہے، جبکہ اس کی ضرورت بھی نہیں، اسی طرح سے عالم میں ہر چیز کا وجود انوار قدرت کی تابش کا فیض

ہے، یہ سب تالچ ہیں، متبوع نہیں، پس ربوبیت کی شان وجود کی یکتائی ہے، اور یہی کمال ہے، انسان بھی بالطبع اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ کمال میں یکتا ہو، بعض مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کے باطن میں وہی بات مضمر ہے جس کو فرعون نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "اَنَا رَبُّكُمْ الْأَخْلَ" لیکن اس کو اس کا موقع نہیں ملتا، جمودیت نفس اسی لئے نفس پر شاق اور ربوبیت اسی لئے طبعاً سہل اور مرغوب ہے یہ اسی نسبت ربانی کی وجہ سے ہے، جس کی طرف مَعْقِلُ الرَّسُولِ مِنْ أَمْرِ رَبِّیَ میں اشارہ ہے۔

لیکن جب انتہائے کمال تک پہنچنے سے عاجز رہا تو اس کے کمال کی خواہش بالکل زائل نہیں ہوئی، اب بھی وہ کمال کا خواہشمند اور متہمتی ہے، اور اس کو کمال سے بالذات لذت حاصل ہوتی ہے، کمال کے علاوہ کسی اور مقصود کی خاطر نہیں (جس کا کمال ذریعہ ہے) بلکہ نفس کمال کی خاطر دنیا میں جو بھی موجود ہے، اس کو اپنی ذات سے محبت اور اپنی ذات کے کمال سے محبت، اور ہر ایک کو ہلاکت اور فنا نامرغوب ہے، اس لئے کہ اس میں اپنی ذات اور اپنی صفات کمال کا فنا سمجھتا ہے، کمال تو یہی ہے کہ وجود میں یکتائی حاصل ہو اور تمام موجودات پر غلبہ اور حکمرانی، اس لئے کہ کامل ترین کمال یہ ہے کہ دوسرے کا وجود تمہارا ہی رہیں منت ہو، اگر وہ تمہارا رہیں منت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ تم اس میں غالب ہو، اس بنا پر سب پر غلبہ حاصل کرنا انسان کو طبعی طور پر محبوب ہے، اس لئے کہ یہ کمال کی ایک قسم ہے، ہر موجود جو اپنی ذات کا شناسا ہے، وہ اپنی ذات کا عاشق ہے، اور اپنی ذات کے کمال کا بھی عاشق ہے، اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، اگر کسی چیز پر غلبہ کے معنی میں یہی کمال اس پر اثر ڈال سکے تو اپنے ارادہ کے مطابق اس میں تغیر کر سکے اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرے، انسان نے چاہا تو یہ تھا کہ اس کو تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جائے لیکن موجودات میں کچھ موجود ایسے ہیں جو

لہ مولانا روم نے اس مضمون کو بیان کیا ہے:-

نفس مارا کمتر از فرعون نیست یک اور اعون مارا اعون نیست

کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے، جیسے اللہ کی ذات و صفات اور بعض موجود ایسے ہیں جو تغیر کو قبول کرنے میں، لیکن ان پر مخلوق کی کوئی دست رس نہیں، اور اس پر ان کا کوئی زور نہیں چلتا، جیسے افلاک کو اکبر، ملکوت، سماوات، نفوس، ملائکہ جن و شیاطین اور جیسے پہاڑ و سمندر اور ان کے بیچ کی چیزیں، تیسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنی قدرت سے تغیر کر سکتا ہے، جیسے زمین اور اس کے اجزاء و معدنیات، نباتات، حیوانات، اور انہی میں سے انسانوں کے دل بھی ہیں، جو بدن ہی کی طرح تاثر اور تغیر قبول کرتے ہیں، جب موجودات کی ایک قسم وہ ہوئی جن پر انسان تصرف کی قدرت رکھتا ہے، جیسے ارضیات، اور ایک وہ جن پر قدرت نہیں رکھتا، جیسے ذات الہی، ملائکہ، افلاک، تو انسان کے اندر اس کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کم سے کم آسمانوں کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے، ان کی حقیقت کو سمجھے، اور ان کے اسرار کو فاش کرے، اس لئے کہ یہ بھی ایک طرح کا غلبہ ہے، اس لئے جس کا پورا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے وہ علم کے ماتحت ہو جاتا ہے، اور عالم ایک طرح سے غالب کی شان رکھتا ہے، (گویا اس علم سے اس کے جذبہ حکومت و استعلاء کی کسی درجہ میں تسکین ہوتی ہے) اسی بنا پر اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، ملائکہ، افلاک، کو اکبر، عجائب، سموات، سیاروں اور سمندروں کے عجائبات و غیرہ کے علم کا شوق ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ ایک طرح کا تغلب ہی اور تغلب کمال کی ایک قسم ہے، اسی بنا پر تم دیکھتے ہو گے کہ جو شخص کوئی عجیب چیز بنا نہیں سکتا، وہ کم سے کم اس بنانے کا طریقہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے، (گویا اس طرح سے وہ صنعت کی خواہش کی تسکین کرتا ہے) جو شطرنج وضع کرنے سے عاجز ہے، وہ کم سے کم شطرنج کھیلنے کا طریقہ سیکھ لینا چاہتا ہے، اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ شطرنج کیسے بنائی گئی ہے، جو شخص کسی ہندسہ یا شعبہ یا جراثیم کے آئے کو دیکھتا ہے، اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسا آکر بنانے سے قاصر ہے، تو وہ اس کے بنانے کی کیفیت جاننا چاہتا ہے، اس کو اپنے اس عجز سے تکلیف اور علم کے کمال سے لذت حاصل ہوتی ہے، گویا وہ اس کی کمی اس سے پوری کرنا چاہتا ہے۔

دوسری قسم جس پر انسان قدرت حاصل کر سکتا ہے، جیسے ارضیات وغیرہ تو وہ طبعی طور پر ان پر غلبہ اور اتنی قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ان میں اپنی فشار کے مطابق تصرف کر سکے، ان کی بھی دو قسمیں ہیں، اجسام اور ارواح، اجسام تو روپیہ پیسے سامان ہے، ان کے بارہ میں تو انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو، وہ ان کو اٹھا بٹھا سکے، جس کو چاہے بے جس کو چاہے نہ دے، اس لئے کہ یہ قدرت ہے، اور قدرت کمال ہے، اور کمال صفات ربوبیت میں سے ہے، اور ربوبیت بالطبع محبوب، اسی لئے اس کو اموال کی محبت ہے، چاہے اس کو اپنے پہنچنے کھلنے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کبھی بھی اس کی ضرورت نہ ہو، اسی طرح سے غلام رکھنا، اور آزاد شریف لوگوں کو اپنا غلام بنانا خواہ زبردستی اور غلبے ہو، یہاں تک کہ ان کے اجسام اور ان کی ذات میں تصرف کر سکے، یعنی بیگار لے سکے، چاہے ان کے دل غلام نہ بنیں، اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے دل میں اس کا اعتقاد نہیں ہوتا، اور ان کو اس محبت نہیں ہوتی، لیکن کبھی محض غلبہ بھی محبت کا قائم مقام بن جاتا ہے، انسان کو ایسا وجہ اب بھی لذیذ اور عزیز ہے، جو زبردستی کی بنا پر ہو، اس لئے کہ اس میں قدرت کا اظہار ہوتا ہے، اور انسان اس کا دیوانہ ہے۔

دوسری قسم آدمیوں کے نفوس اور قلوب ہیں، اور یہ رے زمین کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور نفیس چیز ہے، اور انسان چاہتا ہے کہ اس کو ان قلوب پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے تاکہ وہ اس کے لئے مسخر ہو جائیں، اور اس کے ایک اشارہ پر کام کریں، اس لئے کہ اس میں غلبہ کا کمال پایا جاتا ہے، اور صفات ربوبیت سے مشابہت، قلوب صرف محبت سے مسخر ہوتے ہیں اور محبت کمال کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر کمال محبوب ہے، اور کمال اس لئے محبوب ہے کہ وہ صفا الہیہ میں ہے، اور صفا الہیہ انسان کو بالطبع محبوب ہیں، اس لئے کہ انسان میں ایک نسبت ربانی پائی جاتی ہے، اور یہ نسبت غیر فانی ہے، نہ موت اس کو ختم کر سکتی ہے، اور نہ مٹی اس پر قابو پا سکتی ہے، یہی نسبت ربانی ایمان و معرفت کا عمل ہے، وہی بقائے الہی تک پہنچنے والی ہے، اور وہی اس کے لئے کوشش کرنے والی ہے، جاہ کے معنی قلوب کا مسخر ہونا ہے، اور جس کے لئے قلوب مسخر

ہو گئے، اس کو ان پر قدرت و استیلا حاصل ہو گیا، اور قدرت و استیلا کمال ہے، اور کمال اوصافِ ربوبیت میں سے ہے، پس قلب کو جو چیز بالطبع محبوب ہے، وہ کمال ہے، خواہ علم سے حاصل ہو، خواہ قدرت سے، مال و جا بھی اسبابِ قدرت ہیں، اس لئے کہ وہ محبوب کا وسیلہ ہیں، اور محبوب کا وسیلہ بھی محبوب ہوتا ہے، پھر نہ معلوم کی کوئی انتہا ہے، نہ مقدورات کی کوئی انتہا ہے، اور جب تک کہ ایک چیز بھی دنیا میں باقی ہے، جو معلوم کی جاسکتی ہے، اور ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے، جس پر قدرت حاصل کی جاسکتی ہے، تو نہ شوق کو سکون آئے، اور نہ نقص کو زوال اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو چیزیں کبھی آسودہ نہیں ہو سکتے: ۱۔

محاسبہ نفس

کتاب کا موثر ترین حصہ وہ ہے، جہاں امام غزالی نصیحت اور ترغیب ترہیب پر قلم اٹھاتے ہیں، اور دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی عظمت، ایمان و عمل صالح کی ضرورت، اصلاح و تہذیب نفس کی اہمیت اور امراض قلبی و نفسانی کی مضرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اس موقع پر وہ بیک وقت ایک شیعہ بیان و اعطاء ایک نکتہ شناس حکیم اور ایک تجربہ کار و ماہر نفسیات معالج کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، جو اپنے مخاطبین کے حالات اور کمزوریوں اور ضرورتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی طرف سے ان سے بہتر و کالت کرتا ہے، اور بڑی قابلیت اور انصاف کے ساتھ ان کے عذر اور دلائل پیش کرتا ہے، پھر ایک ماہر مفسر و عالم نفسیات کی طرح ان میں سے ایک ایک کا جواب دیتا ہے، پھر ایک شفیق معالج اور ایک خیر خواہ مربی کی طرح ان کا علاج تجویز کرتا ہے، اس لئے ان کے مواعظ صرف و اعظانہ تاثیر ہی کا نمونہ نہیں، حکمت و بلاغت کا بھی نمونہ ہیں، ہر دور میں ہزاروں آدمیوں نے ان کے مواعظ و مکالمات سے فائدہ اٹھایا ہے، اور کثیر التعداد آدمیوں کی اصلاح و انقلاب کا ذریعہ بنے ہیں، کتاب کے آخری چوتھے حصہ (ربیع رابع) میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے، یہاں اس کا ایک قتل

پیش کیا جاتا ہے، جہاں انھوں نے نفس کو زبردستی کی ہے، اور پڑھنے والوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کو اپنے نفس سے کس طرح مکالمہ کرنا چاہیے اور منزلِ آخرت کے لئے کس طرح اس کو تیار کرنا چاہیے۔ المراجعة الساجدة فی توبیخ النفس ومعاتبہا“ عنوان کے تحت نفس سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

۱۔ اے نفس ذرا انصاف کر اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ ترین کھانا تیرے لئے مضر ہے تو نصیر کرنا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے، کیا انبیاء کا قول جن کو مہجرات کی تائید حاصل ہوتی ہے، اور فرمان الہی اور صحفِ سماوی کا مضمون تیرے لئے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے؟ جتنا کہ اس یہودی کا ایک قیاس و اندازہ عقل کی کمی اور علم کی کمی اور کوتاہی کے ساتھ تعجب ہے اگر ایک بچہ کہتا ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے تو بغیر دلیل طلب کیے اور سوچے سمجھے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے کیا انبیاء علماء اولیاء اور حکماء کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچہ کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے؟ یا جہنم کی آگ اس کی بیڑیاں، اس کے گرز، اس کا عذاب اس کا زقوم، اور اس کے آنکڑے اس کے سانپ، بچھو اور زہریلی چیزیں تیرے لئے ایک بچھو سے بھی کم تکلیف دہ ہیں جس کی تکلیف زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے کم رہتی ہے عقل مندوں کا شیوہ نہیں، اگر کہیں بہائم کو تیری حالت کا علم ہو جائے تو وہ تجھ پر ہنسیں اور تیری دانائی کا مذاق اڑائیں، پس اگر اے نفس! تجھ کو یہ سب چیزیں معلوم ہیں اور ان پر تیرا ایمان ہے تو کیا بات ہے کہ تو عمل میں تساہل اور ٹال مٹول سے کام لیتا ہے حالانکہ موت کیمیں گاہ میں نظر ہے کہ وہ بغیر مہلت کے تجھے اچکے جائے، اور فرض کر کہ تجھے سو برس کی مہلت بھی مل گئی ہے تو کیا تیرا خیال ہے کہ جس کو ایک گھائی طے کرنی ہے اور وہ اس گھائی کے نشیب میں اطمینان سے اپنے جانور کو کھلا رہا ہے وہ بھی بھی اس گھائی کو طے کر سکے گا، اگر تو یہ گمان رکھتا ہے تو تو کس قدر نادان ہے ایسے شخص کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے جو علم حاصل کرنے کی غرض سے پردیس کا سفر کرتا ہے، اور وہاں کئی سال بیکاری اور تعطیل میں گزار دیتا ہے اس خیال سے کہ وطن کی واپسی کے سال سب علم حاصل کرے گا، تو اس کی عقل پر ہنستا ہے اور اس کے

اس وہم کا مذاق اڑاتا ہے کہ علم و تفقہ اتنی قلیل مدت میں حاصل ہو جائے گا، یا تھکا کا منصب لغیر علم و تفقہ کے توکل کی برکت سے ہاتھ آجائے گا، پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آخر عمر کی کوشش مفید ہوتی ہے اور بلند درجات تک لے جاتی ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی آج کا دن تیری عمر کا آخری دن ہو تو اس دن تو اس کام میں کیوں مشغول نہیں ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے بتلا بھی دیا ہے کہ تجھے مہلت دے دی گئی ہے، تو پھر بھی عجلت کرنے سے کیا چیز مانع ہے اور آج کل آج کل کرنے کی کیا وجہ ہے، یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ تجھے اپنی خواہشات نفس کی مخالفت مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں محنت و مشقت ہے کیا تو اس دن کا منظر ہے جب خواہشات کی مخالفت تیرے لئے آسان ہو جائے گی، ایسا دن تو اللہ تعالیٰ نے مطلق پیدا ہی نہیں کیا اور نہ پیدا کرے گا جنت ہمیشہ ناگوار لوگوں اور مکارہ سے گھری ہے گی، اور مکارہ کبھی نفس کے لئے آسان نہیں ہو سکتے ایسا ہونا محال ہے کتنا ایسا ہوتا ہے کہ تو کہتا ہے کہ کل سے یہ کام کریں گے، تجھے معلوم نہیں کہ جو کل آپ کی ہے، وہ گذشتہ دن کے حکم میں ہے، جو کام تو آج انجام نہیں دے سکا، کل اس کا انجام دینا تیرے لئے اور بھی مشکل ہے، اس لئے کہ شہوت کی مثال ایک تناور درخت کی سی ہے جس کو آدمی اکھاڑنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اگر کوئی اس کے اکھاڑنے سے عاجز ہو گیا، اور اس نے اس کو کل پر رکھا تو اس کی مثال اس نوجوان کی سی ہے جس سے لیکن رخت اکھاڑا نہیں گیا، اور اس نے اس کام کو دوسرے سال کے لئے ملتوی کر دیا، وہ جانتا ہے کہ جتنا زمانہ گزرنے کا درخت تنگم اور اس کی جڑیں مضبوط اور وسیع ہو جائیں گی، اور اکھاڑنے والے کی کمزوری اور ضعف میں اضافہ ہوگا، ظاہر ہے کہ جس کو شاباب میں نہیں اکھاڑ سکا، اس کو بڑھاپے میں کیا اکھاڑے گا بڑھاپے کی ورزش اور محنت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے، بھڑیے کی تربیت و اصلاح ایک مذاہب، سرسبز شاخ چمک چھتی ہے، اور جھکائی جاسکتی ہے، جب کھ جائے گی، اور ایک زمانہ گزر جائے گا تو اس کا موڑنا ناممکن ہو جائے گا، پس اگر نفس اتوان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا، اور پہل انکاری سے کام لیتا ہے، تو تجھے کیا ہو گیا ہے کہ حکمت و دانش کا دعویٰ دار ہے، اس سے بڑھ کر حقائق اور کیا ہو سکتی ہے غالباً تو یہ کہے کہ انتقامت سے

روکنے والی چیز شہوت پرستی، اور آلام و مصائب پر بے صبری ہے، اگر یہی بات ہے تو تیری غباوت کتنی بڑھی ہوئی ہے، اور تیرا عذر کتنا لنگ ہے، اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ایسی لذت کیوں نہیں تلاش کرتا جو تمام کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو اور ابداً لذت کے لئے ہو، اور یہ نعمت جنت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے، اگر تو خواہشات کا حوصلہ ہے، اور تجھے لذت ہی عزیز ہے، تو ان کی خاطر بھی تجھے نفس کی وقتی خواہشات کی مخالفت کرنی چاہئے، اس لئے کہ بسا اوقات ایک لقمہ کئی نقیوں سے محروم کر دیتا ہے تیرا کیا خیال ہے، اس مریض کے بارے میں جس کو طبیعت نے صرف تین روز کے لئے ٹھنڈے پانی سے پرہیز بتایا ہو تاکہ وہ صحت حاصل کر سکے، پھر زندگی بھر ٹھنڈے پانی کا لطف اٹھائے، اس نے اس کو ضرر دار کر دیا ہو کہ ٹھنڈا پانی اس حالت میں اس کے لئے سخت مضر ہے، اگر اس نے بدر پرہیزی کی تو زندگی بھر اس ٹھنڈے پانی سے اس کو ہاتھ دھو لینا پڑے گا، اس وقت سچ سچ بلا عقل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا اس کو تین دن صبر کر لینا چاہئے، تاکہ زندگی آرام سے گزرے، یا اپنی خواہش پوری کر لینی چاہئے، پھر تین سو دن یا تین ہزار دن برابر اس نعمت محروم رہے؟ تین دن کی کبھی پوری عمر کے مقابل میں وہ حقیقت نہیں جو تیری پوری عمر کی ابداً آباد کی زندگی کے مقابل میں ہے (جو اہل جنت اور اہل جہنم کی مدت ہے) کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خواہشات نفسانی کے ضبط کرنے کی تکلیف طبقات جہنم میں عذابِ نار سے زیادہ سخت اور طویل ہے؟ جو شخص ایک معمولی تکلیف بھی نہیں برداشت کر سکتا، وہ عذابِ الہی کو کیسے برداشت کر سکتا ہے!

میں دیکھتا ہوں کہ تو دو وجہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے، ایک کفرِ خفی، اور ایک صیغہ حماقت کفرِ خفی یہ ہے کہ یوم حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے، اور ثواب عقاب سے تو ناواقف ہے، اور صیغہ حماقت اللہ تعالیٰ کی تدبیرِ مخفی، اور اس کے استدراج کا خیال کئے بغیر اس کے عفو و کرم پر اعتماد ہے، اس کے باوجود کہ تو روٹی کے ایک ٹکڑے، غلہ کے ایک انہ اور زبان سے نکلے ہوئے ایک کلمہ کے لئے خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار

نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حصول کے لئے ہزار حق کرتا ہے، اور اسی جہالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے کہ "الکلیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والا حق من اتبع نفسه" (ہو شیار وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے، اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگا دے اور اللہ پر ازوں میں باندھتا ہے) افسوس اے نفس! تجھ کو زندگی کے دام ہمرنگی میں سے ہو شیار رہنا چاہئے تھا، اور شیطان سے فریب میں کھانا چاہئے تھا، تجھے اپنے اوپر ترس کھانا چاہئے تجھے اپنی ہی فکر کا حکم دیا گیا ہے، دیکھ تو اپنے اوقاف ضائع نہ کر، تیرے پاس گنی چنی سانس ہیں اگر تیری ایک سانس بھی راگ لگائی تو گویا تیرے سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہو گیا پس غنیمت سمجھ صحت کو مرض سے پہلے، فراغت کو مصروفیت سے پہلے، دولت کو غربت سے پہلے، شباب کو ضعفی سے پہلے، زندگی کو ہلاکت سے پہلے اور آخرت کے لئے تیاری کر، اسی محاذ سے جتنا تجھے وہاں رہنا ہے اے نفس! کیا جب موسم سرما سر پر آجاتا ہے تو اس پوری مدت کے لئے کو تیاری نہیں کرتا، خوراک کا ذخیرہ، لباس کی ضروری مقدار اور ایندھن کا ایک ڈھیر جمع نہیں کر لیتا، تو تمام ضروری سامان جاڑے کا میا کر لیتا ہے اور اس بھروسہ پر نہیں رہتا کہ ببادہ بڑا اول اور ایندھن کے بغیر جاڑا گزار دے گا، اور تجھ میں اس کی طاقت ہے کیا تیرا گمان ہے کہ جہنم کی زہریلے جاڑوں کی سخت سردی سے کم ہے ہرگز نہیں، اور اس کا کوئی امکان نہیں، شدت و برودت میں ان دونوں کے درمیان کوئی تناسب نہیں، کیا تو سمجھتا ہے کہ تو بغیر سعی کے اس سے نجات حاصل کر لے گا، جیسے کہ سردی بغیر اون کی کپڑے ببادہ آگ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بغیر نہیں جانی، اسی طرح دوزخ کی گرمی اور سردی تو حید کے قلعہ اور طاعون کے خندق کے بغیر نہیں جاسکتی، اور اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہے کہ اس نے تجھے حفاظت کی تدابیر سے آگاہ کر دیئے اور اسباب آسان کر دیئے ہیں، اس کا کرم یہ نہیں کہ وہ سرے سے عذاب ہی کو نال دے، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے، وہ جاڑا پیدا کرتا ہے تو اس کے لئے آگ بھی پیدا کرتا ہے اور تجھے حقیق کے طریق پر

پتھر و سنگ اگ بکالنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے کہ تو ان طریقوں سے فائدہ اٹھائے، اور اپنے کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھے اور جیسے کہ کلاسی خریدنا اور ادنیٰ کپڑے حاصل کرنا، خدا کی ضرورت نہیں انسانوں کی ضرورت ہے اسی طرح طاعت و عبادت بھی خدا مستغنی ہے، اور یہ تمہارا فریضہ ہے کہ اس کے وسیلہ سے نجات حاصل کرو، ”مَنْ أَحْسَنَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَادَّبَهُ عَنِّي عَنِ الْعَالَمِينَ“ (جس نے اچھائی کی تو اپنے نفس کے لئے اور جس نے برائی کی، اس کا بوجھ بھی اسی پر ہے، اور اللہ جہان والوں سے بے پرواہ ہے) تیری خرابی ہوئے نفس اجمالت کی قبا چاک کر اور اپنی آخرت کو اپنی دنیا پر تیا س کر ”فَمَا خُلِقْتُمْ وَلَا تَبْتَغُوا إِلَّا كَفْتُمْ“ تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا برپا کرنا ایک جان کا طرح ہے ”مَا كُنَّا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ يُضِلُّونَ“ (جیسے ہم نے پیدا کیا تھا پھر اُسے دھراتے ہیں ہما بَدَأْنَا آخِرَ نَعْمٍ دُونَ“ (جیسے اس نے تم کو ابتداؤ پیدا کیا تھا، ویسے ہی پھر تم واپس ہو جاؤ گے)۔

احیاء کے ناقد

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے احیاء العلوم کی اجمالی تعریف و اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”کلامہ فی الاحیاء غالبہ جید“ (احیاء میں عموماً ان کا کلام اچھا ہے) اس کے ساتھ وہ چار باتوں میں اس کتاب پر تنقید کرتے ہیں ان کی پہلی تنقید اس پر ہے کہ اس میں فلاسفہ کے بہت سے اقوال آگئے ہیں اور توحید، نبوت اور محاد متعلق ان کے بعض خیالات و بیانات شامل ہو گئے ہیں، ان کے نزدیک امام غزالی فلاسفہ کے اثرات سے ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے ہیں وہ اگرچہ ان کے بڑے ناقد اور مخالف ہیں مگر ان کی تصنیفات میں ان کے خیالات کی (غیر شعوری طور پر) کہیں کہیں جھلک جاتی ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی جس فلسفہ و فلاسفہ کے بارہ میں چونکہ بہت تیز ہے اس لئے کچھ عجیب نہیں کہ ان کے معیار سے امام غزالی کی بعض چیزیں فلسفہ سے متاثر ہوں۔

دوسری تنقید یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے کلامی مباحث ہیں، جو ابن تیمیہؒ کے نزدیک کتابِ سنت کی روح کے پورے طور پر مطابق نہیں ہیں، اور ان کے معیار پر پورے نہیں اُترتے، تیسری تنقید یہ ہے کہ اس میں اہل تصوف کے بعض تشددانہ اقوال اور مغالطے ہیں، چوتھی چیز یہ ہے کہ احیاء میں بہت سی ضعیف احادیث و آثار ہیں، بلکہ موضوع روایات تک ہیں، اس کے باوجود شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں :-

وفيه مع ذلك من كلام المشايخ الصوفية
العارفين المستقيمين في اعمال القلوب
الموافق للكتاب والسنة ما هو اكثر مما
يرد منه فلهذا اختلف فيه اجتهاد
الناس وتنازعوا فيه^۱

اس کے باوجود احیاء میں ان مشائخ صوفیہ کا جو صواب
مرفوع انتقامت تھے اعمالِ قلوب کے بارہ میں بہت
ایسا کلام ہے جو کتابِ سنت کے موافق ہے اور جب
اکثر حصہ قابلِ قبول ہے، اسی بنا پر اس کتاب کے
بارہ میں علماء مختلف رائیں رکھتے ہیں اور سب اس کے مخالف نہیں۔

علامہ ابن جوزی کی بھی بڑی تنقید ضعیف اور موضوع روایتوں پر ہے، ان کے نزدیک اس کی وجہ
امام حسنؒ کا حدیث سے عدم اشتغال ہے، حافظ زین الدین العراقي صلی اللہ علیہ وسلم نے احیاء کی بہت بڑی خدمت
انجام دی ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کی، ہر راوی اور حدیث کا درجہ اور اس کی حیثیت بیان کر دی ہے۔
ابن جوزی نے امام غزالی کے بعض تاریخی مسامحات اور فروگزاشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جس سے
معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی طرح ان کو تاریخ سے بھی اشتغال کا موقع نہیں ملا تھا۔

ان کا دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ بعض امراضِ قلب (ریا و حُب جاہ) وغیرہ کے علاج کے
سلسلے میں اور نفس کشی اور اصلاح کے لئے انھوں نے صوفیہ کے بعض ایسے واقعات نقل کر دیے ہیں جو قابلِ
تقلید نہیں ہیں اور فقہی حیثیت سے ان کا جواز بھی ثابت ہونا مشکل ہے، ان نقائص کے باوجود وہ

۱۔ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ص ۱۹، اور التاج المکمل لآب صدیق حسن فاہ ص ۳۸۸

۲۔ فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۲ ص ۱۹، ۳۔ المنتظم ج ۹ ص ۱۶۰، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱

اجزاء العلوم کی اہمیت و مقبولیت کے قائل ہیں اور انھوں نے خود منہاج القاصدین کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے جس میں انھوں نے قابل اعتراض چیزوں کو حذف کر دیا ہے، لیکن اس خلاصہ میں اصل کتاب کی بروح اور اس کی تاثیر باقی نہیں رہی ہے۔

امام غزالی اور علم کلام

امام غزالی جس مجتہدانہ دماغ کے آدمی تھے، اس کے لئے مشکل تھا، کہ وہ متقدمین کے مباحث و تحقیقات کے ناقص محض یا ترجمان و شراح بن کر رہ جائیں، اور کہیں ان کی شخصیت نمودار نہ ہونے پائے، بد قسمتی سے چوتھی صدی میں علم کلام کا حلقہ بھی (جس کو تمام دوسرے علمی اداروں سے زیادہ اپنے زمانہ کی عقلی اور علمی سطح کے ساتھ چلنے کی ضرورت تھی) جمود و تقلید کا شکار ہو گیا تھا، متکلمین اشاعرہ کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ ان کے نتائج تحقیقات اور ان کے عقائد تسلیم کئے جائیں، بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کے ثبوت کے لئے امام ابو الحسن اشعری اور علامہ ابوبکر باقلانی وغیرہ نے جو مقدمات و دلائل قائم کئے ہیں، ان کو بھی بعینہ تسلیم کیا جائے، اور ان کے علاوہ دوسرے مقدمات و دلائل سے کام نہ لیا جائے امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں مجتہدانہ انداز میں اصول و عقائد پر گفتگو کی، اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بعض ایسے نئے مقدمات و دلائل قائم کئے، جو ان کے نزدیک زیادہ موثر و دلپذیر تھے، صفات باری تعالیٰ..... نبوت، معجزات، تکلیفات شرعیہ، عذاب و ثواب، برزخ، قیامت کے متعلق انھوں نے نئے متکلمانہ انداز سے گفتگو کی، اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بہت سے متکلمین کی طرح احتمال آفرینیوں، تشکیکات اور منطقی مقدمات و نتائج کے بجائے زیادہ عام فہم اور اطمینان بخش دلائل فراہم کئے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے پیشرو متکلمین کے استدلال زبان اور اصطلاحات اور ان کی ترتیب کی پابندی نہیں کی، اور اس طرح اشعری علم کلام کی تجدید کی خدمت انجام دی جس کے لئے متکلمین اشاعرہ کو ان کا ممنون اور

ان کی عظیم الشان دینی خدمت کا معترف ہونا چاہیے تھا، مگر چونکہ انھوں نے یہ کام عام متکلمین کی روش سے بہت کر انجام دیا تھا، اور کہیں کہیں امام ابو الحسن اشعری اور ان کے نامور تبعین کی تحقیقات سے اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے اشعری مکتب فکر (جس سے خود امام صاحب مسلک اور منسوب تھے) ان کے اس علم کلام اور ان دلائل و مقدمات پر چسپی جمید تھا، اور اس حلقہ کے بہت سے پرچوش علماء اس میں زین و ضلال اور مسلک سلف سے بُعد و انحراف محسوس کرتے تھے، احیاء العلوم کی تالیف اور اس کی غیر معمولی اشاعت مقبولیت کے بعد اس مسئلہ پر اشعری علماء میں چرمیگوئیاں بہت بڑھ گئیں اور بہت سے لوگوں کو امام صاحب کے عقائد میں شبہات پیدا ہونے لگے، کسی مخلص نے امام صاحب کو خط لکھا اور اس صورت حال کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی قلبی تکلیف کا اظہار کیا، امام صاحب نے ان کو مفصل جواب یا ایک مستقل رسالہ (فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة) کے نام سے موجود ہے، اس کے شروع میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

”برادر شفیق! حاسدین کا گروہ جو میری بعض تصنیفات (متعلق با سرار دین) پر کٹھن چینی کر رہا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ یہ تصنیفات قدیئے اسلام اور مشائخ اہل کلام کے خلاف ہیں، اور یہ کہ اشعری کچھ عقیدے سے بال برابر بھی ہٹنا کفر ہے، اس پر جو تم کو صدمہ ہوتا ہے، اور تہاراد دل جلتا ہے، میں اس واقعہ ہوں لیکن عزیز من! تم کو صبر کرنا چاہیے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطاعن سے نہ بچ سکے تو میرا کیا ہستی ہے؟ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ اشاعرہ یا معتزلہ یا حنابلہ یا اور دیگر فرقوں کی مخالفت کفر ہے تو سمجھ لو کہ وہ اندھا مقلد ہے، اس کی اصلاح کی کوشش میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، اس کو خاموش کرنے کے لئے مخالفین کا دعویٰ کافی ہے، اس لئے کہ تمام مذاہب (کلامیہ) میں اشعری سے اختلافات پائے جاتے ہیں، اب اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ تمام تفصیلات و جزئیات میں اشعری کا اتباع ضروری ہے، اور ادنیٰ مخالفت بھی کفر ہے، تو اس سے سوال کرو کہ یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ حق اشعری کے ساتھ مخصوص ہے، اور انہی کی اتباع میں منحصر ہے، اگر ایسا ہے تو وہ شاید باقلانی کے کفر کا فتویٰ دیں گے“

اس لئے کہ صفت بقا میں ان کو اشعری سے اختلاف ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ ذات الہی سے زائد کوئی صفت نہیں ہے اور پھر سوال یہ ہے کہ باقلانی ہی اشعری کی مخالفت کر کے کیوں کفر کے مستحق ہیں، اشعری، باقلانی سے اختلاف کی بنا پر کیوں کفر کے مستحق نہیں، اور حق ان میں سے کسی ایک میں کیوں منحصر سمجھا جائے اگر کہا جائے کہ اشعری مقدم ہیں، تو خود اشعری سے معتزلہ مقدم ہیں تو پھر معتزلہ کو برحق ہونا چاہئے یا یہ محض علم و فضل کے تفاوت کی بنا پر ہے؟ تو بتلایا جائے کہ علم و فضل کا موازنہ کرنے کے لئے کون سا ترازو ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنے پیشوا کو علم و فضل میں سب سے بلند مرتبہ مانتا ہے اگر باقلانی کو اشعری سے اختلاف کرنے کی اجازت ہے، تو باقلانی کے بعد آنے والے اس حق سے کیوں محروم رہیں، اور اس میں کسی ایک شخص کی تخصیص کیوں کی جائے؟

علم کلام پر مجتہدانہ گفتگو اور اس میں بیش بہا اضافہ کرنے کے بعد امام غزالی اپنی سلامت طبع، حق پسندی اور ذاتی تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ علم کلام کا فائدہ بہت محدود ہے، اور بعض اوقات اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہے، نیز وہ ایک وقتی اور ضرورت کی چیز ہے، اور ایک دوا ہے جس کی صحیح المزاج اور سلیم الطبع انسانوں کو ضرورت نہیں، عمومی چیز جو ایک صالح غذا کا حکم رکھتی ہے، اور جس سے کوئی انسان مستثنیٰ نہیں، وہ قرآن مجید کا طرز بیان اور استدلال ہے جس سے سب کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے اور کوئی اس سے محروم نہیں، "إلجام العوام عن علم الکلام" میں جو ان کی آخری تصنیف ہے، لکھتے ہیں۔

فائدة القرآن مثل الغذاء وينتفع به	قرآنی دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے انسان فائدہ
كل انسان وادلة المتكلمين مثل الدواء	اٹھاتا ہے، اور متکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں جس سے
وينتفع به اعماد الناس ويستغنى به الاكثر	کوئی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور اکثر آدمیوں کو اس سے
بل ادلة القرآن كالماء الذي ينتفع به	نقصان ہوتا ہے، بلکہ قرآنی دلائل کی مثال پانی کی سی ہے

جس سے دودھ پیتا بچہ اور طاقتور آدمی کی سافائے

اٹھاتے ہیں باقی دلائل (کلامیہ) کھانے کے انواع واقعا

کی طرح ہیں کہ کبھی ان سے طاقتور آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے

اور کبھی ضرر اور بچوں کے لئے وہ مطلقاً کارآمد نہیں۔

النسبی الرضیع والرجل القوی

وسائر الادلة كالاطعمة التي ينفع

بها الاحیاء مریة وعرضون بها الغری

ولا ینتفع بها الصبیان اصلاً

علم کلام سے جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ اور تجربہ بیان کرتے ہیں۔

لوگوں کو علم کلام سے جو نقصان پہنچتا ہے اس کی

دلیل خود مشاہدہ اور تجربہ ہے اہل تجربہ جانتے ہیں کہ

جب سے متکلمین پیدا ہوئے اور علم کلام کا پڑھا ہوا

کیسی مصیبت آئی اور خرابی پھیلی صحابہ کا دور اس

خرابی سے محفوظ تھا۔

والدلیل علی ضرر الخلق به المشاهدة

والعیان والتجربة وما ثار من الشر

منذ منع المتکلم وفشت مناعة الکلام

سلامة العصور الاول من الصحابة عن مثل

ذالک۔

تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت

ذوالقعدہ ۷۹۹ھ میں امام غزالی نے نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کی مسند درس کو دوبارہ آباد کیا تھا یہ

سنجر سلجوقی (پسر ملک شاہ) کی سلطنت اور فخر الملک (پسر نظام الملک) کی وزارتِ عظمیٰ کا زمانہ تھا،

(فخر الملک) محرم ۸۰۰ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا، اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد

امام نے مدرسہ نظامیہ کی تدریس سے کنارہ کشی کی اور اپنے وطن طوس میں سکونت اختیار کی، گھر کے پاس ہی

ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی، جہاں تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

۸۰۰ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ نے جب نظام الملک کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کیا تو

۱۔ اجماع العوام عن علم الکلام منہ ۲۔ ایضاً

اس نے امام صاحب کو پھر بغداد میں بلانا چاہا، امام غزالی کی جگہ مدرسہ نظامیہ میں اگرچہ پرکردی گئی تھی، مگر خالی تھی، امام غزالی کا جانشین پورے عالم اسلامی میں ملنا مشکل تھا، مدرسہ نظامیہ سلطنت عباسیہ کی زینت اور بغداد کی آبرو تھی، اس نقصان کا احساس سب کو تھا، بارگاہ خلافت سے بھی اس کی تحریک ہوئی کہ امام غزالی مدرسہ نظامیہ کو پھر زینت بخشیں، قوام الدین نظام الملک وزیر اعظم نے خود خط لکھا، اور مدرسہ نظامیہ کی اہمیت اور مرکزیت بیان کی، اور خود خلیفہ عباسی کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا، وہ لکھتا ہے

”ونیز از سر اے عزیز مقدس نبوی (یعنی ایوان خلافت) ذر لیت نمودند و قدیر آن را بامانما فرمودند“

و اس خطاب صادر شد از ناصر الدین ^ع بہ تحفظ اس خبر خواہ اجل زین الدین حمید الاسلام، فرید الزمان ابو حامد

بن محمد الغزالی ادام اللہ تملک، اہتمام نگیرد از انچہ او بگاہ جہاں وقود عالم واگشت نمائے و زکار است“

اس فرمان پر دربار خلافت کے تمام ارکان کے دستخط ثبت تھے، اور یہ ظاہر کیا گیا تھا، کہ ”حاشیہ بوسان خلافت“

اور ارکان سلطنت سب امام صاحب کے قدم کے لئے چشم براہ ہیں، احمد بن نظام الملک نے خود امام صاحب کو جو خط لکھا، اس کا حاصل یہ تھا کہ اگرچہ آپ جہاں تشریف رکھیں گے، وہی جگہ درگاہ عام بن جائے گی، لیکن جس طرح آپ مقتدر لے روزگار ہیں آپ کی قیامگاہ بھی وہی شہر ہونا چاہیے جو عالم اسلام کا مرکز اور قبلہ گاہ ہو، تاکہ تمام دنیا کے ہر حصہ کے لوگ آسانی وہاں پہنچ سکیں، اور ایسا مقام صرف دارالسلام بغداد ہے۔“

امام صاحب نے ان خطوط و فرامین کے جواب میں ایک طویل خط لکھا، اور بغداد میں نہ آنے کے متعدد

عذر لکھے، ایک یہ کہ یہاں (طوس میں) ڈیڑھ سو مستعد طلبہ مصروف تحصیل ہیں، جن کو بغداد جانے میں زحمت ہوگی،

دوسرے یہ کہ جب میں پہلے بغداد میں تھا تو میرے اہل و عیال نہ تھے، اب بال بچوں کا جھگڑا ہے، اور یہ لوگ کہ وطن

کی زحمت نہیں اٹھا سکتے، تیسرے یہ کہ میں نے مقام خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا،

اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں، اس کے سوا دربار خلافت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہونا ہوگا، او

لے صدر الدین محمد نظام الملک طوسی کا پوتا اور سلطان سنجار کا وزیر اعظم تھا، جس کی حکومت میں طوس واقع تھا۔

میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا، اور بغداد میں میری کوئی جائیداد نہیں" غرض خلافت اور سلطنت کی طرف سے گو بہت کچھ کہہ ہوئی، لیکن امام صاحب نے صاف انکار کیا، اور گوشہٴ عافیت سے باہر نہ نکلے۔

بقیہ زندگی اور وفات

امام غزالی نے یہ زمانہ علمی و دینی اشتغال میں گزاریا، ان میں اب بھی طالب علمانہ روح تھی، وہ حدیث کی طرف ایسی توجہ نہیں کر سکے تھے، جیسی انھوں نے علوم عقلیہ اور بعض علوم نقلیہ کی طرف کی تھی، اس زمانہ میں ان کو اپنی اس کی کوپور کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ ایک مشہور محدث حافظ عمر بن ابی اسحاق کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر ان سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا درس لیا، اور اس کی سند حاصل کی، یہ اخیر زمانہ ان کا حدیث کے مطالعہ اور اشتغال میں گزاریا، ابن عساکر کہتے ہیں:-

وكانت خاتمة امره اقباله على حديث
المصطفى صلى الله عليه وسلم ومجالسة
اهله ومطالعة الصحيحين البخاري ومسلم
الذين هما حجة الاسلام^{۲۱}
ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیث نبوی
کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور علماء حدیث
کی ہم نشینی اختیار کی اور صحیحین (بخاری و مسلم) کا
مطالعہ شروع کیا جو اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں

انتقال سے ایک سال پہلے ۵۰۵ھ میں انھوں نے "المستصفیٰ" لکھی، جو اصول فقہ کے ارکان ثلاثہ میں شمار کی جاتی ہے، اور علماء نے اس کے ساتھ بڑی اعتناء کی ہے، یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔

امام غزالی نے طبرستان میں ۱۴۲ ہجری الاخریٰ ۵۰۵ھ کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا، اول

۱۔ الغزالی ص ۲۱ — ۲۔ تبیین کذب المفتری ص ۲۹، ۳۔ تین کتابین جو اصول فقہ کے تین تون سمجھے جاتے ہیں

حسب قیل ہیں، ابوالحسن البصری کی (المعتمد) امام الحارثی کی (البرہان) اور امام غزالی کی (المستصفیٰ)۔

یہ گنج گرانمایہ اسی خاک میں ودیعت ہوا، ابن جوزی نے ان کے انتقال کا واقعہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے :-

”دوشنبہ کے دن وہ صبح کے وقت بستر خواب اٹھے، وضو کر کے ناز پڑھی، پھر کفن منگوایا، اور آنکھوں سے لگا کر کہا ”آقا کا حکم سر آنکھوں پر یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے لوگوں نے دیکھا تو رُوح پرواز کر چکی تھی“

امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں

امام غزالی کی دو خصوصیتیں بڑی ممتاز ہیں، ’اخلاص‘، ’علو ہمت‘، ان کے اخلاص کا اعتراف موافق و مخالف سب کو ہے، اور وہ ان کی تصنیفات کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اگرچہ ان کے ناقد ہیں، اور ان کی بہت سی چیزوں کے اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان کو کبار مخلصین میں شمار کرتے ہیں، ان کی کتابوں کی تاثیر اور مقبولیت کی اصل وجہ ان کا یہی اخلاص ہے، اسی اخلاص نے ان کے اقلیم علم کی مسند شاہی ترک کروائی، اور برسوں دشت و بیاباں کی خاک چھنوائی، اور باوجود طلبی و اصرار کے بادشاہوں کے دربار اور اپنے وقت کے سب سے بڑے اعزاز سے روگرداں اور بے نیاز رکھا، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آخری چیز جو صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے، وہ حب جاہ ہے، ان کی آخری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس مقام سے محروم نہیں رہے۔

علو ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہم عصر کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے، ان کا نو میں یہی صدائے آواز کہ

ع مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

علوم نقلیہ میں بھی وہ اپنے زمانہ اور اپنے معاصرین کی عام سطح سے بہت بلند ہیں، فقہ و اصول فقہ میں

انھوں نے جو تصنیفات کیں، صدیوں تک علماء ان کی شرح و تحشیہ میں مشغول رہے، پھر اپنے زمانہ کے رواج اور علمائے نقلیات کے دستور کے خلاف انھوں نے علوم عقلیہ کی طرف توجہ کی، اور منطق و فلسفہ کا اس طرح مطالعہ کیا کہ بقول قاضی ابوبکر بن العربی فلسفہ کے جگر اور فلاسفہ کے شکم میں اتر گئے اور پھر ان کی تنقید و تردید میں ایسی کتابیں لکھیں، جن سے اس کی عمارت ایک صدی تک متزلزل رہی۔

عمل کے سلسلے میں اپنی ذہنی، علمی، اخلاقی، اور روحانی ترقی و تکمیل کا انھوں نے کوئی گوشہ فرو گذار نہیں کیا، علمی تبحر اور جامعیت و کمال کے ساتھ اپنے وقت کے ایک مخلص و مبصر شیخ طریقت شیخ ابوالعی فاریدی (م ۷۷۷ھ) سے بیعت کی، اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، پھر اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے اس کے مقاصد و غایات کو پہنچے، اور اذواق صحیحہ سے لذت آشنا ہوئے۔

اصلاح و انقلاب کے سلسلے میں صرف تصنیف و تالیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک نئی اسلامی سلطنت کی داغ بیل پڑنے میں بھی ان کا ہاتھ ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں:-

”امام صاحب کو ان باتوں پر تسلی نہ تھی، وہ دیکھتے تھے کہ موجودہ سلطنتوں کا سرے سے بغیر ہی بگڑ گیا ہے، اس لئے جب تک اسلامی اصول کے موافق ایک نئی سلطنت نہ قائم کی جائے، اصل مقصد نہیں حاصل ہو سکتا لیکن امام صاحب کو ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایسے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکتے، اتفاق یہ کہ جب حیار العلوم شائع ہوئی اور ۱۲۷۷ھ میں اسپین میں پہونچی تو علی بن یوسف بن تاشفین نے جو اسپین کا بادشاہ تھا، تعصب اور تنگ دلی سے اس کتاب کے جلانے کا حکم دیا، اور نہایت بیدارگی اس حکم کی تعمیل کی گئی، امام صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، تو سخت رنج ہوا، اسی اشار میں اسپین سے ایک شخص امام صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے آیا جس کا نام محمد بن عبداللہ نو مرت تھا، یہ ایک نہایت معزز خاندان کا آدمی تھا، اور اس کے آباء و اجداد ہمیشہ سے آزادی پسند اور صفا و صلہ چلے آئے تھے،

امام صاحب کی خدمت میں رہ کر اس نے تمام علوم میں نہایت کمال پیدا کیا، اور اپنے ذاتی و صلیہ الامام حق کی فیض صحبت سے یہ رادہ کیا کہ اسپین میں علی بن یوسف کی سلطنت کو مٹا کر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالے یہ خیال اس نے امام صاحب کے سامنے پیش کیا، امام صاحب نے چونکہ خود ایک عادلانہ سلطنت کے خواہشمند تھے اس لئے کوپت کیا لیکن پہلے یہ دریافت کیا کہ اس مہم کے انجام دینے کے اسباب بھی یہاں ہیں یا نہیں؟ محمد بن عبداللہ نے اطمینان دلایا، تو امام صاحب نے نہایت خوشی سے اجاز دی، علامہ ابن خلدون اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

وَبَقِيَ فِيمَا زَعَمُوا بِالْحَامِدِ الْغَزَالِيِّ وَفَاقَهُ
بِذَاتِ صَدْرِهِ فَارَادَهُ عَلَيْهِ مَلَكَانِ فِيهِ
الْإِسْلَامُ يَوْمَئِذٍ بِأَقْطَارِ الْأَرْضِ مِنَ الْخِلَالِ
جِدَا كَرُكُوكٍ كَاخِيَالٍ بُوِيَّ وَهُوَ الْوَحْدُ غَزَالِيٌّ سَلَاوُ
أَنَّهُ بَنَى دَوْلَةً خِلَالَهُ كَيْفَ تَمُتُ شُورُهُ كَمَا أَصْلَحَتْ
أَسَى كِي تَأْيِيدُهُ كَيْفَ كَرَّ أَسَى زَمَانِهِ سَلَامٌ تَمَامُ دُنْيَا

لے چونکہ محمد بن عبداللہ نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی اور اسی اصول پر قائم کی جو امام غزالی کا نشانہ تھا، اس لئے اس کا ایک مختصر سا حال طبقات الشافعیہ ابن بسکی سے نقل کرتے ہیں:-

محمد بن عبداللہ اقصا مغرب کا رہنے والا تھا، اول اپنے وطن میں نشوونما پایا، پھر مشرق کا سفر کیا اور فقہ و کلام کی تحصیل کی، وہ بہت پرہیزگار، عابد اور قناعت پسند تھا، فاطمہ اتھیل ہو کر امرا و مہمروں کی عنان شکن پر کمر بستہ ہوا، مصر میں پہنچا تو اس سختی سے لوگوں کو سنا ہی سے روکا کہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے، اور اس کو شہر بدر کر دیا، مصر سے اسکندریہ و چند روز وہاں اقامت کی، پھر بلاد مغرب کی طرف روانہ ہوا، شہر میں مہدیہ پہنچا، اور اپنے کام میں مشغول ہوا، وہاں چل کر بجایہ اور بجایہ سے مراکش گیا، یہاں بھی نہایت آزادی امر و المعروف کی حد انجام دی، یہاں تک کہ خود شاہی خاندان سے متعرض ہوا، بادشاہ وقت علی بن یوسف تاشفین نے اس کو دربار میں طلب کیا، دربار کے علماء نے اس کا کہا کہ ایسے عادل اور منصف بادشاہ کی حکومت ناراضی کی کیا وجہ بیان کر سکتے ہو، محمد بن عبداللہ نے نہایت خوش کے ساتھ کہا کہ اس شہر میں علانیہ شراب کی خرید و فروخت نہیں ہوتی، اور کیا تیموں کے مال پر دست رازی نہیں کی جاتی؟ اس کی پرچون تقریر سے بادشاہ بھی متاثر ہوا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں آنسو جاری ہو گئے، محمد مراکش سے نکل کر اغامت میں آیا، اور

رفتہ رفتہ ایک جماعت کثیر اس کے ساتھ ہو گئی، پھر تمل میں قیام کر کے قبیلہ مصاد کی اعانت سے سلطنت کی بنیاد ڈالی، شروع کی اور کامیاب ہوا۔

الدولة وتقول بعض اركان السلطان
 الجامع للأمة الملقية للملة بعد ان سأله
 عن له من العصاة والقبائل التي
 يكون بها الاعتزاز والمنعة -

میں ضعیف ہو رہا تھا اور کوئی ایسا سلطان موجود
 نہ تھا جو تمام امت کو فراہم کر سکے اور میں اسلام کو
 قائم رکھے لیکن پہلے امام خٹانے اس سے پوچھ لیا کہ تمہارے
 پاس اتنا سرمہ سامان اور جمعیت کیا نہیں جس سے

قوت اور حفاظت ہو سکے۔

عرض محمد بن عبد اللہ بن توہرت نے واپس جا کر امر بالمعروف کے شعار سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد
 ڈالی جو مدت تک قائم رہی اور موحدین کے لقب سے پکاری جاتی تھی، علی بن یوسف کی حکومت میں جو روتھدی
 بہت پھیل گئی تھی، فوج کے لوگ علانیہ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے اور عفت مآب خاتونوں کے ناموں
 کو برباد کرتے تھے، علی بن یوسف کے خاندان میں ایک مدت سے یہ اٹا دستور چلا آتا تھا کہ مرد منہ پر نقاب ڈالتے
 تھے اور عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں، اس لحاظ سے یہ لوگ "ملشین" کہلاتے تھے، محمد بن توہرت نے اول اول انہی
 دونوں بدعتوں کے مٹانے پر کمر باندھی، اور رفتہ رفتہ اسی سلسلہ میں ملشین کی حکومت برباد ہو کر ایک نئی سلطنت
 قائم ہو گئی، محمد بن توہرت نے خود فرمانروائی کا قصد نہیں کیا، بلکہ ایک لائق شخص کو جس کا نام عبد المؤمن تھا تخت نشین کیا،
 عبد المؤمن اور اس کے خاندان نے جس طرز پر حکومت کی، وہ بالکل اس اصول کے موافق تھی جو امام غزالی کی
 تناسخ علی ابن خلدون کتاب ثالث "اخبار بربر" فصل ثالث میں عبد المؤمن اور اس کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علماء کی عزت کی جاتی تھی اور تمام واقعات اور معاملہ میں ان سے مشورہ لے کر
 کام کیا جاتا تھا، ادواہوں کی فریادیں جاتی تھیں، رعایا پر حال ظلم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی، ظالموں کو
 ہاتھ روک دیا گیا تھا، شاہی ایوانوں میں مجیدی تعمیر کی گئی تھیں، تمام سرحدی ناکے جہاں یورپ کا واندانا تھا
 فوجی طاقت سے مضبوط کر دیے گئے تھے، اور غزوات و فتوحات کو روز افزوں ترقی تھی،"

امام غزالی کا عالم اسلام پر اثر

ان علمی و عملی کمالات، طاقتور اور جامع شخصیت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے عالم اسلام پر بڑا گہرا اثر ڈالا، ان کی حمد و آفریں تصنیفات اور مباحث نے علمی حلقوں میں ایک ذہنی توجہ اور فکری حریت پیدا کر دی اور ان کو نئی غذا اور طاقت پہنچائی، اسلام کی جو چند شخصیتیں صدیوں تک عالم اسلام کے دل و دماغ پر اور اس کے علمی و فکری حلقوں پر حاوی رہی ہیں، ان میں سے ایک امام غزالی کی شخصیت بھی ہے جن کی اثر آفرینی علمی پایہ، ان کی تصنیفات کی اہمیت اور تاثر، مخالف اور موافق سب کو تسلیم رہی ہے، صدہا انقلابات کے بعد ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے، اور ان کی تصنیفات ایک بڑے حلقہ میں وسیع اور مقبول ہیں، اور پڑھنے والوں کو آج بھی متاثر کرتی ہیں۔

عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت و اصلاح عام اور بغداد کے داعی الی اللہ

امام غزالی کی موثر شخصیت ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کی عظمت کے باوجود عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت باقی تھی، مسلمانوں کی بڑی تعداد علمی شبہات اور خصوصی امراض کے بجائے عام اخلاقی کمزوریوں علمی کوتاہیوں اور غفلت اور جہالت کا شکار تھی، اور اس کا جلد مداوا ضروری تھا، اس لئے فوری طور پر ایک سحر بیان خطیب اور ایک ایسی بلند روحانی شخصیت کی ضرورت تھی جس کا عوام سے زیادہ ربط ہو اور جو اپنی دعوت و مواظبت، تزکیہ و اصلاح سے جمہور اہل اسلام میں دینی روح، اور نئی ایمانی زندگی پیدا کر دے، مطلق العنان حکومت چار سو برس تک مسلمانوں کے اخلاق کو متاثر کیا تھا، اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا مقصد زندگی حصول دولت یا جاہ و عزت تھا، اور جو اگرچہ اعتقادی طور پر

خدا و آخرت کا منکر نہ تھا، مگر عملاً خدا فراموش، آخرت سے غافل اور عیش میں مست تھا، عجیب تہذیب معاشرت

نے بھی اسلامی زندگی میں اپنے نیچے گڑور کھے تھے اور عجبی عادات اور جاہلی رسوم جزو زندگی بن گئی تھیں زندگی کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا، سوسائٹی کے مطالبات بہت بڑھ گئے تھے، حکام رس مزاج شناس موقع پرست لوگوں کی ایک مستقل قوم پیدا ہو گئی تھی، متوسط طبقہ امرائے نقش قدم پر تھا، اور عوام اور محنت کش متوسط طبقہ کے اخلاق و عادات پر متاثر ہو رہے تھے، جن کو وسائل معیشت حاصل تھے، وہ غلط طریقہ پران کو استعمال کر رہے تھے، اور زندگی سے تمتع اور لطف اندوزی میں مصروف تھے، جو امیرانہ ٹھاٹ سے محروم تھے، وہ کوفت میں مبتلا تھے، اور اپنے کو چوپایہ سے بدتر سمجھتے تھے، اہل دولت ایشارہ ہمدردی اور جذبہ شکر سے خالی اور تنگ حال اور محنت کش، صبر و قناعت، اور یقین و خودداری محروم ہوتے جا رہے تھے، اس طرح زندگی ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا تھی، اس وقت ایک ایسی دعوت کی ضرورت تھی جو دنیا طلبی کے بحران کو کم کرے، ایمان کو بیدار کرے اور آخرت کے یقین کو ابھارے، خدا طلبی کا ذوق پیدا کرے، اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت، اس کی بندگی اور رضامندی میں عالی ہمتی اور بلند وصلگی سے کام لے، اور اس راستہ میں سبقت کرنے کی دعوت دے، توحید کامل کو واضحگان بیان کیا جائے، اہل دنیا اور ارباب دولت کی بے وقعتی، اور اسباب کی کمزوری کو طاقت اور وضاحت سے بیان کیا جائے۔

داعی کی علمی صلاحیتیں

پانچویں صدی تا تاریخ اسلام میں علوم و فنون کی ترقی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، اس صدی میں دینی، عقلی، اور ادبی علوم میں بڑے بڑے باکمال اور انکسوف پیدا ہوئے ہیں، اسی صدی کے آخر میں علامہ ابوالحسن شیرازی (م ۷۴۶ھ) اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جیسے متبحر عالم اور صاحب فنون، ابوالوفاء ابن عقیل (م ۵۱۳ھ) جیسے فقیہ اور محقق، عبدالقادر جیلانی (م ۷۴۱ھ) جیسے صاحب ذوق اور مجتہد فن، ابوزکریا تبریزی (م ۷۲۸ھ) جیسے لغوی اور نحوی، ابوالقاسم انحریری (م ۵۱۶ھ) جیسے نثر اور صاحب طرز نظر آتے ہیں، جنہوں نے

صدیوں دماغوں اور مذاقوں پر حکومت کی ہے، اس مردم خیز عہد اور بغداد جیسی شاداب سرزمین میں

و فتح دینی خدمت کے لئے اور ذہنوں اور طبیعتوں کا رخ موڑنے کے لئے اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور جامع کمالات شخص کی ضرورت تھی، جو اس عصر کے تمام مروجہ علوم میں بلند پایہ رکھتا ہو، اور جس کی روحانی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے علم و فضیلت کی بھی تحقیر ممکن نہ ہو، وہ اس زمانہ کی میجاری اور بلند زبان میں گفتگو کرتا ہو، اس کی مجلس میں ہر ذوق کے لوگوں کو حفظ حاصل ہو، اور کوئی اس کو "عابد جلیل" یا "واعظ بے علم" کہہ کر نظر انداز نہ کر سکے، پھر ضعیف الایمان لوگوں کو اس کی مجلس و عطا اور حلقہ درس میں یقین کی قوت، ایمان کی حرارت، اہل شک و ارباب کو شرح صدر کی دولت، مضطرب بے چین طبیعتوں اور مجروح دلوں کو سکون قلب کی نعمت، حقائق و معارف کے طالبین و ثائقین کو دقیق علوم اور لطیف مضامین کا خزانہ، بے علموں اور افسردہ دلوں کو جذبات اور عمل کے محرکات اور قوت عمل حاصل ہو۔

بغداد کے دُوداعی

اس پر از کمالات دور میں اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت اور مسلمانوں میں از سر نو ایمانی حرکت و حرارت اور توبہ و انابت کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے دو ہستیوں کو پیدا کیا، جن کی ذات سے دین کو بڑی قوت حاصل ہوئی، ان میں ایک کا نام نامی سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہے، دوسرے عبدالرحمن بن ابی حزی ہیں، ذوق و رجحان طبع کے اختلاف کے باوجود دونوں نے اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دین کو ان سے بڑا نفع پہنچایا، اس میں بھی خدا کی بڑی حکمت تھی کہ بغداد ان کے قیام و دعوت کا مرکز تھا، جو عالم اسلام کا مرکز اعصاب و اس کا علمی و سیاسی دار السلطنت تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو خدمت کے لئے طویل عمر اور وسیع میدان بھی عطا فرمایا۔

مذہب جنسلی کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ دونوں صاحبوں کا تعلق اسی مذہب کی فقہ و

اصول سے ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

تعلیم و تکمیل

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی ولادت گیلان میں ۳۷۷ھ میں ہوئی، آپ کا نسب س واسطوں سے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر پہنچتا ہے، ۱۸ سال کی عمر میں غالباً ۴۰۰ھ میں بغداد تشریف لائے، یہی وہ سال ہے جس سال امام غزالی نے تلاش حق و حصول یقین کے لئے بغداد کو خیر باد کہا تھا، محض اتفاقاً نہیں کہ ایک جلیل القدر امام سے جب بغداد محروم ہوا تو دوسرا جلیل القدر مصلح اور داعی الی اللہ کا وہاں ورود ہوا، آپ بغداد میں پوری عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہو گئے، عبادت و مجاہدات کی طرف طبعی کشش کے باوجود آپ نے تحصیل علم میں قناعت و زہد سے کام نہیں لیا، ہر علم کو اس کے باکمال استادوں اور صاحب فن عالموں سے حاصل کیا، اور اس میں پوری دستگاہ پیدا کی، آپ کے اساتذہ میں ابو الوفاء ابن عقیل، محمد بن الحسن الباقلائی اور ابو زکریا تبریزی جیسے نامور علماء و ائمہ فن کا نام

آہ جیلان یا گیلان کو ولیم بھی کہا جاتا ہے، یہ ایران کے شمال مغربی حصہ کا ایک صوبہ ہے اس کے شمال میں روسی سرزمین تالیس واقع ہے، جنوب میں بزرگ پہاڑی سلسلہ ہے، جو اس کو آذربائیجان اور عراق عجم سے علیحدہ کرتا ہے، جنوب میں مازندران کا مشرقی حصہ ہے، اور شمال میں بحر قزوین کا مغربی حصہ، وہ ایران کے بہت خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتا ہے (دائرة المعارف)۔

نظر آتا ہے، طریقت کی تعلیم شیخ ابوالخیر حماد بن مسلم الدباس سے حاصل کی، اور قاضی ابوسعید مخزومی سے تکمیل کی اور اجازت حاصل کی۔

اصلاح و ارشاد اور رجوع عام

ظاہری و باطنی تکمیل کے بعد اصلاح و ارشاد کی طرف متوجہ ہوئے ہندو درس، اور مندر ارشاد کو بیک وقت زینت دی، اپنے استاد و شیخ شیخ مخزومی کے مدرسہ میں تدریس اور وعظ کا سلسلہ شروع کیا، بہت جلد مدرسہ کی توسیع کی ضرورت پیش آگئی، مخلصین نے عمارت میں اضافہ کر کے اس کو آپ کی مجالس کے قابل بنا دیا، لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ مدرسہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی، سارا بندہ آپ کے مواعظ پر ٹوٹ پڑا، اللہ تبارک تعالیٰ نے ایسی وجاہت و قبولیت عطا فرمائی جو بڑے بڑے بادشاہوں کو نصیب نہیں، شیخ موفق الدین ابن قدامہ صاحب مغنی کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی آپ سے بڑھ کر دین کی وجہ سے تعظیم ہوتے نہیں دیکھی، بادشاہ اور وزراء آپ کی مجالس میں نیاز مندانہ حاضر ہوتے اور ادب سے بیٹھ جاتے، علماء و فقہار کا کچھ شمار نہ تھا، ایک ایک مجلس میں چار چار سو دو اتیس شہر کی گئی ہیں، جو آپ کے ارشادات قلب بند کرنے کے لئے لائی جاتیں۔

حماد و اخلاق

بایں رفعت و منزلت حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے، ایک بچہ اور ایک لڑکی بھی

لے غرائی نے کھائے کہ مریدین کی تربیت میں ان کو بلند مقام حاصل تھا، اور بغداد کے اکثر شائخ اوصوفیہ انہی سے وابستہ تھے، ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا طبقاً اکبری ج ۱ ص ۳۳۵ اصل نام مبارک بن علی بن حسینؑ، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ انھوں نے حدیث کا سماع، اور امام احمد کے مذہب پر علوم فنیہ میں کمال پیدا کیا، اور زیادہ تر مناظرہ اور درس افتاء سے مشغولیت رکھی، ستودہ صفات معتدل مسلک رکھنے والے اور اپنے فیصلوں

میں بہت صائب الرائے تھے، ۵۵۰ھ میں وفات پائی۔ ۳۷ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذیل طبقات احنابلہ (ابن رجب)

بات کرنے لگتی تو کھڑے ہو کر سنتے اور اس کا کام کرتے، غریبوں اور فقراء کے پاس بیٹھتے، اور ان کے کپڑوں کو صاف کرتے، بھون نکالتے، لیکن اس کے برخلاف کسی معزز آدمی اور ارکان سلطنت کی تعظیم میں کھڑے نہ ہوتے، خلیفہ کی آمد ہوتی تو قصداً دولت خانہ میں تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ خلیفہ آکر بیٹھ جاتا، پھر برآمد ہوتے، تاکہ تعظیماً کھڑا نہ ہونا پڑے، کبھی کسی وزیر یا سلطان کے دروازہ نہیں گئے۔^{۳۵}

آپ کے دیکھنے والے اور آپ کے معاصرین آپ کے حسن اخلاق، علو صلوٰۃ، تواضع و انکسار، سخاوت و ایثار اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کی تعریف میں رطب لسان ہیں، ایک بزرگ (حواہ) جنھوں نے بڑی طویل عمر پائی، اور بہت سے بزرگوں اور ناموروں کو دیکھا، اور ان کی صحبت اٹھائی، فرماتے ہیں:-

مارأت عینای احسن خلقاً ولا اوسع

میرے آنکھوں نے حضرت شیخ عبدالقادر سے بڑھ کر

صدراً ولا اکرم نفساً ولا الطفت قلباً

کوئی خوش اخلاقی، فروغ و صلہ، کریم النفس، رقیق القلب،

ولا الحفظ عهداً او دماً من سیدنا الشیخ

محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا نہیں دیکھا، آپ

عبد القادر و لقد کان مع جلالة قدره

عظمت اور علوم و تربیت اور وسعت علم کے باوجود چھوٹے

و علوم منزلتہ و سعة علمہ یقف

کی رعایت فرماتے، بڑے کی توقیر کرتے، ہلام میں سبقت

مع الصغیر و یوقر الکبیر و ید اباً السلا

فرماتے، کمزوروں کے پاس اٹھتے بیٹھتے، غریبوں کے ساتھ

و یمالس الضعفاء و یتواضع للفقراء

تواضع و انکساری سے پیش آتے، حالانکہ آپ کسی

و مقام لاحد من العظماء ولا الاعیان

سربراہ اور وہ یا رئیس کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہو

ولا الترمیاب و وزیر ولا سلطان^{۳۶}

اور نہ کسی وزیر یا حاکم کے دروازہ پر گئے۔

الامام الحافظ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف البرزالی الاشجلی ان الفاظ میں آپ کی تعریف کرتے ہیں:-

کان محباب الدعوة سریح الدمعة

آپ تجاب الدعوات تھے اگر کوئی محبت اور

لہ الطبقات الکبریٰ للشجرانی ج ۱ ص ۱۲۷

ج ۲ ایضاً ص ۱۲۸

ج ۳ ایضاً ص ۱۲۹

دائم الذکر کثیر الفکر رقیق القلب
دائم البشر کریم النفس یعنی الید
رقت کی بات کی جاتی تو جلدی آنکھوں پر آنسو
آجاتے، ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے، بڑے قریق
القلب تھے، خندہ پیشانی، شگفتہ رو کریم النفس،
فرخ دست، وسیع العلم بلند اخلاق، عالی نسب،
عبادات اور مجاہدہ میں آپ کا پایہ بلند تھا۔
والاجتهاد

مفتی عراق محی الدین ابو عبد اللہ محمد بن حامد البغدادی لکھتے ہیں:-

ایحد الناس عن الفحش اقرب
الناس الی الحق شدید الباس
غیر مذہب بات سے انتہائی دور حق اور محقول
بات بہت قریب اگر احکام خداوندی اور
حدود الہی میں کسی پر دست درازی ہوتی تو آپ کو
جلال آجاتا، خود اپنے معاملہ میں کبھی غصہ نہ آتا، او
الشر عز وجل کے علاوہ کسی چیز کے لئے انتقام نہ لیتے
کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرتے خواہ بدن کا
کپڑا ہی کیوں نہ اتار کر دینا پڑے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ضرورت مندوں پر بے دریغ خرچ کرنے کا خاص ذوق تھا، علامہ ابن
النجار آپ سے نقل کرتے ہیں کہ اگر ساری دنیا کی (دولت) میرے قبضہ میں ہو تو میں بھوکوں کو کھانا کھلا دوں
یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری سہیلی میں سورج ہے، کوئی پیرزاس میں ٹھہرتی نہیں، اگر ہزار
دینار میرے پاس آئیں تو رات نہ گزرنے پائے، صاحب قلائد الجواہر لکھتے ہیں کہ حکم تھا کہ رات کو وسیع
دستر خوان بچے، خود مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، کمزوروں اور غریبوں کی ہم نشینی فرماتے،

طلبہ کی باتوں کو برداشت کرتے، اور تحمل فرماتے ہر شخص یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی ان کا مقرب اور ان کے یہاں معزز نہیں، ساتھیوں میں سے جو غیر حاضر ہوتا، اس کا حال دریافت فرماتے، اور اس کی فکر رکھتے، تعلقات کا بڑا پاس اور لحاظ تھا، غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرتے، اگر کوئی کسی بات پر قہر کھا لیتا تو اس کو مان لیتے اور جو کچھ (حقیقت حال جانتے تھے) اس کا انخلاء فرماتے۔^{۱۵}

مردہ دلوں کی مسیحائی

سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کی کرامت کی کثرت پر موحین کا اتفاق ہے، شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلامؒ اور امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ شیخ کی کرامات حد تو اترو کو پہنچ گئی ہیں ان میں سب سے بڑی کرامت مردہ دلوں کی مسیحائی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی، آپ کا وجود اسلام کے لئے ایک باد بہاری تھا، جس نے دلوں کے قبرستان میں نئی جان ڈال دی اور عالم اسلام میں ایمان و روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی، شیخ عمر کبیسائی کہتے ہیں کہ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام نہ قبول کرتے ہوں، اور رہزن فونی اور جرالم پیشینہ توبہ سے مشرف نہ ہوتے ہوں، فاسد الاعتقاد اپنے غلط عقائد سے توبہ نہ کرتے ہوں۔

جہاں کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہوتی ہے کہ زمانہ سابق کی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں رہوں نہ مخلوق مجھے دیکھے نہ میں اس کو دیکھوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا نفع منظور ہے، میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں، عیاروں اور جرالم پیشینہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔^{۱۶}

مورخین کا بیان ہے کہ بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ حضرتؒ کے ہاتھ پر توبہ سے مشرف ہوا، اور

بکثرت یہودی، عیسائی، اور اہل ذمہ مسلمان ہوئے۔

تعلیمی مشاغل و خدمات

اعلیٰ مراتب ولایت پر فائز ہونے اور نفوس و اخلاق کی اصلاح و تربیت میں ہمہ تن مشغول ہونے کے ساتھ آپ درس و تدریس، افتاء اور تصحیح اعتقاد اور مذہب اہل سنت کی نصرت و حمایت سے غافل نہ تھے، عقائد و اصول میں امام احمد اور محدثین کے مسلک پر تھے، مذہب اہل سنت اور سلف کے مسلک کو آپسے بڑی تقویت حاصل ہوئی، اور اس کے مقابلہ میں اعتقادی و عملی بدعات کا بازار سرد ہو گیا ابن السمعانی کہتے ہیں کہ تبعین سنت کی شان آپ کی وجہ سے بڑھ گئی، اور ان کا پلرا بھاری ہو گیا۔

مدرسہ میں ایک سبق تفسیر کا، ایک حدیث کا، ایک فقہ کا اور ایک اختلافات ائمہ اور ان کے دلائل کا پڑھاتے تھے، صبح شام تفسیر، حدیث، فقہ، مذاہب ائمہ، اصول فقہ اور نحو کے اسباق ہوتے، ظہر کے بعد تجوید کی تعلیم ہوتی، اس کے علاوہ افتاء کی مشغولیت تھی، بالعموم مذہب شافعی اور مذہب حنبلی کے مطابق فتویٰ دیتے، علماء عراق آپ کے فتاویٰ سے بڑے متعجب ہوتے، اور بڑی تعریف کرتے۔

ایک مرتبہ استفتاء آیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ کوئی ایسی عبادت کرے گا جس میں عبادت کے وقت کوئی دوسرا شریک نہیں ہوگا، اگر اس نے قسم پوری نہیں کی تو اس کی بیوی کو تین طلاق، علما یہ استفتاء سن کر حیرت میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی عبادت ہو سکتی ہے جس میں وہ بالکل تنہا ہو، اور زوئے زمین پر کوئی شخص بھی اس وقت وہ عبادت نہ کر رہا ہو، حضرت شیخ کے پاس استفتاء آیا تو بے تکلف فرمایا کہ طواف اس کے لئے خالی کر دیا جائے، اور وہ سات چکر کر کے خانہ کعبہ کا طواف تنہا مکمل کرے، علمائے یہ جواب سن کر بے ساختہ داد تحسین دی اور کہا کہ یہی ایک صورت ہے کہ وہ بلا شرکت غیرے عبادت کرے اور اپنی

قسم پوری کرے اس لئے کہ طواف بیت الشریعہ موقوف ہے اور مطاف اس شخص کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اب اس عبادت میں کہیں بھی شرکت کا امکان نہیں ہے۔

استقامت و تحقیق

حضرت شیخ استقامت کا پہاڑ تھے، اتباع کامل، علم راسخ، اور تائید غیبی نے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ حق و باطل، نور و ظلمت، الہام صبیح اور کید شیطانی میں پورا امتیاز پیدا ہو گیا تھا آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ شریعت محمدی کے احکام اور حلال و حرام میں قیامت تک کے لئے تغیر و تبدل کا امکان نہیں، جو اس کے خلاف دعویٰ کرے، وہ شیطان ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم انسان روشنی ظاہر ہوئی، جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے، اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی، اس نے مجھ سے خطاب کر کے کہا کہ اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے ہیں، میں نے کہا دور ہو مردود! یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت سے بدل گئی، اور وہ صورت دھواں بن گئی، اور ایک آواز آئی کہ عبدالقادر! خدا نے تم کو تمہارے علم و تفقہ کی وجہ سے بچا لیا، ورنہ اس طرح میں شتر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں، میں نے کہا کہ اللہ کی مہربانی ہے، کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے، فرمایا اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔"

یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ اگر حدود الہی (احکام شرعی) میں سے کوئی حد ٹوٹی ہو تو سمجھ لو کہ تم فتنہ میں پڑ گئے ہو، اور شیطان تم سے کھیل رہا ہے، فوراً شریعت کی طرف رجوع کرو، اس کو مضبوط تھام لو، نفس کی خواہشات کو جواب دو، اس لئے کہ ہر وہ حقیقت جس کی شریعت تائید نہیں کرتی، باطل ہے۔

تفویض و توحید

تسلیم و تفویض اور توحید کا مکمل حضرت کا خصوصی حال تھا، کبھی کبھی تعلیم اس حال اور اس مقام کی تشریح فرماتے تھے، وہ دراصل آپ کا حال ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبر اں گفتہ آید در حدیث دیگر اں
ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

”جب بندہ کسی بلا میں مبتلا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اگر نجات نہیں پاتا، تو مخلوقات میں سے اوروں سے مدد مانگتا ہے، مثلاً بادشاہوں یا حاکموں یا دنیا داروں یا امیروں اور درودکھ میں طبیبوں سے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا اس وقت اپنے پروردگار کی طرف دعا اور گریہ و زاری و حمد و ثناء کے ساتھ رجوع کرتا ہے (یعنی) جب تک اپنے نفس سے مدد مل جاتی ہے، خلق سے رجوع نہیں کرتا، اور جب تک خلق سے مدد مل جاتی ہے، خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، پھر جب خدا کی طرف سے (بھی) کوئی مدد نظر نہیں آتی تو (بے بس ہو کر) خدا کے ہاتھوں میں آ رہتا ہے اور ہمیشہ سوال و دعا، اور گریہ و زاری اور تالیش و اظہار حاجت مندی، امید و بیم کے ساتھ کیا کرتا ہے، پھر خدا اس کے دعا سے (بھی) تھکا دیتا ہے، اور قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ کل اسباب (منقطع ہو جاتے ہیں اور وہ سب) علیحدہ ہو جاتا ہے اس وقت اس میں (احکام) قضا و قدر کا نفاذ ہوتا ہے، اور اس کے اندر (خدا اپنا) کام کرتا ہے تب بندہ کل اسباب و حرکات سے بے پروا ہو جاتا ہے، اور روح صرف رہ جاتا ہے اسے فعل حق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور وہ ضرور بالضرور صاحب یقین موحّد ہو جاتا ہے، قطعی طور پر جانتا ہے کہ درحقیقت خدا کے سوا نہ کوئی (کچھ) کرنے والا ہے، اور نہ حرکت و سکون دینے والا، نہ اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں اچھائی اور برائی، نفع و نقصان، بخشش و حرمان، کشائش و بندش، موت و زندگی، عورت

ذلت، غنا و فقر اس وقت (احکام قضا و قدر) میں بندہ کی یہ حالت ہوتی ہے جیسے شیرخوار بچہ دایہ کی گود میں یا مردہ غسال کے ہاتھ میں یا (لو کو کا) گیند سوار کے قبضہ میں کہ اٹا پٹا جاتا ہے اور بگاڑا بنایا جاتا ہے اس میں اپنی طرف سے کوئی حرکت نہیں نہ اپنے لئے نہ کسی اور کے لئے یعنی بندہ اپنے مالک کے فعل میں اپنے نفس میں غائب ہو جاتا ہے اور اپنے مالک و اس کے فعل کے سوا کچھ دیکھتا سنتا ہے کچھ سوچتا سمجھتا، اگر دیکھتا ہے تو اس کی صنعت، اور اگر سنتا ہے تو اسی کا کلام، اس کے علم سے (ہر چیز کو) جانتا ہے اس کی نعمت سے لطف اٹھاتا ہے اس کے قرب سے سعادت پاتا ہے اس کی تقریب (جاذبہ) سے آراستہ پیراستہ ہوتا ہے اس کے وعدہ سے خوش ہوتا ہے، سکون پاتا اور اطمینان حاصل کرتا ہے، اس کی باتوں سے مانوس ہوتا ہے، اور اس کے غیر سے وحشت و نفرت کرتا ہے اس کی یاد میں سرنگوں ہوتا اور جی لگاتا ہے اس کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے اس کے توڑ معرفت سے ہدایت پاتا اور اس کا خرقہ لباس پہنتا ہے اس کے علوم عجیب و نادر پر مطلع ہوتا ہے اس کے قدرت کے اسرار سے شرف ہوتا ہے اس کی ذات پاک سے (ہر بات سنتا اور اسے یاد رکھتا ہے، پھر ان (نعمتوں) پر حمد و ثناء و شکر و سپاس کرتا ہے)۔

خلق خدا پر شفقت

عامۃ الناس اور امت محمدیہ کے ساتھ آپ کو جو تعلق، جو فکر اور اس کے حال پر جو شفقت تھی، اور جو نائین رسول اور مقبولین کی خاص علامت ہے اس کا اندازہ آپ کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جس میں آپ نے بازار میں جانے والوں کے احوال و مراتب بیان کئے ہیں ان میں آخری مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں اور دراصل حدیث دیگر اں میں اپنا ہی حال اور مقام بیان کرتے ہیں۔
”اور پانچواں وہ شخص ہے کہ جب بازار میں داخل ہوتا ہے تو اثر سے ان کا دل بھر جاتا ہے ان لوگوں پر

رحمت کرنے کے لئے، اور یہ رحمت اسے کچھ دیکھنے ہی نہیں دیتی کہ ان لوگوں کے پاس کیا کچھ ہے، وہ تو اپنے داخلہ کے وقت سے باہر نکلنے کے وقت تک بازار والوں کے لئے دعا و استغفار و شفاعت میں اور ان پر رحمت و شفقت میں مشغول رہتا ہے، اس کا دل ان لوگوں کے لئے ان کے حال پر جلتا رہتا ہے اور آنکھیں روتی رہتی ہیں اور زبان ان نعمتوں پر جو خدا نے ان لوگوں کو اپنے فضل سے دی ہیں خدا کا شکر اور اس کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہے^۱۔

حضرت شیخ کا عہد اور ماحول

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے بغداد میں ۳ سال گزارے اور عباسی خلفاء میں سے پانچ ان کی نظروں کے سامنے کیے بعد دیگرے مسند خلافت پر بیٹھے، جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستظهر باللہ ابو العباس (م ۵۱۲ھ) کا عہد تھا، ان کے بعد بالترتیب مسترشد راشد المقتضی لامر اللہ و المتعبد باللہ تحت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

شیخ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے، سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اس زمانہ میں پورے عروج پر تھی، یہ سلاطین عباسی حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں تھے، کبھی خلیفہ کی رضامندی کے ساتھ اور کبھی اس کی مخالفت و ناراضی کے باوجود، کبھی کبھی خلیفہ اور سلطان کے لشکروں میں باقاعدہ معرکہ آرائی بھی ہوتی، اور مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے۔ اس طرح کے واقعات مسترشد کے زمانہ میں کئی مرتبہ پیش آئے، یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور معقول خلیفہ تھا، اور اکثر معرکوں میں فتح بھی اسی کو حاصل ہوتی، لیکن ۵۱۹ھ میں سلطان سعود

۱۔ فتوح الغیب، مقالہ (۲) ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کاکوروی (روز الغیب) ص ۱۵۵۔ ابن کثیر نے اس کے مناقب میں

لکھا ہے کہ مسترشد بہت شجاع، مصلحت مند، فصیح و بلیغ، شیریں کلام اور بہت عبادت گزار خلیفہ تھا، اور خاص عام راقی

اور اس کے درمیان جو معرکہ ہوا اس میں اس کو شکست فاش ہوئی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں۔

”سلطان کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی، خلیفہ قید کر لیا گیا، اہل بغداد کی املاک کو لوٹ لیا گیا، اور یہ خبر دوسرے تمام صوبوں میں پھیل گئی، بغداد اس المناک خبر سے بہت متاثر ہوا، اور وہاں کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آگیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں سر سے دوپٹہ ہٹا کر نور خوالی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں اور خلیفہ کی قید، اور اس کی پریشانیوں و مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اور اس کے بعد یقیناً اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے، ملک سبھرنے یہ ماجرا دیکھ کر اپنے بھتیجے کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کر دے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن خلیفہ کو باطنیوں نے بغداد کے راستے میں قتل کر دیا۔“

یہ تمام الم انگیز واقعات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نگاہوں کے سامنے گزرے انھوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق و خانہ جنگی اور دشمنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کی محبت کی خاطر اول ملک و سلطنت اور جاہ و مرتبہ کے حصول کے لئے لوگ سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہیں اور ان کو صرف دربار کی شان و شوکت سے دلچسپی باقی رہ گئی ہے، وہ اہل سلطنت کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں اور صوبوں اور شہروں کی حکومت حاصل کرنے کے لئے سر دھڑکی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مادی وجود خواہ ان واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو لیکن اپنے شعور و احساس کے ساتھ وہ اسی آگ میں جل رہے تھے، اور اسی سوز و رنج نے ان کو پوری ہمت و طاقت اور اخلاص

(باقی صفحہ ۲۰۸) سب کی نظروں میں محبوب تھا، وہ آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم برقرار رکھی، ۴۵ سال ۳ ماہ

کی عمر میں اس کو شہید کر دیا گیا، اس کی مدت خلافت ۷۱ سال اور ۲۰ روز ہے (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲۰۸)

کے ساتھ وعظ و ارشاد، دعوت و تربیت، اصلاح نفوس اور تزکیہ قلوب کی طرف متوجہ کیا، اور انھوں نے اتفاق اور حب دنیا کی تحقیر و تذلیل، ایمانی شعور کے احیا، عقیدہ آخرت کی تذکیر اور اس سرے فانی کی بے ثباتی کے مقابل میں اس حیات جاودانی کی اہمیت، تہذیبِ خلاق، توحیدِ خالص اور اخلاصِ کامل کی دعوت پر سارا زور صرف کر دیا۔

مواعظ و خطبات

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے، اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے، فتوح الغیب اور الفتح الربانی کے مضامین اور آپ کی مجالس کے وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گراتے ہیں، ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے نابین اور عارفینِ کاملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب اور سامعین اور مخاطبین کے حالات و ضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا، اور جن مغالطوں میں گرفتار تھے، انھیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اسی لئے حاضرین آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کا مرہم اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات و شبہات کا جواب پاتے تھے، اور تاثیر اور عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبانِ مبارک سے جو فرماتے تھے، وہ دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت و عظمت بھی ہے، اور دل آویزی اور حلاوت بھی، اور صدیقین کے کلام کی یہی شان ہے۔

توحیدِ خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی

اس وقت ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا، لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ لیا تھا، اسباب کو اسبابِ درجہ دے دیا گیا

تھا، اور قضا و قدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا ایک ایسی فضا میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:

”کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور عجب داب ل
ہلا دینے والا ہے، ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صوبہ کے
درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست پاٹ بہت بڑا تھا، بہت گہری بہاؤ بہت
زوروں پر ہے، اٹکا دیا ہے، اور خود ایک نفیس اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے،
اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے، جن کی مقدار خود بادشاہ
کے سوا کوئی نہیں جانتا، ارباب میں سے جو چیز چاہتا ہے، اٹھا کر اس ٹکے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے، تو کیا
(یہ ناشائستہ) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر ہٹا لے اور اس خوف و امید
ترک کر دے اور ٹکے ہوئے قیدی سے امید و بیم رکھے، کیا جو شخص ایسا کرے عقل کے نزدیک بے عقل ہے، اور اگر
دیوانہ ہو چاہے، اور انسانیت سے خارج نہیں ہے، خدا کی پناہ مینائی کے بعد نابینائی، اور وصول کے
بعد جدائی اور قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر سے؟“

ایک دوسری مجلس میں توحید و اخلاق اور ماسوائے اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:-

”اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے، اس سے محبت
کو جو تم سے محبت کرتا ہے اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے، اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا،
او تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا، اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میں کچل سے پاک کرے گا،
تم کو تمہاری سڑا ہند اور بدبو اور پست ہمتی اور نفس بدکار و رقیقان گمراہ و گمراہ کن سے نجات دے گا،
جو شیاطین خواہشیں اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو ہر نفس اور ہر عمدہ
اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت؟ کب تک خلق؟ کب تک خواہش؟ کب تک

روحنت ہ کب تک دنیا ہ کب تک آخرت ہ کب تک ماسوائے حق ہ کہاں چلے تم ؟ (اس خدا کو چھوڑ کر جو) ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور بنانے والا ہے، اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے، دلوں کی محبت روحوں کا اطمینان گرا نیوں سے سبکو و شکی بخشش و احسان، ان سب کا رجوع اسی کی طرف سے، اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے۔^۱

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح و اشکاف بیان فرماتے ہیں :-
 ”ساری مخلوق عاجز ہے، نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، بس حق تعالیٰ اس کو انکے ہاتھوں کر دیتا ہے، اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے، کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے، اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، جو موصد اور نیکو کار ہیں، وہ باقی مخلوق پر اللہ کی محبت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں، گو دولت مند ہیں، مگر حق تعالیٰ ان کے اندروں پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ہیں، جو صاف ہیں، جو شخص اس پر قادر ہو، اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی، دیکھا بہادر پہلوان ہے، بہادر دروہی ہے جس نے اپنے قلب کو ماسوائے اللہ سے پاک بنایا، اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا اپنے قلب کو مقلد القلوب سے وابستہ کرتا ہے، شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے، اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں۔“^۲

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پر، اپنے دیناروں پر، اپنے درہموں پر، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر، ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص

جس سے خوف کرے یا توقع رکھے، وہ تیرا مبود ہے، اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی اس کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے تو وہ تیرا مبود ہے۔^۱
ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرکاء سے نفرت اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

”تم اکثر کہتے ہو گے اور کہو گے میں جس سے محبت کرتا ہوں اس کی میری محبت رہنے نہیں پاتی، اور خیر نہ پڑ جاتا ہے، یا تو بعدائی ہو جاتی ہے یا وہ مرجاتا ہے یا رنجش ہو جاتی ہے اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے، اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے، تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے، اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے، اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے اس نے تم کو اس لئے پیدا کیا اور تم میرے ہو رہنا چاہتے ہو کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ ”وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ اسے“ اور یہ ارشاد کہ ”میں نے جن حق و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں“ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ ”خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے، تو اسے مبتلا کرتا ہے، پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے“ عرض کیا گیا یا رسول اللہ رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ”اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا“ اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی، اور خدا سے جو محبت اسے ہے، متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی، اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا، وہ غیور ہے، اور ہر چیز پر غالب و زبردست، تو وہ اپنے شریک کو ہلاک و معدوم کر دیتا ہے، تاکہ وہ اپنے بندہ کے دلی کو خالص کرے، خاص اپنے لئے بغیر شریک کے، اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آ جاتا ہے کہ ”وہ ان لوگوں کو

دوست رکھتا ہے، اور وہ لوگ اُسے یہاں تک کر دل جب (خدا کے ان مصلحتی) شریکوں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل و عیال، دولت و لذت اور خواہشیں ہیں، نیز ولایت و ریاست کرامات و حالات، منازل و مقالات، جنتوں اور درجات اور قرب و نزدیکی کی طلب کے پاک صاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی، اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے، جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے، خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے، تب اس کے دل کے گرد عظمت و مہر و تہ و ہیبت کے پرے ڈال دیئے جاتے ہیں، اور اس کے گرد اگر دُکریائی اور سطوت کی خدقیں کھودی جاتی ہیں کہ دل میں کسی چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا، اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل و عیال و اصحاب اور کرامات و حکم و بیانات کچھ مضرب نہیں ہوتے، کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں تب اللہ تعالیٰ ان سے غیرت نہیں کرتا، بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لئے بطور لطف و کرامت و رزق و نعمت کے ہوتی ہیں، اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں، انھیں نفع پہنچانے کے لئے لے لے

شکستہ دلوں کی تسکین

حضرت شیخ کے زمانہ میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اپنے اعمال و اخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا، اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشی حیثیت سے پست، دنیاوی ترقیات سے محروم، بے بضاعت و تہی دست، لیکن اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات و ترقیات سے بہرہ مند تھا، وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا، اور اپنے کو کسی وقت محروم و نامراد سمجھنے لگتا تھا، حضرت شیخ اس شکستہ دل

طبقہ کی دبوئی فرماتے ہیں، اور ان پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات ہیں، ان کا ذکر فرماتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

”اے خالی ہاتھ فقیر، اے وہ کہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے، اے گناہ لے بھوکے پیاسے ننگے، بھر جھلے ہوئے، اے ہر مسجد و خرابات سے نکالے ہوئے، اے ہر در سے پھینکالے ہوئے، اے وہ کہ ہر در سے محروم، خاک پر پڑا ہے، اے وہ کہ جس کے دل میں (مٹی بھوئی) آرزوؤں اور اراموں کے (کشتوں کے) پٹے لگے ہیں، امت کہ خدا نے تجھ کو محتاج کر دیا، دنیا کو تجھ سے پھیر دیا، تجھے پامال کر دیا، چھوڑ دیا، تجھ سے دشمنی کی، تجھے پریشان کیا اور جمیعت (خاطر) نہ بخشی، تجھے ذلیل کیا اور دنیا سے میری کفایت نہ کی، تجھے گناہ کیا، اور خلق میں او میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا، اور غیر پر اپنی تمام نعمتیں بچھا کر دیں، جس میں اس کے رات دن گزرتے ہیں اسے مجھ پر اور میرے دیار والوں پر فضیلت دی، حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے اور میں بھی اور ایک مل باپ آدم و حوا کی اولاد میں دونوں ہیں (اے فقیر) خدا نے تیرے ساتھ برتاؤ اس لئے کیا ہے کہ تیری سرشت مٹی از مین (کے مثل) بے ریت ہے، اور رحمت حق کی بارشیں برابر تجھ پر ہو رہی ہیں، از قسم صبر و رضا و یقین موافقت و علم اور ایمان و توحید کے انوار تیرے گرد اگر وہیں تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیج اپنی جگہ پر مضبوط ہے، کٹے دے رہا ہے، پھل رہا ہے، بڑھ رہا ہے، شاخیں پھیلا رہا ہے، سایہ دے رہا ہے، بلند ہو رہا ہے، روزانہ زیادتی اور نمو میں ہے، اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھا دینے کی ضرورت نہیں، اس بارہ میں خداوند تعالیٰ تیرے حکم سے فارغ ہے (کہ وہ خود تیری ضروریات کو بخوبی جانتا ہے) اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے، اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے، اور عقبی میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کان نے سنیں نہ کسی انسان کے دل میں گزریں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کون سی آنکھوں کی ٹھنڈکان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے، اس کا کہ بدل میں جو وہ کرتے رہے ہیں یعنی جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے

احکام کی بجا آوری ممنوعات کے ترک پر صبر و مقدرات میں تفویض و تسلیم اور کل امور میں خدا کی موافقت کی ہے۔

اور وہ غیر جسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے، اور نعمت دنیاوی دی، اور اس پر اپنا فضل فرمایا، اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ زبانی اور پہیلی زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرنا اور درخت اگنا اور کھیتی اور پھل کا پیدا ہونا دقت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو، اور وہ کھاد دینا اس کا سامان ہے تاکہ اس سے درخت ایمان اور نہال اعمال کی جو اس زمین میں اگے ہیں، حفاظت ہو اگر یہ چیز اس سے علیحدہ کر دی جائے تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے، اور پھل جاتے رہیں گے، پس گھر ہی اجڑ جائے گا، حالانکہ خداوند تعالیٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے تو لے فقیر اور نعمت آدمی کا درخت ایمان کمزور و جڑ کا ہوتا ہے، اور اس قوت سے خالی جو تیرے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے، اس کی مضبوطی، اور اس کا ٹکڑاؤ انہی چیزوں سے ہے جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس تھیں کو نظر آتی ہیں اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کر دی جائیں تو ایمان کا درخت سوکھ کر گروا نکار (پیدا) ہو جائے گا، اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا، البتہ (اگر) خداوند تعالیٰ دولت مند کی طرف صبر و رضا و یقین علم اور طرح طرح کی معرفتوں کے لشکر بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تو نگری اور نعمتوں کے علیحدہ ہونے

کی نہ پروا رہے گی!

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرت شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں، وہ دنیا کے استعمال اور اس بقدر ضرورت

استفاد سے منع نہیں فرماتے، اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں،

ان کے مواظفہ و تحقیقت حدیث نبوی "اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلاٰخِرَةِ" (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی، (یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر میں ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

"دنیا میں سے اپنا مقسم اس طرح مت کھا کہ وہ ٹھپی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو، بلکہ اس کو بادشاہ کے

دروازہ پر اس طرح کھا کہ تو بیٹھا ہوا ہو اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی

ہے اس کی جو حق تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہوتا ہے اس کو

ذلیل کرتی ہے کھاتق تعالیٰ کے ساتھ عزت و تو نگر کی کے قدم پر"

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے :-

"دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز، باقی

قلب میں رکھنا جائز نہیں (کہ دل سے بھی محبوب سمجھنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز، باقی

دروازہ سے آگے گھسنا نہ جائز ہے، نہ تیرے لئے عزت ہے"

خلفاء اور حکام وقت پر تنقید

حضرت شیخ صرف مواظفہ، پسند و نصیحت اور ترغیب و تنبیہ ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، جہاں

ضرورت سمجھتے تھے، بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام

دیتے، حکام و سلاطین اور خلیفہ وقت پر بھی تنقید اور ان کے غلط افعال اور فیصلوں کی مذمت سے بھی باز

نہیں رہتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی وجاہت اور اثر و نفوذ کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، حافظ

عماد الدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں :-

کان یا مریالمعروف وینہی عن المنکر
لخلفاء والوزراء والسلاطین والقضا
والخاصة والعامة یصدعهم بذلك
علیٰ رؤس الاشهاد ورؤس المناقب
المحاقل ویکبر علیٰ من یولی الظلمة
ولا ینخذله فی الله لومة لائم

آپ خلفاء ووزراء سلاطین قضاة خاص وعوام
سب ام بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے اور بڑی
صفائی اور جرأت کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور
برسر منبر علی الاعلان ٹوک دیتے جو کسی ظالم کو حاکم
بناتا اس پر اعتراض کرتے اور خدا کے معاملہ میں
کسی ملامت کرنے والے کی آپ کو پرواہ نہ ہوتی۔

صاحب قلائد الجواہر لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ متقی لاملہ نے قاضی ابوالوفاء یحییٰ بن سعید بن یحییٰ بن المنظر کو
قاضی بنایا جو ابن المرجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا تو حضرت نے برسر منبر خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔
ولیت علی المسلمین اظلم الظالمین
ما جوابك غدا عند رب العالمین
ارحم الراحمین۔

تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو
اظلم الظالمین ہے کل کو قیامت کے دن اس رب
العالین کو جو ارحم الراحمین ہے کیا جواب دے گا؟

موتیخ موصوف کا بیان ہے کہ خلیفہ یسین کررزہ براندام ہو گیا، اور اس پر گریہ طاری ہو گیا، اور اس نے
اسی وقت قاضی کو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔

حضرت شیخ ان درباری سرکاری علماء اور مشائخ کی بھی پرزور تردید اور پردہ دری فرماتے تھے جنہوں نے
سلاطین اور ناخدا ترس حکام کی مصاحبت اختیار کی تھی اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا شعار تھا جن کی
وجہ سے ان سلاطین و حکام کو زیادہ جرأت اور بے غوفی پیدا ہو گئی تھی ایک موقع پر اسی طبقہ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

”اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو!
اے بندگان خدا کے ڈاکو! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں (مثلاً) ہوئے نفاق کب تک رہے گا ہلے لہو

اور لے زاہد و ایشاہان و سلاطین کے لئے کب تک منافق بنے رہو گے کہ ان دنیا کا زوال اور اس کی شہوات و لذات لیتے رہو، تم اور اکثر بادشاہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں، بارالہ! منافقوں کی شوکت توڑ دے اور ان کو ذلیل فرمایا ان کو توبہ کی توفیق دے اور ظالموں کا قلع قمع فرما، اور زمین کو ان سے پاک کر دے، یا ان کی اصلاح فرما۔

ایک دوسرے موقع پر اسی طبقہ کے ایک فرد کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری حرص نے تجھ کو ظالموں کی خدمت گاری اور حرام خوری پر آمادہ کر دیا تو کب تک حرام کھاتا اور دنیا کے ان (ظالم) بادشاہوں کا خدمت گار بنایا ہے گا جن کی خدمت میں لگا ہوا ہے ان کی بادشاہت عنقریب مٹ جائے گی، اور تجھے حق تعالیٰ کی خدمت میں آنا پڑے گا، جس کی ذات کو کبھی زوال نہیں ہے۔

دین کے لئے دسوزی اور فکر مندی

حضرت شیخ دینی اور اخلاقی انخطاط کو (جس کا سب سے بڑا مرکز خود بخود تھا) دیکھ دیکھ کر گڑھتے تھے، اور عالم اسلام میں جو ایک عام دینی زوال رونما تھا، اس کے آثار دیکھ کر ان کے سینہ میں حمیت اسلامی اور غیرت دینی کا جوش اٹھتا تھا، وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض اوقات چھپا نہیں سکتے، اور یہ دریا ان کے خطبات اور مواعظ میں امنڈ آتا ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:-

”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں بے درپے گر رہی ہیں، اور اس کی بنیاد کھری جاتی ہیں، اے باشندگان زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دیں، اور جو ٹک گیا ہے اس کو درست

کردیں یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی، سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہئے، اے سورج، اے چاند اور اے دن
تم سب آؤ!

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:-

”اسلام رو رہا ہے، اور ان فاسقوں، اور ان بدعتیوں، گمراہوں، مکر کے پڑے بہنے والوں، اور ایسی
باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے (ظلم) سے جو ان میں موجود نہیں ہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد بجا رہا ہے،
اپنے تقدیر اور نظر کے سامنے والوں کی طرف غور کرو کہ امر وہی بھی کرتے تھے، اور کھاتے پیتے بھی تھے، اور دفعۃً
انتقال پا کر ایسے ہو گئے، گویا ہوئے ہی نہ تھے، تیرا دل کس قدر سخت ہے، کتاب بھی شکار کرنے اور کھیتی اور
مولتی کی نگہبانی اور مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کی غیر خواہی کرتا ہے، اور اسے دیکھ کر (خوشی کے
مائے) کھلاریاں کرتا ہے، حالانکہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک ونو لے یا ذرا سی مقدار کھانا دیا
کرتا ہے، اور تو ہر وقت اللہ کی قسم قسم کی نعمتیں شکم سیر ہو کر کھانا رہتا ہے، مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اس کو
مقصود ہے، نہ تو اس کو پورا کرتا ہے، اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے (بلکہ اس کے برعکس) اس کا حکم رد کرتا
ہے، اور اس کی حدود و شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔“

بیعت و تربیت

ان پر تاثر اور انقلابِ فرس مواعظ سے اگرچہ اہل بغداد کو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی نفع
پہونچا، اور ہزار ہا انسانوں کی زندگی میں اس سے تبدیلی پیدا ہو گئی، لیکن زندگی کے گہرے تغیرات، ہمہ گیر
اصلاح اور مستقل تربیت کے لئے صاحبِ دعوت سے مستقل اور گہرے تعلق اور مسلسل اصلاح و تربیت کی
ضرورت تھی، مجالس دعوت و ارشادِ دہرا اس کی طرح منضبط اور مستقل تربیت کا ہیں نہیں ہوتیں، جہاں

طالبین کی تسلسل و انضباط کے ساتھ تعلیم و تربیت اور نگرانی کی جائے ان مجالس کے شرکار و سامعین آزاد ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ وعظ سن کر چلے جائیں، پھر بھی نہ آئیں، یا ہمیشہ آتے رہیں، لیکن اپنی حالت پر قائم رہیں اور ان کی زندگی میں بدستور بڑے بڑے خلا اور دینی اور اخلاقی شکاوت باقی رہیں۔

اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ مدارس کے ذریعہ سے (جن کو بہت سی رسوم و قیود کا پابند ہونا پڑتا ہے) عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جاسکتا تھا، اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی و روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں اور پابندیوں کو شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ دوبارہ قبول کرے اس میں پھر ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اس کے افسرہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو، اور اس کے مضحمل قویٰ میں پھر حرکت اور نشاط پیدا ہو، اس کو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو، اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے، ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ خلافت جس کا یہ اصلی فرض تھا (اس لئے کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر یہ خلافت قائم تھی، بقول سیدنا عمر ابن عبدالعزیز وہ ہدایت کے لئے مبعوث ہوا تھا، جابیت (تحصیل و صول) کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنار کش ہو چکی تھی، بلکہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کے لئے معذور اور اس کے راستہ میں مزاحم تھی، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھی کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں وہ قیادت اور ریاست کی آمیزش پاتی، برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس کو فوراً کچل دیتی۔

ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت عمل پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ایمان و عمل اور اتباع شریعت کے لئے بیعت لے، اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی

سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں، اور پھر وہ نائب پیغمبران کی دینی نگرانی، اور تربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلہ محبت، اپنی استقامت، اور اپنے نفس گرم سے پھر ایمانی حرارت گرمی محبت، خلوص ولہبیت اجذبہ اتباع سنت، اور شوق آخرت پیدا کرے، ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک نئی زندگی سے توبہ کی ہے، اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے، اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھیں ہاتھ ملے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے، اور اس محبت و اعتماد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربہ و اجتہاد اور کتاب و سنت کے اصول و تعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان و احتساب، اخلاص، اور ان کے اعمال و عبادات میں کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت و تربیت کی، جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء و تجدید دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے، اور لاکھوں بندگان خدا کو حقیقت ایمان اور درجہ احسان تک پہنچا دیا ہے، اس سلسلہ زریں کے سر حلقہ اور کل سرسید حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کا نام اور کام اس ”طب نبوی“ کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے، الفاظ و اصطلاحات اور علمی بحثوں سے الگ ہو کر اگر واقعات و حقائق پر بنیاد رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دور انتشار میں (جو ابھی تک قائم ہے) اصلاح و تربیت کا اس سے زیادہ بہل اور عمومی اور اس سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت شیخ سے پہلے دین کے داعیوں اور مخلص خادموں نے اس راستہ سے کام کیا ہے، اور ان کی تاریخ محفوظ ہے، لیکن حضرت شیخ نے اپنی محبوب و دلاویز شخصیت، خداداد روحانی کمالات، فطری علو استعداد، اور ملکہ اجتہاد سے اس طریقہ کو نئی زندگی بخشی، وہ نہ صرف اس سلسلہ کے ایک نامور امام اور ایک مشہور سلسلہ (قادیہ) کے بانی ہیں، بلکہ اس فن کی نئی تدوین و ترتیب کا سہرا آپ ہی کے

سر پہ آپ سے پہلے وہ اتنا مدون و مرتب اور مکمل و مضبوط نہ تھا، نہ اس میں اتنی عمومیت اور وسعت ہوئی تھی، جتنی آپ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے پیدا ہو گئی، آپ کی زندگی میں لاکھوں انسان اس طریقہ سے فائدہ اٹھا کر ایمان کی صلاوت سے آشنا، اور اسلامی زندگی اور اخلاق سے آراستہ ہوئے اور آپ کے بعد آپ کے مخلص خلفاء اور با عظمت اہل سلسلہ نے تمام ممالک اسلامیہ میں دعوت الی اللہ اور تجدید ایمان کا یہ سلسلہ جاری رکھا، جن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا، یمن، ہندوستان میں پھر حضرمی مشائخ و تجار کے ذریعہ جادہ اور سماٹرا میں اور دوسری طرف افریقہ کے براعظم میں لاکھوں آدمیوں کی تکمیل ایمان اور لاکھوں غیر مسلموں کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، واسر ضاء و جزاء عن الاسلام خیر الجزاء۔

زمانہ پراثر

حضرت شیخ کا وجود اس مادیت زدہ زمانہ میں اسلام کا ایک زندہ معجزہ تھا، اور ایک بڑی نامید الٰہی آپ کی ذات آپ کے کمالات آپ کی تاثیر اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کی مقبولیت کے آثار اور خلق اللہ میں قبولیت و وجاہت کے کھلے ہوئے مناظر، آپ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ اصحاب کے اخلاق اور ان کی سیرت و زندگی سب اسلام کی صداقت کی دلیل اور اس کی زندگی کا ثبوت تھا، اور اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اسلام میں سچی روحانیت، تہذیب نفس اور تعلق مع اللہ پیدا کرنے کی سب سے بڑی صلاحیت، اور اس کا خزانہ عامر کبھی جو اہرات و نادرات سے خالی نہیں۔

وفات

ایک طویل مدت تک عالم کو اپنے کمالات ظاہری و باطنی سے مستفید کر کے اور عالم اسلام میں

روحانیت اور رجوع الی اللہ کا عالمگیر ذوق پیدا کر کے ۱۵۶۱ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی، صاحبزادہ حضرت شرف الدین عیسیٰؒ آپ کی وفات کا حال بیان کرتے ہیں:-

”جب آپ س مرتضیٰ میں بیمار ہوئے کہ جس میں انتقال فرمایا تو آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالوہاب نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیے کہ آپ کے بعد اس پر عمل کروں، فرمایا ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہو، اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو، اور نہ اس کے سوا کسی سے امید رکھو، اور اپنے تمام ضروریات اللہ کے سپرد کر دو، صرف اسی پر بھروسہ رکھو، اور سب کچھ اسی سے مانگو، خدا کے سوا کسی پر وثوق اور اعتماد نہ رکھو، توجہ اختیار کرو کہ توجہ پر سب کا اجماع ہے، اور فرمایا جب دل خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے تو کوئی چیز اس سے چھوٹی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس سے باہر نکل کر جاتی ہے، اور فرمایا میں مغربے پوست ہوں، اور اپنے صاحبزادوں سے فرمایا میرے گرد سے ہٹ جاؤ، میں ظاہر میں تمہارے ساتھ ہوں اور باطن میں دوسرے کے ساتھ ہوں، میرے پاس تمہارے سوا اور لوگ (فرشتے) حاضر ہیں، ان کے لئے جگہ خالی کرو، اور ان کے ساتھ ادب کرو، یہاں بڑی رحمت نازل ہے، ان کے لئے جگہ تنگ نہ کرو، اور آپ بار بار فرماتے تھے، تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں! اللہ میری اور تمہاری مغفرت کرے، اور میری اور تمہاری توبہ قبول کرے، بسم اللہ آؤ اور واپس نہ جاؤ، اور یہ آپ ایک دن ایک رات برابر فرماتے رہے، اور فرمایا تم پر افسوس! مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں، نہ کسی فرشتہ کی، نہ ملک الموت کی، اے ملک الموت! ہمارے کارساز تم سے زیادہ ہم کو بہت کچھ دے رکھا ہے، اور اس دن جس کی شب کو اپنے رحلت فرمائی ایک بڑی سخت چیخ ماری تھی، اور آپ نے دو صاحبزادے شیخ عبدالرزاق و شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ بار بار دونوں ہاتھ اٹھا کر پھیلانے، اور فرماتے تھے، تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور برکتیں! حق کی طرف رجوع کرو، اور صفت میں داخل ہو، میں ابھی تمہارے پاس آیا، اور آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ نرمی کرو، پھر آپ پر امر حق آیا، اور موت کے نشہ نے غلبہ کیا، اور اپنے فرمایا، میرے اور تمہارے اور

تمام خلق کے درمیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مجھے کسی پر قیاس نہ کرو، اور نہ کسی کو مجھ پر پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کی تکلیف اور حال دریافت کیا تو فرمایا مجھ سے کوئی نہ پوچھے، میں علم الہی میں پلٹے کھارہا ہوں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کے مرض کو پوچھا تو فرمایا میرے مرض کو نہ کوئی جانتا ہے، اور نہ کوئی سمجھتا ہے، نہ انسان نہ جن، نہ فرشتہ، خدا کے حکم سے خدا کا علم نہیں ٹوٹتا، حکم بدل جاتا ہے، اور علم نہیں بدلتا، حکم منسوخ ہو جاتا ہے، علم منسوخ نہیں ہوتا، الشہو چاہتا ہے مٹاتا ہے، اور باقی رکھتا ہے، اور اس کے پاس اصلی تحریر ہے، کچھ وہ کرتا ہے، اس سے باز پرس نہیں ہوتی، اور خلق سے باز پرس ہوتی ہے، صفات کی خبریں گزر رہی ہیں، جیسی آئی ہیں، پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالجبار نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے جسم میں کہاں تکلیف ہے؟ فرمایا میرے کل اعضاء مجھے تکلیف دے رہے ہیں، مگر میرے دل کو کوئی تکلیف نہیں، اور وہ خدا کے ساتھ صحیح ہے، پھر آپ کا وقت اخیر آیا، تو آپ فرمانے لگے میں اس خدا سے مدد چاہتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک و برتر ہے، اور زندہ ہے، جسے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں، پاک ہے، وہ جس نے اپنی قدرت سے عزت ظاہر کی، اور موت سے بندوں پر غلبہ دکھایا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ نے لفظ "تَعَزَّزَ" فرمایا اور یہ لفظ صحت کے ساتھ آپ کی زبان سے ادا نہ ہوا، تب آپ بار بار اسے دہراتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے آواز بلند اور سخت کر کے لفظ "تَعَزَّزَ" اپنی زبان سے ٹھیک ٹھیک فرمایا پھر (تین بار) اللہ اللہ اللہ فرمایا، اس کے بعد آپ کی آواز غائب ہو گئی، اور زبان تالو سے چپک گئی، اور روح مبارک رخصت ہو گئی۔ رضی اللہ عنہ و اسر صلاۃ

حضرت شیخ اس دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن اپنے پیچھے دین کے داعیوں اور نفوسِ اخلاق کے مربیوں

کی ایک جماعت چھوڑ گئے، جس نے آپ کے کام کو جاری رکھا، اور بڑھتی ہوئی ادیت اور غفلت کا مقابلہ کرتے رہے۔

اے حضرت شیخ کے بعد جن عارفین و مصلحین نے دعوت و تذکیر اور تربیتِ نفوس کا کام پوری طاقت اور محویت سے جاری رکھا، اور غفلت اور دنیاوی انہماک کا مقابلہ اور اخلاقی اور نفسانی امراض کا علاج کیا، ان میں حضرت شیخ کے فیض یافتہ اور شیخ بغداد شیخ ابوالنجیب سرودی کے بھتیجے اور خلیفہ شیخ الشیوخ ابو حفص شیخ شہاب الدین ہرودی (۵۹۳ھ - ۶۱۳ھ) سب سے زیادہ نمایاں اور متنازعہ، جو طریقہ سہروردیہ کے بانی اور تصوف کی مقبول کتاب ”عوارف المعارف“ کے مصنف ہیں۔

ابن خلکان لکھتے ہیں: ”لم یکن فی الخمر عمرہ فی عصرہ مثله“ کان شیخ الشیوخ بیضا^۱ (آخر عمر میں ان کے زمانہ میں ان کی نظیر نہ تھی) اور وہ بغداد کے سب سے بڑے شیخ اور اپنے فن میں مرجع تھے (ابن النجار کہتے ہیں: ”انتهت الیہ الیامۃ فی ترمیۃ المریدین ودعاء المخلق الی احدثہ“) (تربیت مریدین اور دعوت الی اللہ کے کام میں وہ مرجع خلاق تھے) ابن خلکان کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے مشائخ دور دور سے ان کی طرف رجوع کرتے تھے، اور استفادہ کرتے رہتے تھے، شیخ کے مواعظ سے خلق اللہ کو بہت نفع ہوا، ابن خلکان کے الفاظ ہیں: ”وکان لہ مجلس وعظ وعلی وعظہ قبول کثیر ولہ نفس مبارک“ وہ اہتمام سے وعظ فرمایا کرتے تھے، ان کے وعظ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت عطا فرمائی، اور ان کے انعامات بزرگ سے لوگوں کو بڑا نفع تھا۔

تصوف کو بدعات سے پاک کرنے اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ بنانے کی کوشش میں حضرت شیخ کا تجدیدی حصہ ہے، ان کی کتاب ”عوارف المعارف“ کو اگر اس فن کی قدیم کتابوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو ان کی اس تجدیدی کام کا اندازہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ شہاب الدین کو بڑے بلند پایہ اور عالی استعداد و خلفاء عطا فرمائے جنھوں نے دعوت و تربیت کا کام بڑی قوت و وسعت کے ساتھ انجام دیا، ان کے صرف ایک خلیفہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہندوستان میں جو فیض پہنچا اور خلق اللہ کو ہدایت ہوئی، وہ ان کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کے لئے کافی ہے۔

(حاشیہ علی المحاشیہ) اے وفیات الاعیان ج ۳ ص ۱۱۹ (النهضة المصرية) اے امرأة الجمان لیا فی ج ۴ ص ۱۷

اے وفیات الاعیان ج ۳ ص ۱۲۰ اے نواب صدیق حسن خان مرحوم لکھتے ہیں: ”در تصوف سنی کتاب بہتر از عوارف

علامہ ابن جوزی

عبد الرحمن ابن جوزی دعوت و اصلاح کا ایک وسر انونہ ہیں وہ اپنے زمانہ کے کیتائے روزگار مفسر، محدث، مورخ، ناقد، مصنف اور خطیب ہیں اور ان میں سے ہر موضوع پر ان کی ضخیم تصنیف اور علی کارنامے ہیں۔

ابتدائی حالات اور تحصیل علم

۳۵۰ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، گویا حضرت شیخ سے ۲۷ سال چھوٹے ہیں، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو ماں نے مشہور محدث ابن ناصر کی مسجد میں چھوڑ دیا، ان سے حدیث سنی، قرآن مجید حفظ کیا، اور تجوید میں بہارت پیدا کی، شیوخ حدیث سے حدیث کی سماعت اور کتابت کی، اور بڑی محنت و انہماک اور جفاکشی سے علم کی تحصیل کی، اپنے صاحبزادہ سے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”مجھے خوب یاد ہے کہ میں پچھ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوا، بڑی عمر کے طلبہ میرے ہم سبق تھے، مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی راستہ میں بچوں کے ساتھ کھیلا ہوں یا زور سے ہنسا ہوں، سات برس کی عمر میں جامع مسجد کے سامنے کے میدان میں چلا جایا کرتا تھا، وہاں کسی ماری یا شعبہ باز کے حلقہ میں کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے کے بجائے محدث کے درس حدیث میں شریک ہوتا، وہ حدیث و سیرت کی جوابات کہتا، وہ مجھے زبانی

یاد ہو جاتی، پھر گھر جا کر اس کو لکھ لیتا، دوسرے ارطکے دجلہ کے کنارے رکھ دیتے تھے اور میں کسی کتاب کے اوراق لے کر کسی طرف چلا جاتا اور الگ تھلگ بیٹھ کر مطالعو میں مشغول ہو جاتا۔

میں اساتذہ و شیوخ کے حلقوں میں حاضری دینے میں اس قدر جلدی کرتا تھا کہ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگتی تھی، صبح اور شام اس طرح گزرتی کہ کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مخلوق کی احسان مندی سے بچایا۔

کتابت حدیث میں انہماک

حدیث کی سماعت و کتابت میں اتنا اشتغال رہا، اور اپنے ہاتھ سے مرویات حدیث کی اتنی کتابت کی کہ بعض مومنین کا بیان ہے کہ انھوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کے غسل کا پانی اس کترن اور بڑا دے سے گرم کیا جائے جو حدیث کے لکھنے کے لئے قلم بنانے میں جمع ہو گیا تھا چنانچہ وہ اتنا تھا کہ پانی گرم ہو گیا اور وہ بچ رہا۔

ذوق مطالعہ

مطالعہ کا ذوق اور اس کی حرص بچپن ہی سے بڑھی ہوئی تھی، بعد از عظیم الشان کتابی ذخیروں اور وسیع کتب خانوں سے مالا مال تھا، ابن جوزی کا محبوب مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا، ان کا مطالعہ کسی خاص فن یا موضوع سے مخصوص نہ تھا، وہ ہر موضوع کی کتابیں پڑھتے تھے، اور ان کو آسودگی نہیں ہوتی تھی، ”صید الخاطر“ میں جو ان کے خیالات و تاثرات کا شکوہ ہے، لکھتے ہیں:-

”میں اپنا حال عرض کرتا ہوں، میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح سیر نہیں ہوتی، جب کوئی نئی کتاب نظر پڑ جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دینیہ ہاتھ آگیا، اگر میں کہوں کہ میں بیس ہزار

کتبوں کا مطالعہ کیا ہے تو بہت زیادہ معلوم ہوگا، اور یہ طالب علمی کا ذکر ہے مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے سلف کے حالات و اخلاق، ان کی عالی ہمتی، قوت حافظہ، ذوق عبادت اور علوم نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا، جو ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی سطح پست معلوم ہونے لگی، اور اس وقت کے طلبہ علم کی کم ہمتی منکشف ہو گئی۔

تصنیف و تالیف اور تبحر علمی

علامہ ابن جوزی تصنیف و تالیف کی طرف نو عمری ہی سے متوجہ ہوئے، روزانہ چار جزو لکھنے کا زندگی بھر معمول رہا، حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کی تالیفات شمار کیں تو ہزار تک پہنچیں، حدیث میں ایسا بلند پایہ رکھتے تھے کہ دعویٰ سے کہتے تھے کہ ہر حدیث کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ صحیح ہے یا حسن یا محال ہے، ادب و انشاء و خطابت میں بغداد میں ان کی نظیر نہ تھی۔

تقویٰ اور ذوق عبادت

ان علمی کمالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دیانت و تقویٰ، اور ذوق عبادت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، ان کے نواسہ ابو المنظر کہتے ہیں کہ وہ ہر سہفتہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، کبھی کسی سے مذاق نہیں کیا، بچپن میں کسی بچہ کے ساتھ کھیلتے نہیں، کبھی کوئی مشتبہ چیز نہیں کھائی، ساری عمر ہی حال رہا، ابن النجار کہتے ہیں کہ ان کو ازواج صحیحہ حاصل تھے، اور صلاوت مناجات و لذت دعا کے ذوق آشنا تھے، ابن الفارسی کا بیان ہے کہ شب بیدار تھے، اور ذکر اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے، ان کی تصنیفات اور حالات و اشارات سے خود معلوم ہوتا ہے کہ چشم بینا اور دل بیدار رکھتے تھے، اور جمعیت خاطر اور تعلق

محشر کو سرمایہ زندگی سمجھتے تھے، اور اس میں کمی آنے سے یحییٰ و مضرب ہو جاتے تھے، شہید انیاط میں اپنی ایک حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ابتداءً عمر ہی سے میرے اندر طریق زہد اختیار کرنے کی رغبت اور اندرونی تقاضا تھا، رونے اور نوافل کا اہتمام و التزام تھا، اور تنہائی مرغوب تھی، اس وقت میرے دل کی بڑی اچھی حالت تھی، میری چشم بصیرت روشن اور سریع الادراک تھی، عمر کا جو لمحہ بغیر طاعت کے گزر جاتا، اس پر افسوس ہوتا، ایک ایک گھڑی غنیمت معلوم ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ عمل اور خدا کی رضا کا کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا، مجھے اللہ کے ساتھ ایک تعلق اور انس اور دعائیں لذت و حلاوت محسوس ہوتی، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ بعض حکام و اہل کاران سلطنت میری حق تقریر اور وعظ سے متاثر ہوئے، اور انھوں نے مجھے اپنی طرف مائل کیا، اور طبیعت بھی مائل ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حلاوت جو دعا و مناجات میں محسوس ہوتی تھی، جاتی رہی پھر دوسرے حاکم نے اپنی طرف مائل کیا (مشتبہ چیزوں کے ڈر سے) اس کے اختلاط اور کھانے پینے سے بچتا تھا، اور میری حالت کچھ بُری نہ تھی، پھر رفتہ رفتہ تاویل کا دروازہ کھل گیا، اور میں نے باحالت میں آزادی سے کام لیا، تو وہ ساری کیفیت جاتی رہی، جتنا میں ان حاکموں سے ملتا اور ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، قلب کی تاریکی بڑھتی جاتی، یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا کہ وہ روشنی بجھ گئی، اور قلب تاریک ہو گیا، اس صورت حال سے میری طبیعت میں ایک یحییٰ پیدا ہوئی، اس یحییٰ کا اثر مجلس و عطا کے سامعین پر یہ پڑا کہ وہ بھی یحییٰ اور متاثر ہونے لگے اس یحییٰ کے اثر سے ان کو بکثرت توبہ اور اصلاح کی توفیق ہوتی، اور میں خالی ہاتھ کا خالی ہاتھ رہتا، اپنی اس مفلسی اور بد قسمتی کو دیکھ کر میرا اضطراب اور بڑھا، لیکن کوئی علاج بن نہ آیا، آخر میں نے صاحبین کی قبور کی زیارت کی، اور اثر سے اپنے دل کی اصلاح کی دعا کی، بالآخر اللہ کے لطف و کرم نے میری دستگیری کی، اور مجھے کشاں کشاں خلوت کی طرف مائل کیا جس سے

مجھے وحشت تھی، اور وہ دل جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا، پھر قابو میں آیا، اور جو حالت مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اس کا عیب مجھ پر ظاہر ہوا، میں اس خوابِ غفلت سے بیدار ہوا اور میں نے اپنے ہریان و شفیع آقا (خدا) کا دل کھول کر شکر ادا کیا۔

ظاہری محاسن و اوصاف

ابن جوزی اس لازوال دولت کے ساتھ دولت دنیا و دولت عافیت اور دولتِ جمال سے بھی بہرہ مند تھے، موفّق عبد اللطیف کہتے ہیں کہ وہ نہایت خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش مذاق، اور نفیس طبع تھے، ابن الدینی کہتے ہیں کہ وہ شیریں زبان، شیوہ بیان، خوش آواز، موزوں قامت اور خوش اندام تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فرخ دست اور باحرمت رکھا، اپنی صحت اور اعتدال مزاج کا بڑا اہتمام رکھتے، اور ایسی چیزوں کا استعمال کرتے رہتے، جو ذکاوت و لطافت مزاج میں عین ہیں، صید الخاطر میں جا بجا صحت کی حفاظت، اعتدال مزاج، اور بد پرہیزی سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے، تلبیس ابلیس میں زہد کے مبالغہ آمیز اور تشددانہ عجیب رجحانات پر جا بجا تنقید کی ہے۔

بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق

ان کی خاص صفت ان کی عالی ہمتی، اور کسب کمالات اور جامعیت کا شوق ہے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے حالات میں جا بجا کیا ہے، انھوں نے جب کبھی مشہور و صلوٰۃ مندوں اور بلند ہمتوں کا جائزہ لیا ہے، ان کی حوصلہ مندی اپنی بلند ہمتی کے سامنے لپست اور محدود و نظر آئی ہے، صید الخاطر میں ایک جگہ تفصیل سے لکھتے ہیں۔

”انسان کے لئے سب سے بڑی ابتلا اس کی بلند ہمتی ہے، اس لئے کہ جس کی ہمت بلند ہوتی ہے، وہ

بلند سے بلند مراتب کو انتخاب کرتا ہے، پھر کبھی زمانہ مساعد نہیں ہوتا، کبھی وسائل مفقود ہوتے ہیں، تو ایسا شخص ہمیشہ کوفت میں رہتا ہے، مجھے بھی الشرح نے بلند حوصلہ عطا فرمایا ہے، اور اس کی وجہ سے میں بھی تکلیف میں ہوں، لیکن میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کاش مجھے یہ بلند حوصلہ عطا ہوتا، اس لئے کہ زندگی کا پورا لطف اور بے فکری بے عقلی، اور بے حسی کے بغیر نہیں، اور صاحب عقل یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی عقل کم کر دی جائے، اور زندگی کا لطف بڑھا دیا جائے، میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بلند ہمتی کا بڑی اہمیت سے ذکر کرتے ہیں، لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی ساری بلند ہمتی صرف ایک ہی صنف اور شعبہ میں ہے، اس کے علاوہ دوسرے شعبوں میں (جو بعض اوقات ان کے شعبہ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں) ان کو اپنی کمی یا پستی کی کوئی پروا نہیں، شریف رضی اپنے ایک شعر میں کہتا ہے: کہ ہر جسم کی لاغری کا ایک سبب ہے، اور میرے جسم کی مصیبت میری بلند ہمتی ہے، لیکن میں نے اس کے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ حکومت کے سوا اس کا کوئی مطمح نظر نہ تھا، ابو مسلم خراسانی اپنی جوانی کے زمانہ میں سوزنا نہ تھا، کسی نے اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ دماغ روشن، ہمت بلند، نفس بلند یوں کا حلیں، اس سبب سے ہوتے ہوئے پست اور محدود زندگی، بھلا نیند کس طرح آئے؟ کسی نے کہا کہ تمہاری تسکین کس طرح ہو سکتی ہے؟ کہا کہ صرف اس طرح کہ سلطنت حاصل ہو جائے، لوگوں نے کہا کہ پھر اس کی کوشش کرو، اس نے کہا کہ یہ خطروں میں پڑے اور جان کی بازی لگانے بغیر ممکن نہیں، لوگوں نے کہا کہ پھر کیا مانع ہے؟ کہا کہ عقل روکتی ہے، پوچھا گیا کہ پھر کیا ارادہ ہے؟ کہا کہ پھر عقل کا مشورہ قبول نہیں کروں گا، اور نادانی کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور دے دوں گا، نادانی سے خطرہ مول لوں گا اور جہاں عقل کے بغیر کام نہیں چلتا، وہاں عقل سے کام لوں گا، اس لئے کہ گناہی اور افلاس لازم و ملزوم ہیں، میں نے اس فریب خوردہ حوصلہ مند (ابو مسلم) کے حالات پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ اس نے سب اہم مسئلہ ہی کی بیخ کنی کر دی، اور وہ مسئلہ آخرت ہے، وہ حکومت کی طلب میں دیوانہ رہا، اس کی خاطر

اس نے کتنا خون بہایا، کتنے بے گناہ بندگانِ خدا کو قتل کیا، یہاں تک کہ اس کو دنیاوی لذتوں کا ایک
 قلیل حصہ حاصل ہوا، جو اس کا مطلوب تھا، لیکن اس کو آٹھ سال سے زیادہ اس سے لطف اندوز
 ہونے کا موقع نہ ملا، اس کو دھوکہ سے قتل کر دیا گیا، وہ اپنی عقل سے اپنا کوئی بندوبست نہ کر سکا، اور
 (سفاح کے ہاتھوں) قتل ہو کر دنیا سے بڑی بری حالت میں رخصت ہو گیا، اسی طرح متنبی نے اپنی بلند
 ہمتی اور حوصلہ مندی کا بڑا اثر اٹھایا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ اس کو محض دنیا کی ہوس تھی۔

لیکن میری عالی ہمتی کا معاملہ عجیب ہے، میں علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک مجھے
 یقین ہے کہ پہنچ نہیں سکوں گا، اس لئے کہ میں تمام علوم کا حصول چاہتا ہوں، خواہ ان کا کچھ موضوع
 ہو، پھر ان میں سے ہر علم کی تکمیل اور احاطہ چاہتا ہوں، اور اس مقصد کے ایک حصہ کا حصول بھی
 اس چھوٹی سی عمر میں ناممکن ہے، پھر میرا یہ حال ہے کہ اگر کسی فن میں کسی کو کمال حاصل ہوتا ہے، اور
 دوسرے فن میں وہ ناقص ہوتا ہے، تو مجھے وہ ناقص نظر آتا ہے، مثلاً محدث فقہ سے بے بہرہ ہے، فقیہ
 حدیث سے بے خبر، میرے نزدیک علم کا نقص ہمت کی پستی کا نتیجہ ہے، پھر علم سے میرا مقصد پورا پورا
 عمل ہے، میرا چاہتا ہے کہ مجھ میں بشر حافی کی احتیاط اور معروف کرخی کا زہد جمع ہو جائے، پھر یہ بات
 تصانیف کے مطالعہ، عامۃ الناس اور بندگانِ خدا کو تعلیم و افادہ اور ان کے ساتھ رہنے سہنے کے
 مشاغل کے ساتھ بہت مشکل ہے، پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مخلوق سے مستغنی رہوں، اور بجائے ان کا
 احسان لینے کے ان پر احسان کرنے کے قابل بن سکوں، درآئیں ایک علم کے ساتھ اشتغال کسبِ معاش
 سے مانع ہے، دوسروں کا ممنون ہونے اور ان کے شکوک و ہدایا کو قبول کرنے کو میری ہمت گوارا
 نہیں کرتی، پھر مجھے اولاد کی بھی خواہش ہے، اور بلند پایہ تصانیف کا بھی شوق ہے تاکہ یہ سب میری
 یادگار اور دنیا سے جانے کے بعد میرے قائم مقام ہوں، اس کا اہتمام کیا جائے تو دل کے پسندیدہ
 اور محبوب شغل خلوت و تنہائی میں فرق آتا ہے، اور طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر مجھے طبیعت

مستحبات سے جائز لطف لینے کا بھی شوق ہے، لیکن اس میں مال کی کمی سدا رہے، پھر اگر اس کا سامان بھی ہو جائے تو جحیت خاطر رخصت 'اسی طرح میں ان غذاؤں اور ایسے کھانے پینے کا بھی شائق ہوں' جو جسم کے موافق اور اس کے لئے مفید ہوں 'اس لئے کہ میرا جسم نفاست پسند اور شائق واقع ہوا ہے، لیکن مال کی کمی یہاں بھی رکاوٹ بنتی ہے، یہ سب درحقیقت اضداد کو جمع کرنے کی کوشش ہے، بھلا اس عالی ہمتی کا مقابلہ وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں جن کو صرف دنیا مطلوب ہے، پھر میری خواہش یہ بھی ہے کہ دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ میرے دین پر آچے نہ آئے اور وہ بالکل محفوظ ہو، اور نہ میرے علم اور عمل پر کچھ اثر پڑے، میری بے چینی کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے، ایک طرف مجھے شب بیداری عجزینہ مضیقا و تقویٰ کا اہتمام ہے، دوسری طرف علم کی اشاعت و افادہ اور تصنیف و تالیف اور جسم کے مناسب غذائیں بھی مطلوب ہیں، اور یہ بغیر قلب کی مشغولیت کے ممکن نہیں، ایک طرف لوگوں سے ملنا جلنا اور ان کی تعلیم بھی ضروری ہے، دوسری طرف خلوت و تنہائی کی دعا و مناجات کی حلاوت میں کمی ہو تو اس پر سخت تاسف درج ہوتا ہے، متعلقین کے لئے قوت الایموت کا انتظام کیا جائے تو زہد و احتیاط کے معیار میں فرق آتا ہے، لیکن میں نے اس ساری تکلیف اور کوفت کو گوارا کر رکھا ہے، اور راضی و رضا ہو گیا ہوں، اور شاید میری اصلاح و ترقی اسی تکلیف و کشمکش میں ہے، اس لئے کہ بلند ہمت ان اعمال کی فکر میں رہتے ہیں، جو خدا کے یہاں باعث تقرب ہیں، میں اپنے انفاس کی حفاظت کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں کہ ایک سال بھی کسی لالچی کام میں صرف ہو، اگر میرا مطلوب حاصل ہو گیا تو سبحان اللہ ورنہ نیت المؤمن خیر من عملہ^۱۔

مجالس و عطا اور تاثیر

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے انقلاب انگیز مواظط اور مجالس درس ہیں، ان مجالس عطا

نے سارے بغداد کو زیر و زبر کر رکھا تھا، خلفاء و سلاطین، وزراء اور اکابر علماء ان میں بڑے اہتمام اور بڑے شوق سے شرکت کرتے، ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک ایک لاکھ آدمی ایک ایک وعظ میں شمار کئے گئے ہیں، دس پندرہ ہزار آدمیوں سے تو کسی طرح کبھی کم نہ ہوتے، تاثیر کا یہ عالم تھا کہ لوگ غش کھا کھا کر گرتے، وجد و شوق میں گریبا پھاٹتے، لوگوں کی چٹخیں نکل جاتیں، آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، توبہ کرنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا، اندازہ کیا گیا ہے کہ بیس ہزار یہودی عیسائی ان کے ہاتھ پر سلمان ہوئے اور ایک لاکھ آدمیوں نے توبہ کی۔

ابن جوزی نے اپنی مجالس وعظ میں بدعات و منکرات کی کھل کر تردید کی، عقائد صحیحہ اور سنت کا انہما کیا، اپنی بے مثل خطابت، زبردست علمیت اور عام رجوع کی وجہ سے اہل بدعت کو ان کی تردید کا حوصلہ نہ ہوا، سنت کو ان کے مواظ و درس اور تصنیفات سے بہت فروغ ہوا، اور خلیفہ وقت اور امرا بھی امام احمد کے (جو اس زمانہ میں سلک سلف اور طریقہ سنت کی نشانی سمجھے جاتے تھے) مقتدا اور ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

ان کی ناقدانہ تصانیف

ابن جوزی نے زبانی وعظ و تقریر پر اکتفا نہیں کیا، انھوں نے متعدد کتابیں ایسی لکھیں، جنھوں نے علمی طبقہ پر اثر ڈالا، اور غلط رجحانات کی اصلاح کی۔

کتاب الموضوعات

یہ موضوعات حدیث پر ان کی ایک کتاب ہے، جس میں انھوں نے ان حدیثوں کی حقیقت بیان کی ہے، جن سے اس زمانہ کے اہل ہونئی یا ضعیف العلم متصوفین استدلال کرتے تھے، اور وہ لوگوں کی گمراہی اور

صد ہا غلط فہمیوں کا باعث بنتی تھیں اس طرح انھوں نے اس شاخ پر غیش چلایا جس پر اہل بدعت نے
 اشیاء بنایا تھا، اگرچہ اس میں ان سے خود کہیں کہیں بے اعتدالی ہوئی ہے، اور انھوں نے کہیں کہیں سخت
 فیصلہ صادر کیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب نے ایک مفید خدمت انجام دی۔

”تلبیس ابلیس“

ان کی دوسری ناقدانہ تصنیف تلبیس ابلیس ہے، جو ان کی نقاد طبیعت اور سلفی ذوق کا اصلی
 نمونہ ہے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے، اور مسلمانوں کے
 ہر طبقہ اور ہر جماعت کو سنت و شریعت کے معیار سے دیکھا ہے، اور اس کی کمزوریوں بے اعتدالیوں اور
 غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے، اور دکھلایا ہے کہ شیطان نے کس کس طرح سے اس امت کو دھوکا دیا ہے، اور
 کن کن راہوں سے اس کے عقائد اعمال اور اخلاق میں رخنہ اندازی کی ہے، انھوں نے اس کتاب میں کسی طبقہ او
 کسی شخص کی رعایت نہیں کی، اور کسی کو معاف نہیں کیا ہے، اس میں علماء و محدثین فقہاء و واعظین، اوباء
 شعراء، سلاطین و حکام، عباد و زہاد، صوفیہ اہل دین، اور عوام کی علیحدہ علیحدہ کمزوریاں، غلط رسوم و عادات
 مغالطے اور بے اعتدالیاں بیان کی ہیں، یہ کتاب ان کی وسعت نظر زندگی سے واقفیت، باریک بینی اور
 دقیقہ رسی کا کامیاب نمونہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شیطان کی نفسیاست کا گہرا مطالعہ
 کیا تھا، اور مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد سے وہ بہت باخبر تھے۔

مختلف طبقات پر تنقید

اس کتاب میں اگرچہ کہیں کہیں وہ اپنی تنقید میں حد سے بڑھ گئے ہیں، اور انھوں نے فیصلہ کرنے میں

مجملات اور شدت سے کام لیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب میں بڑی کارآمد چیزیں، بڑے بیش قیمت

اقتباسات اور بہت سی صحیح تنقیدیں ملتی ہیں اور اکثر جگہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کی گرفت صحیح اور ان کی تنقید حق بجانب ہے، یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

اپنے زمانہ کے ان علماء پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جو فقہ کے مسائل و جزئیات میں دن رات منہمک تھے، اور اس فن میں ہوشگافیاں کرتے رہتے تھے۔

”ان فقہاء کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کا سارا انہماک اسی غور و فکر میں ہے، انھوں نے اپنے فن میں ان چیزوں کو شامل نہیں کیا ہے، جن سے قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید کی تلاوت، حدیث و سیرت کی سماعت اور صحابہ کرام کے حالات کا مطالعہ و بیان، سب جانتے ہیں کہ محض ازالہ رنج اور امتیاز کے مسائل کے بار بار دہرانے سے قلوب میں نرمی اور خشیت نہیں پیدا ہو سکتی، قلوب کو تذکیر اور مواظف کی ضرورت ہے، تاکہ آخرت طلبی کی ہمت اور شوق پیدا ہو، اختلافی مسائل اگرچہ علوم شریعت سے خارج نہیں، مگر حصول مقصد کے لئے کافی نہیں ہیں، جو سلف کے حالات اور ان کے حقائق و اسرار سے واقف نہیں، اور جن کے مذہب کو اس نے اختیار کیا ہے، ان کے حالات سے باخبر نہیں، وہ ان کے راستہ پر کیسے چل سکتا ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ طبیعت چور ہے، اگر اس کو اسی زمانہ کے لوگوں کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اہل زمانہ کے طبائع سے اغفر کرے گی، اور ان ہی کی طرح ہو جائے گی، اور اگر متقدمین کے حالات اور طریقوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے گی، اور ان کا رنگ اور ان کے سے اخلاق پیدا ہوں گے، سلف میں سے ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ایک حدیث جس سے میرے دل میں رقت پیدا ہو، قاضی شریح کے موفیصلوں سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔“

واعظین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ان میں سے اکثر لوگ بڑی آراستہ اور بڑی پر تکلف عبارت بولتے ہیں، جو اکثر بے معنی ہوتی ہے؛ اس زمانہ میں مواعظ کا بڑا حصہ حضرت موسیٰ کوہ طور، یوسف زلیخا کے قصوں سے متعلق ہوتا ہے؛ فرائض کا بہت کم تذکرہ آنے پاتا ہے، اسی طرح گناہ سے بچنے کا ذکر بھی نہیں ہوتا، ایسے مواعظ سے ایک زانی، ایک سودخوار کو توبہ کرنے کی ترغیب اور توفیق کیسے ہو سکتی ہے، اور کب عورت کو شوہر کے حقوق ادا کرنے اور اپنے تعلقات درست کرنے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے، اس لئے کہ یہ مواعظ ان مضامین سے خالی ہوتے ہیں، ان واعظوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے، اسی لئے ان کا بازار خوب گرم ہے، اس لئے کہ حق ہمیشہ طبیعتوں پر بھاری ہوتا ہے اور باطل ہلکا اور خوشگوار^۱ آگے لکھتے ہیں:-

”کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واعظ سچا اور خیر خواہ ہوتا ہے، لیکن جاہ طلبی اس کے دل میں سرایت کر چکی ہوتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کی عزت و تعظیم کی جائے، اور اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرا واعظ اس کی قائم مقامی کرے، یا اصلاح کے کام میں اس کی مدد کرنا چاہے تو اس کو ناگوار ہوتا ہے، حالانکہ اگر یہ مخلص ہوتا، تو اس کو اس سے کبھی ناگوار ہی نہ ہوتی^۲۔ یہی تنقید ان کی علماء پر بھی ہے کہ:-

”اگر طلبہ کسی اور عالم یا مدرس کے پاس چلے جائیں، جو علم میں اس سے فائق ہے تو اس عالم کو اس سے بڑی گرانی ہوتی ہے، یہ مخلص کی شان نہیں ہے، اس لئے کہ مخلص علماء اور مدبرین کی مثال طباطبائی کی سی ہے، جو لوہہ اللہ مخلوق کا علاج کرتے ہیں، اس لئے کہ اگر کسی مریض کو کسی طبیب کے ہاتھ سے شفا ہو جائے تو دوسرا خوش ہوتا ہے^۳۔

حکام و سلاطین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”یہ حضرات شریعت کے مقابل میں اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں کبھی اس شخص کا ہاتھ کاٹتے ہیں، جس کا ہاتھ کاٹنا جائز نہیں، اور کبھی اس کو قتل کرتے ہیں جس کا قتل حلال نہیں، ان کو یہ دھوکہ ہے کہ یہ سیاست ہے جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے، اس کو تکملہ اور ترمیم کی ضرورت ہے، اور ہم اپنی رائے سے اس کی تکمیل کر رہے ہیں۔ یہ شیطان کا بہت بڑا فریب ہے، اس لئے کہ شریعت سیاست الہی ہے، اور محال ہے کہ خدائی سیاست میں کوئی خلل یا کمی ہو، جس کی وجہ سے اس کو مخلوق کی سیاست کی ضرورت ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا وَفَّقَنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی) اور ارشاد ہے لَا مُعَصِّبَ لَكُمْ (اس کے حکم کو کوئی مٹانے والا نہیں) تو جو اس سیاست کا مدعی ہے وہ دراصل شریعت میں خلل اور کمی کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ کفر کی بات ہے۔“

ان حکام و امراء اور سلاطین کی ایک دوسری کمزوری اور مخالطہ کا ذکر کرتے ہیں:-

”معاصی پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان کو صلی، اکی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے، اور ان سے وہ اپنے حق میں عائن کرتے ہیں، شیطان اس کو سمجھاتا ہے کہ اس گناہوں کا پلہ اٹکا ہو جائے گا، حالانکہ اس غیر سے اس شر کا و فعیہ نہیں ہو سکتا، ایک مرتبہ ایک تاجر ایک حصول وصول کرنے والے کے پاس گزرا، اس چنگی وائے نے اس کی شتی روک لی، وہ تاجر اپنے زمانہ کے مشہور مرد صالح مالک بن دینار کے پاس آیا، اور ان واقعہ بیان کیا، مالک بن دینار چنگی والے کے پاس گئے، اور اس تاجر کی سفارش کی، اس نے اس کی بڑی تمغیم کی، اور کہا کہ آپ کیوں زحمت فرمائی، وہیں سے کھلوادیا ہوتا، ہم تعمیل کرتے، پھر اس نے ان سے دعا کی درخواست کی، انھوں نے اس برتن کی طرف اشارہ کر کے (جس میں وہ چنگی کا ناجائز و پر وصول کر کے رکھتا تھا) فرمایا کہ اس برتن سے کہو کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے، پھر فرمایا کہ میں تمہارے حق میں کیا دعا کروں جبکہ ہزار آدمی تمہارے لئے بد دعا کرتے ہیں، کیا ایک آدمی کی سن لی جائے گی، اور ہزار کی منی جائے گی“

ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ ان امراء اور دنیا داروں کو علماء و فقہاء سے زیادہ خلاف شرع پیروں اور گانے بجانے والے صوفیوں کی عقیدت و محبت ہوتی ہے، اور ان پر وہ بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں، جبکہ اہل علم پر ایک پیسہ خرچ کرنا ان کو بارہوتا ہے، اس لئے کہ علماء و اطباء کی طرح ہیں اور دوا میں خرچ کرنا انسان کو بڑا بار معلوم ہوتا ہے، لیکن ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا مغنیات (گانے والی عورتوں) پر خرچ کرنا، یہ بھی ان کے لئے گولیوں اور مدراریوں کی طرح سامان تفریح اور لازمہ ریاست ہیں۔

اسی طرح سے یہ لوگ بناوٹی زاہدوں اور تارک لدنیاء ریشوں کے بڑی جلدی معتقد ہوتے اور ان کو علماء پر ترجیح دیتے ہیں، یہ لوگ اگر سب سے بڑے جاہل کے جسم پر درویشی کا لباس دیکھ لیں تو فوراً معتقد ہو جائیں اور اگر وہ سر کو جھکائے اور شروع و خضوع کا اظہار کرے تو فریفتہ ہونے میں دیر نہیں لگتی، اور کہتے ہیں کہ بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ، یہ تارک لدنیاء طالب دنیا، یہ اچھی غذائیں کھاتا ہے، نہ شادی کرتا ہے، حالانکہ محض جہالت ہے، اور شریعت محمدی کی تحقیر ہے کہ ایسے زہد کو علم پر ترجیح دی جائے، خدا کا بڑا احسان ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے، ورنہ اگر آپ کو شادیاں کرتے، پاک صاف چیزیں کھاتے، اور میٹھے اور شہد کی رغبت رکھتے ہوئے پاتے تو آپ بھی بد اعتقاد ہو جاتے۔

عوام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”شیطان نے بہت سے عوام کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے کہ وعظ و ذکر کی مجالس میں شریک ہونا اور متاثر ہو کر رونا ہی سب کچھ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ مقصود محض خیر میں شرکت اور رقت ہے، اس لئے کہ وہ واعظوں سے اس کے فضائل سنتے رہتے ہیں، اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود عمل ہے، تو یہ سننا اور عمل کرنا ان کے لئے گرفت کا باعث اور وبال جان ہے، میں ذاتی طور پر بہت سے آدمیوں کو

جانتا ہوں، جو سالہا سال سے مجلس وعظ میں شریک ہوتے ہیں اور رفتے ہیں، مٹا نہ ہوتے ہیں، لیکن نہ سود لینا چھوڑتے ہیں نہ تجارت میں دھوکہ دینے سے باز آتے ہیں، ارکان صلوٰۃ سے جیسے وہ بے خبر برسوں پہلے تھے، ویسے ہی اب بھی ہیں، مسلمانوں کی غیبت، والدین کی نافرمانی میں جس طرح پہلے مبتلا تھے، اسی طرح اب بھی مبتلا ہیں، شیطان نے ان کو یہ جُل دے رکھا ہے کہ مجلس وعظ کی حاضری اور گریہ بکاؤں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا، بعض کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ علماء و صاحبین کی صحبت ہی مغفرت کا ذریعہ ہے^۱۔

دولت مندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ان میں سے بہت سے لوگ مساجد اور پلوں کی تعمیر میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں، مگر ان کا مقصود ریا اور شہرت ہوتی ہے، اور یہ کہ ان کا نام چلے اور یادگار رہے، چنانچہ وہ اس تعمیر پر اپنا نام کندہ کر دیتے ہیں، اگر رضائے الہی مقصود ہوتی تو اس کو کافی سمجھتے کہ اللہ دیکھتا اور جانتا ہے، ایسے لوگوں سے اگر صرف ایک یو ارب نانے کو کہا جائے جس پر ان کا نام کندہ نہ ہو تو وہ منظور نہ کریں گے۔ اسی طرح سے رمضان مبارک میں شہرت کے لئے موم بنیاں بھجیے ہیں، حالانکہ ان کی مسجدوں میں سال بھر اندھیرا پڑا رہتا ہے، اس لئے کہ روزانہ تھوڑا تھوڑا سیل مسجدوں میں دینے سے وہ شہرت اور ناموری حاصل نہیں ہوتی جو رمضان میں ایک موم بنی بھیج دینے سے حاصل ہوتی ہے۔“^۲

”صید الخاطر“

”صید الخاطر ایک کنگول ہے جس میں مصنف نے اپنے قلبی تاثرات، بے تکلف خیالات، زندگی کے تجربات اور منتشر افکار و حوادث قلب بند کئے ہیں، اور اپنی بہت سی کمزوریوں اور غلطیوں کا بے تکلف

اعتراف کیا ہے، اس کتاب میں جا بجا نفس سے مکالمے، سوال و جواب، ذہنی کشمکش کی روداد، معاشرتی زندگی کے تجربے، عورتوں، نوکروں، اور دوستوں کے متعلق تجربہ کی باتیں، اور مفید ہدایت روزمرہ کے واقعات کی تحلیل، امراض نفسانی کا بیان، مختلف طبقات پر تنقید، نفس کا احتساب اور صدمہ کام کی باتیں ہیں، اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت صداقت اور سادگی و بے تکلفی ہے پوری کتاب اپنے زمانہ کے ادباء، مصنفین کے طرز کے خلاف نہایت رواں و بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہے، اور اپنے موضوع پر غالباً ایک عرب عالم و مصنف کی پہلی کتاب ہے۔

عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج

ابن جوزی اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات، اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں، اور یہی ایک عامی اور ایک صاحب نظر میں فرق ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”میں نے دو مزدوروں کو دیکھا کہ ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لے جائے ہیں، اور دونوں کچھ گاہے ہیں، ایک مصرعہ پڑھتا ہے، دوسرا ترنم کے ساتھ اس کا جواب دیتا ہے، ایک پڑھتا ہے، تو دوسرا کان لگا کر سنتا ہے، پھر دوسرا اس کو دہراتا ہے، یا اسی طرح کے مصرعے سے جواب دیتا ہے، مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کو محنت اور بوجھ کا احساس زیادہ ہو، لیکن اس ترکیبے ان کا کام آسان ہو جاتا ہے، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر مستہ لیتا ہے، اور کچھ سرور حاصل کر لیتا ہے، اور جواب کی فکر میں غول ہو کر اس میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے، اور اس طرح راستے ہو جاتا ہے، اور بوجھ کے احساس سے غفلت ہو جاتی ہے، اس سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ انسان نے شرعی ذمہ داریوں اور فرائض کا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے، اور سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست ہے، بڑا کام یہ ہے کہ اس کو

اس کے مرغوبات سے روکا جائے اور جن چیزوں سے اس کو رغبت نہیں ان پر اس کو قائم رکھا جائے، میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ صبر کے راستہ کو تسلی اور نفس کی جائز دلدادگی کی مدد سے قطع کیا جائے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ رات بھر چلنے سے سواریاں ٹھک جائیں اور فریاد کریں تو صبح کی روشنی کی امید دلاؤ اور دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کرو۔

اسی طرح کی حکایت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ اور ان کے ایک ساتھی کہیں جاتے تھے، ساتھی کو پیاس لگی، اس نے کہا کہ اس کنویں سے پانی پی لیں، بشر حافی نے کہا کہ اگلے کنویں سے پی لیں گے، جب وہ کنواں آیا تو بشر حافی نے آگے کے کنویں کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں تک صبر کرو، اسی طرح تسلی دیتے ہوئے بہت دور لے آئے، پھر اس سے کہا کہ اسی طرح دنیا کا سفر طے ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا، وہ اپنے نفس کو پہلے لے گا، اور اس کی وجہی کرے گا، اور اس سے وعدہ کرتا ہے گا تاکہ وہ اپنے بوجھ کو سنبھال سکے، اور اس پر صبر کرے، بعض بزرگانِ سلف فرماتے تھے کہ اپنے نفس میں تجھے تیرے مرغوب چیز سے جو روکتا ہوں تو محض شفقت اور خوف کی بنا پر، بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ اپنے نفس کو خدا کی طرف بڑھانے لے جاتا اور وہ روتا ہوتا تھا، پھر رفتہ رفتہ ہنسنا کھیلنا اللہ کی طرف بڑھنے لگا، یاد رکھنا چاہیے کہ نفس کی خاطر داری اور ملاحظت ضروری ہے، اور راستہ اسی طرح طے ہوتا ہے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

”میں نے دیکھا ہے کہ شکاری کتے جب حملہ کے کتوں کے پاس سے گزرتے ہیں، تو حملہ کے کتے تو ان کو بھونکتے ہیں، اور بہت شور مچاتے ہیں، اور ان کے پیچھے دوڑتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ان کتوں کی بڑی عزت ہے، ان پر جھول پڑی ہے تو ان کو ان پر حسد آتا ہے، لیکن اس کے بضلات شکاری کتے ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور ان کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے بھونکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، اس سے ایسا معلوم

ہوا اگر شکاری کتے گویا ان کتوں کی قوم ہی میں سے نہیں ہیں، اس لئے کہ تقاضی کتے موٹے موٹے بدن اور
 بھترے اعضاء کے ہیں، ان میں امانت کی صفت نہیں، لیکن شکاری کتے نازک اور پھرتیلے ہیں اور جیسا
 ان کا بدن نازک اور پھرتیلا ہے، اسی طرح ان کے عادات مہذب ہیں، وہ جب شکار کرتے ہیں تو کیا
 مجال ہے کہ اس کو منہ لگائیں، مالک کے ڈر سے یا اس کے احسانات کے شکر یہ میں وہ اس شکار کو
 جوں کا توں پہنچا دیتے ہیں، اس سے ایک بات تو میں سمجھا کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت
 ہوتی ہے، اگر وہ لطیف ہے، تو یہ بھی لطیف ہیں، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کو اس پر حسد نہیں آتا
 جس کو وہ اپنے طبقہ یا اپنی سطح کا نہیں سمجھتا، اسی طرح جس کو اللہ تعالیٰ ایمان و عقل کی دولت سے
 سرفراز کرے اس کو اپنے اس حاسد پر حسد نہیں ہوتا، جو ایمان و عقل سے محروم ہو، اور وہ اس کو
 قابل التفات نہیں سمجھتا، اس لئے کہ وہ دوسرے عالم میں ہے، اور یہ دوسرے عالم میں وہ دنیا
 کی بنا، پر حسد کرتا ہے، اور اس کا مطلع نظر آخرت ہے، اور دونوں میں بُعد المشرقین ہے^۱

واقعات زندگی اور نفس سے مکالمہ

وہ واقعات کی پوری تحلیل کرتے ہیں، اور خود اپنی زندگی کے واقعات میں نفس سے حکیمانہ مکالمہ
 کرتے ہیں، ایک مرتبہ انھوں نے دعا کی ایک دوسرے صاحب بزرگ دعائیں شریک تھے، دعا قبول ہوئی
 لیکن کس کی دعا قبول ہوئی، اس پر ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہوا۔

مجھے ایک مرتبہ ایسا معاملہ پیش آیا جس میں اللہ سے مانگنے اور دعا کی ضرورت تھی، میں نے دعا کی، او
 اللہ سے سوال کیا، ایک صاحب صلاح اور اہل خیر بھی میرے ساتھ دعائیں شریک ہو گئے، میں نے قبولیت
 کے کچھ آثار دیکھے، میرے نفس نے کہا کہ یہ اس بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے، تمہاری دعا کا نتیجہ نہیں، میں نے کہا کہ

مجھے اپنے ایسے گناہوں اور کوتاہیوں کا علم ہے، جن کی وجہ سے واقعی مجھے اس کا حق نہیں کہ میری دعا قبول ہو، لیکن کیا تعجب ہے کہ میری ہی دعا قبول ہوئی ہو، اس لئے کہ یہ مرد صالح ان گناہوں اور تقصیرات سے محفوظ ہے، جن کا مجھے اپنے متعلق علم ہے، لیکن مجھ میں اور اس میں ایک فرق ہے، مجھے اپنی تقصیر کی بنا پر دل شکستگی اور ندامت ہے، اور اس کو اپنے معاملہ پر فرحت و سرور ہے، اور کبھی اعتراض و تقصیر ایسی ضرورتوں کے موقع پر زیادہ کارآمد اور موثر ہوتا ہے، اور ایک بات میں ہم اور وہ مساوی ہیں، وہ یہ کہ ہم دونوں میں سے کوئی اپنے اعمال کی بنا پر فضل کا طالب نہیں، تو اگر میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ندامت سے گردن جھکا کر اور اپنے گناہوں کا اعتراض کرتے ہوئے کہوں کہ خدا یا مجھے معص اپنے فضل سے عطا فرمائیں بالکل خالی ہاتھ ہوں تو مجھے امید ہے کہ میری سن لی جائے گی، اور ممکن ہے کہ اس کی نظر اپنے حسن عمل پر پڑے، اور یہ اس کے لئے روک بن جائے تو بے میرے نفس میرا دل زیادہ نہ توڑو، پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے، مجھے اپنے حالات کا ایسا علم ہے جس کا تقاضا ادب اور تواضع ہے، پھر اپنی تقصیروں کا اقرار ہے جس چیز کا میں نے سوال کیا ہے، اس کا بے حد محتاج ہوں اور جس سے سوال کیا ہے اس کے فضل کا یقین ہے، اور یہ سب باتیں اس عابد کو حاصل نہیں تو اللہ اس کی عبادت میں برکت کرے، میرا تو اعتراض و تقصیر ہی بڑے کام کی چیز ہے؟

ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”ایک مرتبہ ایک ایسے معاملہ میں جو شرعاً مکروہ تھا، مجھے کچھ کشمکش درپیش تھی، نفس کچھ تاویلیں سامنے لاتا تھا، اور کراہت کو نظر سے ہٹاتا تھا، اور درحقیقت اس کی تاویلات فاسد تھیں، اور کراہت کی کھلی ہوئی دلیل موجود تھی، میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا، اور دعا کی کہ اس کیفیت کو دور فرمائے، اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی، میرے درس کے سلسلہ میں سورہ یوسف شروع ہو رہی تھی، میں نے

وہیں سے شروع کیا وہ خیال دل پر مستولی تھا، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میں نے کیا پڑھا، جب اس آیت پر پہونچا: **قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ** تو میں چونکا، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ہی اس آیت کا مخاطب ہوں، مجھے دفعتاً ہوش آیا، اور آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہا: تو نے خیال کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام آزاد تھے، وہ زبردستی اور ظلم سے غلام بنا کر بیچے گئے، انھوں نے اس شخص کا اتنا حق مانا جس نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا اور اس کو اپنا آقا کہا، حالانکہ نہ وہ غلام تھے نہ ان کا کوئی آقا تھا، پھر اپنی اس حق شناسی کی وجہ یہ بیان کی کہ **أَحْسَنَ مَثْوَايَ** مجھے اچھی طرح سے رکھا، اب ذرا اپنے اوپر غور کر تو حقیقت غلام ہے ایسے آقا کا جو تیرے وجود کے وقت سے برابر تیرے ساتھ احسانات کرتا رہا، اور اتنے بار اس تیری پردہ پوشی کی جس کا کوئی ثاویب نہیں، تجھے یاد نہیں کہ اس شخص کی طرح تیری پرورش کی، تجھے سکھایا پڑھایا، تجھے وزی دی تیری حفاظت کی، تیرے اسباب ہیا کے، بہترین راستہ پر تجھے ڈالا، اور ہر کم و دشمنی سے تجھے بچایا، اور جس صورت ظاہر کی ساتھ باطنی ذکاوت و جودت طبع عنایت فرمائی، علوم کو تیرے لئے سہل بنا دیا، یہاں تک کہ مختصر سے عرصہ میں تجھے وہ علوم حاصل ہوئے، جودوسروں کو طویل عرصہ میں نصیب نہیں ہوئے، تیری زبان پر علوم کو رواں کیا اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان کی تعبیر کی قوت عطا فرمائی، اور مخلوق سے تیرے عیوب کو چھپایا، ان کا معاملہ تیرے ساتھ حسن ظن کا رہا، تیرا رزق بغیر اہتمام و تکلف کے تجھ تک پہونچایا، اور کسی کا احسان مند نہیں بنایا، اور وہ بھی فراغت و اطمینان و کشائش کے ساتھ، بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کس کس احسان کا تذکرہ کیا جائے جس صورت کا یا صحت اعضا کا یا سلامت مزاج، یا اعتدال ترکیب کا یا لطافت طبع اور ذرات ابتذال سے بری ہونے کا، یا پیکرین ہی سے سیدھے اور معتدل راستے کی توفیق کا، یا بے حیائیوں اور لغزشوں سے حفاظت کا، یا منقولات کی ترجیح اور حدیث و سنت کی اتباع اور تقلید جادے سے نجات کا

یا بتدعی کی پیروی اور اس کے سلسلہ میں شمولیت سے محفوظ رہنے کا، وَإِن تَعَدَّ ذُنُوبَهُ اللَّهُ لَا تَحْصُوهَا“ کتنے دشمنوں نے تیرے لئے جال بچایا، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے بچایا، کتنے مخالفوں نے تجھ کو سبک کرنا چاہا، اور اس نے تجھے سربلندی عطا فرمائی، کتنی نعمتوں سے دوسرے محروم رہے اور تو ان سے سیراب کیا گیا، کتنے آدمی دنیا سے نامراد چلے گئے، اور تو شاد کام اور فائز المرام ہے، اس حالت میں تیرے دن گزر رہے ہیں کہ تیرا جسم صحیح سالم دین محفوظ، علم روز افزوں، دلی مقاصد پورے اگر کوئی مقصد بر نہیں آتا تو اس کی طرف سے صبر پیدا کر دیا جاتا ہے، اور تجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پورا نہ ہونے ہی میں حکمت الہی تھی، یہاں تک کہ تجھے یقین آجاتا ہے کہ یہی تیرے حق میں بہتر تھا، اگر میں پچھلے احسانات کو گناہنا شروع کروں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں، اور وہ ختم نہ ہوں، اور تجھے معلوم ہے کہ جن احسانات کا تذکرہ میں نے نہیں کیا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں، اور جن کا ذکر میں نے کیا ہے، ان کی طرف بھی میں نے صرف اشارہ کیا ہے، اس سب کے ساتھ تجھ کو ایسا فعل کرنا کیسے زیب دیتا ہے، جو اس کی مرضی کے خلاف ہے، ”مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَنَاقِبِي إِنَّهُ لَا يُغْنِيهِ الظَّالِمُونَ“

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

”میں نے ایک مرتبہ ایک ایسے سلا پر عمل کیا، جس کی بعض مذاہب (فقہیہ) میں گنجائش تھی، اور دوسرے مذاہب میں وہ جائز نہ تھا، اس پر عمل کرنے سے مجھے اپنے قلب میں بڑی قناعت محسوس ہوئی، اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں راندہ درگاہ اور محبوب ہو گیا، اور کچھ محرومی اور گہری تاریکی محسوس ہوئی، میرے نفس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے، تم تو دائرہ فقہاء سے نکلے نہیں، میں نے کہا کہ اے نفس بد! تیرے سوال کا جواب دو طرح سے ہے، اولیٰ تو یہ کہ تو نے اپنے عقیدہ کے خلاف تاویل کی، اگر خود تجھ سے

فتویٰ لیا جاتا تو اس کا فتویٰ نہ دیتا، اس نے کہا کہ اگر میں اس کے جواز کا قائل نہ ہوتا، تو کتنا کیوں؟
میں نے کہا کہ تو اپنے اس خیال کو دوسرے کے لئے بھی فتویٰ کے طور پر پسند نہیں کرتا، دوسری بات
یہ ہے کہ تجھے ظلمت کے اس احساس پر غور ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر تیرے دل میں نور نہ ہوتا تو تجھ پر
یہ اثر ہی نہ پڑتا، اس نے کہا کہ بہر حال مجھے اس ظلمت سے جو پلٹ پلٹ کر آتی ہے، وحشت ہے، میں نے
کہا کہ پھر اس فعل کے ترک کا عزم کر لے، اور فرض کر لے کہ تو نے جس کو ترک کیا ہے، وہ بالاجماع جائز ہے تب بھی
بربنائے رب و تقویٰ اس کو چھوڑنے کا وعدہ کر چنانچہ اس عمل سے اس کیفیت سے اس کو نجات ملی۔

سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت

وہ باوجود محدث و فقیہ ہونے کے اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قلب کی اصلاح اور ذوق و
شوق پیدا کرنے کے لئے موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ہے، ابلیس
ابلیس، اور ”صید الخاطر“ دونوں میں فقہاء و محدثین اور طلبہ و علماء کو وہ اس کا مشورہ دیتے ہیں،
اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں، ”صید الخاطر“ میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

”میں نے دیکھا کہ نفقہ اور سماع حدیث میں انہماک و مشغولیت قلب میں صلاحیت پیدا کرنے کے
لئے کافی نہیں، اس کی تدبیر یہی ہے کہ اس کے ساتھ موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کا
مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حرام و حلال کا خالی علم قلب میں رقت پیدا کرنے کے لئے کچھ زیادہ مؤثر
نہیں، قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، موثر احادیث و حکایات سے اور سلف صالحین کے حالات سے، اس لئے
کہ ان نقول و روایات کا جو مقصود ہے، وہ ان کو حاصل تھا، احکام پر ان کا عمل شکلی اور ظاہری نہ تھا،
بلکہ ان کو ان کا اصلی ذوق اور لب لباب حاصل تھا، اور یہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ علی تجربہ اور

خود آزمائش کرنے کے بعد ہے، میں نے دیکھا ہے کہ عموماً محدثین اور طلبہٴ فن حدیث کی ساری توجہ اونچی سند حدیث اور کثرتِ مرویات کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح عام فقہاء کی تمام توجہ جدیدیات اور بڑے کوزیر کرنے والے علم کی طرف ہوتی ہے، بھلا ان چیزوں کے ساتھ قلب میں کیا گداز اور رقت پیدا ہو سکتی ہے، سلف کی ایک جماعت کسی نیک اور بزرگ شخص سے محض اس کے طور طریقہ کو دیکھنے کے لئے ملنے جاتی تھی، علم کے استفادہ کے لئے نہیں، اس لئے کہ یہ طور و طریقہ اس کے علم کا اصلی پھل تھا، اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور فقہ و حدیث کی تحصیل میں سلف صاحبین اور زہاد و امت کی سیرت کا مطالعہ ضرور شامل کرو تاکہ اس سے تمہارے دل میں رقت پیدا ہو۔^۱

صلیٰ و امت کی سیرت

ابن جوزی نے اسی غرض کے لئے سلف صاحبین اور صلیائے امت میں سے بہت متقدمین اور مشاہیر کی مستقل سیرتیں لکھی ہیں، مثلاً حضرت حسن بصری، سیدنا عمر بن عبدالعزیز، حضرت سیفان ثوری، حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت بشر حافی، امام احمد بن حنبل، حضرت معروف کرخیؒ، ان مستقل تذکروں کے علاوہ ایک جامع تذکرہ "صفة الصوفیہ" لکھا، جو چار جلدوں میں ہے، یہ دراصل ابو نعیم اصبہانی کی مشہور کتاب "حلیۃ اولیاء" کی تہذیب و تنقیح ہے، جس کو ابن جوزی نے مناسب حذف و اضافہ اور تلخیص کے ساتھ محدثانہ و مورخانہ طرز پر مرتب کیا ہے، اس کتاب میں جو حالات و واقعات آئے ہیں، وہ موثر و دل گداز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت سے مستند بھی ہیں، اور مبالغہ آمیز روایات اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔

تاریخ کی اہمیت

ابن جوزی علوم دینیہ میں اشتغال اور فقہ و حدیث میں کمال کے ساتھ ساتھ فن تاریخ کی اہمیت و ضرورت

^۱ ص ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵

کے بھی بڑے قائل اور اس کی تعلیم کے مبلغ ہیں، ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر علماء و فقہاء سے اپنی کتابوں میں بعض بڑی افسوسناک فروگزاشتیں ہوئی ہیں، جو ان کے منصب اور علم و فضل کے شایانِ شان نہیں، اس لئے وہ طالب علم کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہر فن سے وہ فی الجملہ واقف ہو، اور تاریخ سے اتنی واقفیت رکھنا ہو کہ کوئی بڑی تاریخی غلطی نہ کر بیٹھے جو اس کی خفت کا باعث ہو، ”صدیحا خاطر“ میں لکھتے ہیں:-

”فقہ کو چاہئے کہ ہر فن کے ضروری حصہ سے واقف ہو تا یحیٰ ہو یا حدیث، لغت ہو یا دوسرا فن اس لئے کہ نفقہ تمام علوم کا محتاج ہے، اس لئے ہر فن کے ضروری حصہ سے اس کو واقف ہونا چاہئے میں نے بعض فقہاء کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیخ شامیؒ اور قاضی شریک یک مجلس میں جمع ہوئے مجھے سن کر تعجب ہوا کہ اس کو دونوں بزرگوں کے زمانہ کا فاصلہ نہیں معلوم، ایک عالم نے ایک مباحثہ کے دوران میں کہا کہ حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کے درمیان زوجیت منقطع نہیں ہوئی تھی، اس لئے حضرت علیؑ نے سیدہ کو خصل دیا، میں نے کہا کہ خدا تمہارا بھلا کرے، پھر حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؑ کے بعد ان کی بھانجی امام بنت زینبؑ سے نکاح کیسے کیا، اسی طرح میں نے امام غزالیؒ کی کتاب حیا والعلوم میں اسی تاریخی فروگزاشتیں دیکھیں جن سے مجھے سخت حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس طرح مختلف واقعات اور تواریخ کو آپس میں ملا دیا، میں نے ان تاریخی اغلاط کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے، اسی طرح انھوں نے اپنی کتاب ”مستظہری“ میں لکھا ہے، جس کو انھوں نے مستظہر باشہ کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ سلیمان ابن عبدالملک نے ابو حازم سے کہلایا کہ مجھے اپنے ناشتہ میں سے کچھ تبرکات بھیجو، انھوں نے ان کے پاس اُبلتا ہوا پوکر بھیجا، سلیمان نے اس کا ناشتہ کیا، پھر اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا، اور اس سے عبدالعزیز پیدا ہوئے، عبدالعزیز کے عرب عبدالعزیز پیدا ہوئے یہ سخت مغالطہ ہے، اس لئے کہ انھوں نے عمر ابن عبدالعزیز کو سلیمان بن عبدالملک کا پوتا قرار دیا، حالانکہ وہ اس کے ابن عم تھے، شیخ ابوالعالی جوینی نے اپنی کتاب ”الاشائل“ کے آخر میں اصول فقہ

میں ہے، لکھا ہے کہ اہل باطن کی ایک جماعت ناقل ہے کہ علاج، جنابی قرمطی، اور ابن المقفع نے سلطنتوں کے نظام کے اٹنے، مملکت کی تخریب اور عوام کی استیلا کی سازش کی، اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کا ذمہ داری لے لی، جنابی نے احسا میں سکونت اختیار کی، ابن المقفع ترکستان کے حدود میں جا بسا، اور علاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا، اس پر اس کے دونوں ساتھیوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا، اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا، اس لئے کہ اہل بغداد دھوکہ نہیں کھاتے اور بڑے مردم شناس اور فہم ہیں، اور میں کہتا ہوں کہ اگر ناقل کو یہ معلوم ہوتا کہ علاج نے ابن المقفع کا زمانہ ہی نہیں پایا، اس لئے کہ ابن المقفع کے قتل کا منصوبہ حکم دیا تھا، اور یہ ۱۴۲ھ کا واقعہ ہے، درانی ایک البوسجداً الجنابی کا طور ۲۸۹ھ میں ہوا ہے اور علاج ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا، اس بنا پر قرمطی اور علاج کا زمانہ قریب قریب ہے، لیکن ابن المقفع بہت متقدم ہے، اس کے ان دونوں سے ملنے اور سازش کرنے کا کوئی امکان نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب علم کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھے، اور اس کا کچھ نہ کچھ مطالعہ ہو، اس لئے کہ ہر علم کا دوسرے علم سے تعلق ہے، ایک محدث کے لئے یہ بات کتنی محبوب ہے، کسی واقعہ کے متعلق اس سے فتویٰ لیا جائے اور وہ جواب نہ دے سکے، اس لئے کہ وہ طرق حدیث کے جمیع کرنے میں مشغول ہے، اس کو مسائل و جزئیات کے علم کی فرصت ہی نہیں ہوتی، اسی طرح ایک فقیہ کے لئے یہ بات کتنی نامناسب ہے کہ اس سے ایک حدیث کا مطلب پوچھا جائے، اور وہ حدیث کی صحت اور اس کے مفہوم سے بالکل ناواقف ہو، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایسی بلند بہت عطا فرمائے، جو سب سے اوپر

جے سہتی کی باتوں کو گوارا نہ کرے

تاریخی تصنیفات

انہوں نے صرف اس تنقید اور مشورہ پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک مبسوط کتاب **المنظوم فی تاریخ الملوک والامم**

لکھی جو دس جلدوں میں ہے، اور جو ابتدائے اسلام سے لے کر ۱۵۷۴ء تک کے حالات پر مشتمل ہے مصنف پہلے سن لکھتے ہیں، پھر اس سن کے اہم واقعات و حالات کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر اس سن میں جن ممتاز اول قابل ذکر اشخاص کا انتقال ہوا ہے، ان کے حالات بیان کرتے ہیں، اس طرح یہ کتاب حالات و تذکرہ دونوں کی ایک جامع تاریخ ہے۔

اسی طرح ان کی ایک مختصر کتاب تلخیص فہوم اہل الاثر فی عیون التاریخ والسیر ہے جو ایک تاریخی بیامن کی حیثیت رکھتی ہے جس میں بہت سے تاریخی معلومات یکجا کر دیے گئے ہیں۔

ادبیت و خطابت

ابن جوزی کی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت پر مورخین کا اتفاق ہے، ان کی بجا اس عطف کی مقبولیت اور لوگوں کے ازدحام کا یہ بھی ایک بڑا سبب تھا، انھوں نے "صید الخاطر" میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے کہ نفس نے ان کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اس کا اہتمام بالکل چھوڑ دیں اور الفاظ کی طرف بالکل توجہ نہ کریں، یہ سب تکلف اور تصنع ہے لیکن انھوں نے اپنے علم اور تفقہ سے اس خیال کو دفع کیا، اور اپنے نفس کو سمجھا یا کہ حسن کلام ایک خدا داد قابلیت، ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے نہ نقص اور عیب، اس لئے ان کو دعوت و تبلیغ میں اس سے کام لینا چاہئے، اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہئے، اسی طرح ان کے دل میں کئی بار شدت اس کا خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وعظ گوئی اور دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر زہد و انقطاع کی زندگی اختیار کر لیں، اور لوگوں سے بالکل کیس ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں، مگر انھوں نے دلائل و براہین سے اور اپنے نفس سے مفصل مباحثہ و مناظرہ کر کے اس خیال کو

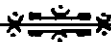
نہ اس کتاب کے آخری پانچ حصے دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان میں

مولوی سید محمد یوسف صاحب ٹونکی مرحوم کے اہتمام سے شائع ہو چکی ہے۔

ہٹایا، اور اس کو قائل کیا کہ یہ اتفاق شیطانی ہے، شیطان یہ دیکھ نہیں سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے جاں سے نکل کر ہدایت کے راستہ پر پڑ جائیں، انبیاء علیہم السلام کا راستہ دعوت و تبلیغ کا تھا اور ان کی زندگی اجتماع و اختلاط کی تھی، اس میں نفس کا چوریہ ہے کہ وہ بیکاری اور تعطیل کو پسند کرتا ہے اور جدوجہد سے بھاگتا ہے، دوسرے اس میں جاہ طلبی بھی ہے، اس لئے کہ عزت و گوشہ نشینی اور زہد و انقطاع کی زندگی عوام کے لئے زیادہ باعث کشش اور جاذب توجہ ہے، غرض یہ کہ شیطان ان کو افادہ عوام اور عمومی دعوت کے کام سے ہٹا نہیں سکا، انھوں نے اپنی ساری دماغی صلاحیتیں اور خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں اصلاح پر لگا دیں، اور نصف صدی سے زیادہ پورے انہماک قوت کے ساتھ اصلاح و افادہ کے کام میں مشغول رہے۔

وفات

۱۹۵۷ء میں شب جمعہ کو اس داعی الی اللہ نے انتقال کیا، بغداد میں کہرام مچ گیا، بازار بند ہو گئے جامع منصور میں نماز جنازہ ہوئی، یہ وسیع مسجد کثرت ازدحام سے تنگ اور نا کافی ثابت ہوئی، یہ بغداد کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا، ہر طرف غم کے آثار اور گریہ کی آوازیں بلند تھیں، لوگوں کو ان سے ایسا تعلق تھا کہ رمضان بھر لوگوں نے راتیں ان کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن مجید کے ختم کئے۔



نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی

صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ

ایک طرف مرکز اسلام میں پوری قوت سے تصنیفی و تعلیمی کام ہو رہا تھا، اور بعض عظیم شخصیتیں صلاح و تربیت میں مشغول تھیں، دوسری طرف پورے عالم اسلام پر خطرہ کے بادل منڈلا رہے تھے، اور مسلمانوں کی ہستی اور نفس اسلام کا وجود زدن تھا، مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے خار کھائے بیٹھا تھا، مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے، اور اس کے تمام مقدس مقامات اور خود مولد مسیح ان کے قبضہ اور تولیت میں تھا، یورپ کے اشتعال اور جذبہ انتقام کے لئے صورت حال بالکل کافی تھی، لیکن طاقت و اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت پر ان کی مسلسل پیش قدمیوں کے سبب اس کو یہ جو صلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شام و فلسطین یا کسی اسلامی ملک کی طرف نظر اٹھائے، بلکہ جو قی سلطنت کے زوال اور اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدوں کی کمزوری کی وجہ سے یورپ میں قسمت آزمائی کا خیال پیدا ہوا، اسی عرصہ میں اس کو راہب لٹرس کی صورت میں ایک ایسا خطیب اور مذہبی واعظ مل گیا جس نے ساری مسیحی دنیا میں اپنی آتش و ایسوں آگ لگا دی، اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مذہبی جنون کی ایک لہر پیدا کر دی، اس کے علاوہ وسیع و زرخیز اسلامی مملکت پر حملہ کرنے کے اور بھی متعدد سیاسی و معاشی اسباب محرکات جمع ہو گئے جنہوں نے صلیبی حملوں میں دینی و دنیاوی کشش اور ترغیب پیدا کر دی۔

بہر حال ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں کے پہلے لشکر نے شام کی طرف کوچ کیا، دو سال کے عرصہ میں صلیبیوں کے لشکر نے الربا (ایڈیسا) اور ولایت انطاکیہ کے بڑے شہروں بہت سے قلعوں اور حلب پر قبضہ کر لیا، ۱۰۹۲ء مطابق ۱۰۹۹ء میں صلیبی مبارزوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا، اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انطڑوس، عک، طرابلس الشرق اور صیدا صلیبیوں کے تصرف میں آگیا، مشہور انگریز مورخ سینٹ لے لین پول کے بقول صلیبی سپاہی ملک یروشلم کی طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پکڑ ٹھونکے، تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھٹییاں اڑا دیں گے، صلیبیوں نے داخلہ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مورخ ان الفاظ میں کرتا ہے :-

”بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی مجاہدین نے ایسا قتل عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر سوار ہو کر گئے، گھٹنوں گھٹنوں خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں کڑا کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا، یا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا، یہودی کل کے کل اپنے ہیکل (مجد) میں زندہ جلا دیئے گئے“

”دوسرے دن اس سے بڑے پیمانہ پر ان رزہ خیز مظالم کا جان بوجھ کر اعادہ کیا گیا، ٹیکر ڈنے تین سو قیدیوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت کی تھی، وہ چیخا چلاتا رہا، اور ان سب کو باہر لا کر قتل کر دیا گیا، پھر ایک زبردست قتل عام شروع ہوا، مردوں عورتوں اور بچوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیئے گئے، ان کی لاشوں کے ٹکڑوں اور کٹے ہوئے اعضا کے ڈھیر گئے تھے، بالآخر یہ سفاکانہ قتل عام اختتام کو پہنچا شہر کی خون آلودہ سڑکوں کو عرب قیدیوں سے دھلوا دیا گیا“

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور

اس کی نوخیز طاقت کی خبر دیتی تھی، اور عالم اسلام میں خطرہ کی گھنٹی تھی، شام و فلسطین میں مستقل چارویسیائی ریاستیں (قدس، انطاکیہ، طرابلس، اور یافا کی) قائم ہو چکی تھیں، جو مرکز اسلام (حجاز) کی آزادی اور حرمت کے لئے مستقل خطرہ تھیں اور مسیحیوں کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ رنجی نالڈوائی کرک نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اور روضہ اطہر سے متعلق گستاخانہ اور اہانت آمیز کلمات اور ارادوں کا اظہار کیا، حقیقت یہ ہے کہ واقعہ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھڑی نہیں آئی یہ دوسرا موقع تھا کہ اسلام کا وجود خطرہ میں تھا، اور عالم اسلام کو ایک فیصلہ کن جنگ کرنی ضروری تھی۔

چھٹی صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ عالم اسلام میں بڑے انتشار و بدمظنی کا تھا، ملک شاہ سلجوقی کے جانشین باہم دست و گریباں تھے، خلفاء بنی عباس مدلوں پہلے ترکوں کو اپنی طاقت منتقل کر چکے تھے، عالم اسلام میں کوئی طاقتور سلطان اور کوئی ایسا قائد نہ تھا، جو تنظیمی صلاحیتیں رکھتا ہو، اور جو عالم اسلام کی کچی کھجی طاقت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے شمال و مغرب سے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کر سکے، سنیالین پول نے صریح لکھا ہے کہ ”یہ زمانہ القباس و تذبذب کا تھا کہ اتنی وسیع اور عظیم الشوکت (سلجوقی) سلطنت کو موت کے کرب میں ہاتھ پاؤں مالتے دیکھ کر ہر شخص پر تحیر کا عالم طاری تھا، یہ بیچ کا زمانہ اس وقت تک بدظنی کا تھا، جب تک کہ نئی طاقتیں پورے طور پر یکجہت ہو کر ایک ہی سمت میں رجوع نہ ہو جائیں، مختصر یہ کہ یہی وہ ٹھیک وقت تھا، جب کہ یورپ والے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو ممکن کر لیں۔“

اتابک عماد الدین زنگی

لیکن عین اس کشمکش اور بڑھتی ہوئی مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع

ہوا، عالم اسلام کو حسب معمول عین ضرورت کے موقع پر ایک نیا قائد اور ایک تازہ دم مجاہد مل گیا، اور جس گوشہ سے امید نہ تھی، وہاں سے ایک نئی طاقت ابھری، جس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔
لین پول لکھتا ہے:-

”مسلمانوں کے لئے ضروری ہوا کہ وہ جہاد کا اعلان کریں، اور ایک ایسا سردار پیدا کریں جس کی دیرپا اور بہت اور جنگی قابلیت کا سکہ سب ماننے لگیں، ترکمانی سردار اور ان کے ماتحت والیان ملک ایک ایسی جو انمرد اور جنگجو دینداروں کی جماعت پیدا کریں جن کے سامنے صلیبیوں کو اپنے مظالم اور زیادتیوں کا جواب دینا پڑے اور اب یہ سردار عماد الدین زنگی کی ذات میں نمودار ہوا۔“

عماد الدین سلجوقیوں کا پروردہ، نعمت تھا، وہ سلطان محمود سلجوقی کے شہزادوں کا اتالیق (اتابک) اور سلطان کی طرف سے موصول کا حاکم تھا، زنگی نے عراق و شام میں اپنی طاقت مستحکم و منظم کر کے الرہا (ایڈریا) پر حکم کیا جو عیسائیوں کی ریاست میں سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم مقام تھا، اور اس کو بڑی فوجی اہمیت حاصل تھی، ۶ جمادی الاخری ۵۳۹ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۱۴۲ء کو اس نے الرہا پر قبضہ کر لیا، عرب و رومن کے الفاظ میں یہ فتح الفتوح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا سہارا تھا، اس طرح فرات کی وادی صلیبیوں کے خطرہ سے محفوظ ہو گئی، اس فتح کے کچھ عرصہ بعد ۵۴۱ھ مطابق ۱۱۴۶ء میں وہ ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہو گیا، شہادت سے پہلے اس نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کی شاندار ابتداء کر دی تھی، جس کو اس کے نامور فرزند الملک العادل نور الدین زنگی نے بہت آگے تک پہنچا دیا۔

الملک العادل نور الدین زنگی

نور الدین محمود اب سلطان شام تھا، اور تمام مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے اخراج اور بیت المقدس

کے بازیافت کے لئے اپنے کو امور میں اللہ سمجھنا تھا، اور اس خدمت عظیم کو اپنی سب سے بڑی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ جانتا تھا، اس نے اپنے حلوں سے تمام سچی ریاستوں پر دھاک بٹھادی تھی۔ ۱۱۵۹ء میں وہ قلعہ حارم پر قابض ہوا، جو ایک مضبوط شمالی سرحدی قلعہ تھا، بادشاہ انطاکیہ نواب طرابلس مع دیگر مشہور و معروف نائٹوں کے گرفتار ہو گئے، اس محرکین دس ہزار عیسائی قتل ہوئے اور بے شمار قید اس قبضہ کے بعد ہی قلعہ بانیاں فتح کیا، ادھر اس نے مصر فتح کر کے عیسائیوں کو دو طرف سے محصور کر لیا، لہٰذا پُل لکھتا ہے۔

» نور الدین سلطان شام کے سپہ سالار (صلاح الدین) کا روڈیل پر قابض ہو جانا یعنی رکھنا تھا کہ یروشلم کی مسیحی سلطنت ایک چری ہوئی لکڑی کے بیج میں آگئی تھی، دونوں طرف سے وہ دب رہی تھی اور دونوں طرف جو چیز اسے بھینچ رہی تھی، وہ ایک ہی طاقت کے دو لشکر تھے، دیماط اور اسکندریہ کی بندرگاہوں پر قابض ہو جانے سے مسلمانوں کا قبضہ ایک جہازی بیڑے پر بھی ہو گیا، اور انھوں نے مصر کے صلیبیوں کا تعلق یورپ سے منقطع کر دیا۔^{۱۱۶۰}

نور الدین نے تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کر دیا، لیکن اس کی سب سے بڑی آرزو اور سب سے مقدس خدمت بیت المقدس کی بازیابی تھی، لیکن یہ سعادت اس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں تھی، جو خود نور الدین کے حسنت میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، ۱۱۶۹ء مطابق ۱۱۷۰ء کو چھپن برس کی عمر میں بعارضہ خناق اس کا انتقال ہوا، بقول انگریز مورخ سلطان نور الدین بادشاہ شام کے مرنے کی خبر مسلمانوں میں اس طرح پہنچی جیسے آسمان سے بجلی گرے۔^{۱۱۷۱}

نور الدین کے محامد و اوصاف

مسلمان مورخ سلطان نور الدین کے عدل، دیانت و تقویٰ حسن انتظام، شرافت، نفس، محامد اخلاق

اور جذبہ جہاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اور وہ اپنے نام کی طرح ان سب کا "مروج" و "مخوض" ہے۔

ابن جوزی جو سلطان کے معاصر ہیں اپنی مشہور تاریخ المنتظم میں لکھتے ہیں :-

جاهد الثغور وانتزع من ایدی
نور الدین نے سرحدوں پر جہاد کیا اور کفار کے قبضہ
الکفار نیفاً وخصمیین مدینة، وکانت
سے کچھ اوپر پاس شہر آزاد کئے ان کی زندگی اکثر
سیرتہ اصلح من کثیر من الولاة والطر
سلاطین و حکام سے بہتر تھی راستے محفوظ تھے،
فی ایامہ امانة والمحامد لہ کثیرۃ وکان
ان کی تعریف کی باتیں بہت ہیں، وہ خلافت بغداد
یتدین بطاعة الخلافة وترك الملک
کی ماتحتی و اطاعت کا اپنے کو پابند سمجھتے تھے، انتفا
سے پہلے ناجائز محاصل اور ٹیکس معاف کر دیئے
قبل موته وکان یعمل الی التواضع
طبیعت میں سادگی اور تواضع تھی، اور علماء و
ومحبة العلماء واهل الدین۔

اہل دین سے محبت کرتے تھے۔

ابن خلکان جو اپنی مورخانہ احتیاط، جتنے تلے الفاؤں پر تلی تعریف میں مشہور ہیں لکھتے ہیں :-

وکان ملکاً عادلاً لا اهدأ عابداً اورعاً
وہ ایک نصف زاہد عابد متقی، تبع شریعت
متمتکاً بالشریعة مائلاً الی الخیر عیالاً
سلطان تھے، اہل خیر کی طرف بڑا میلان رکھتے
فی سبیل اللہ تعالیٰ لکثیر الصدقات
تھے، اور جہاد فی سبیل اللہ کا خاص اہتمام تھا
بنی المدارس مجیح بلاد الشام الکبار
کثرت سے صدقات و خیرات کرتے، شام کے تمام
وله من المناقب والمناثر والمفاخر
بڑے بڑے شہروں میں مدارس تعمیر کئے، ان کے قب
ما یستخرق الوصف۔^{۵۲}
باید گاروں اور کارناموں کا احاطہ مشکل ہے۔

"تاریخ الکامل کے نامور مصنف ابن الاثیر حزری نے ان کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ :-

وقد طالعت سير الملوك المتقدين
 میں نے گذشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا
 فلم ارفہا بعد الخلفاء الراشدین وعمر
 مطالعہ کیا ہے، خلفاء راشدین اور عمر بن عبد العزیز
 بن عبد العزیز احسن من سيرة ولا اکثر
 کے بعد نور الدین سے بہتر سیرت اور ان سے زیادہ
 تحویلاً منہ للعدل
 عادل سلطان میری نظر سے نہیں گذرا۔

سلطان نور الدین کی وفات کے وقت ابن الاثیر کی عمر ۱۴ سال کی تھی، اس لئے ان کی روایت اور
 شہادت خاص وقعت رکھتی ہے، وہ سلطان مرحوم کی سیرت و اخلاق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”وہ صرف اپنی اس جائیداد کی آمدنی سے کھاتے پہنتے تھے، جو انھوں نے مال غنیمت میں اپنے حصہ کو
 فروخت کر کے خریدی تھی، ان کی اہلیہ نے ایک مرتبہ تنگی کی شکایت کی تو انھوں نے اپنی تین دوکانیں خرچ
 کے لئے دے دیں، جو محض میں ان کی ملکیت تھیں، اور جن کی سالانہ آمدنی بیس دینار کے قریب تھی، جب
 بیوی نے اس کو کم سمجھا تو انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ تم میرے پاس
 دیکھتی ہو وہ سب مسلمانوں کا ہے، میں محض خزانچی ہوں، میں... اس امانت میں خیانت کر کے تمہاری خاطر
 جہنم میں جانا گوارا نہیں کر سکتا۔

وہ رات کو بڑی عبادت کرتے، ان کے اوراد و اذکار مقرر تھے، حنفی فقہ کے عالم تھے، لیکن تعصب سے
 بری تھے، حدیث کا درس لیا، اور ثواب کی نیت سے اس کی روایت کی، اور اجازت دی۔

عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ اپنی وسیع سلطنت میں انھوں نے کوئی محصول اور چنگی باقی نہیں رکھی،
 مصر و شام، جزیرہ موصل سب جگہ اس کو موقوف کر دیا، شریعت کا بڑا ادب کرتے تھے، اور اس کے احکام
 کی تعمیل کرتے، ایک شخص نے ان کو عدالت میں طلب کیا، وہ حاضر ہو گئے، اور قاضی صاحب کو کہلا بھیجا
 کہ میں عدالت میں حاضر ہوا ہوں، میرے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے، مقدمہ میں ان کو کامیابی

ہوئی تو انھوں نے اپنا حق معاف کر دیا، اور کہا کہ میرا پہلے سے یہی ارادہ تھا، لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ شاید عدالت میں حاضری نہ ہونے کا سبب میرا تکبر ہو، اس لئے میں حاضر ہو گیا، اور میں اپنا حق معاف کرتا ہوں، انھوں نے دارالعدل کی تعمیر کی تھی، جہاں وہ قاضی کے ساتھ بیٹھ کر مظلوم کا انصاف کرتے، خواہ وہ یہودی ہوتا، اور ظالم کو سزا دیتے، خواہ وہ ان کا فرزند ہوتا یا بڑے سے بڑا افسر اور حاکم۔

شجاعت ان پر ختم تھی، وہ جنگ میں دو کمائیں اور دو ترکش ساتھ رکھتے تھے، ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کو اللہ کا واسطہ آپ اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کو مصیبت میں مبتلا نہ کریں، انھوں نے جواب دیا کہ محمود کیا چیز ہے کہ اس کے متعلق یہ بات کہی جائے مجھ سے پہلے ملک اور اسلام کی کس نے حفاظت کی؟ وہ موجود برحق ہے، لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ۔

علماء و اہل دین کی تعظیم کرتے تھے، ان کے لئے کھڑے ہو جاتے، اپنے پاس بٹھاتے، بے تکلفی سے باتیں کرتے، کسی بات سے انکار نہ کرتے، اپنے قلم سے ان کو خط لکھتے، لیکن اس تو واضح و خاکساری کے باوجود بڑے رعب و اب کے آدمی تھے، لوگوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کے منافق مخالف کی یہ کتاب متحل نہیں، اس کے لئے دفتر درکار ہے^۱۔

شوق جہاد اور ایمان و یقین

نور الدین کی تمام تر توجہ اور دلچسپی جہاد اور عیسائیوں کے مقابلہ سے تھی، اس بارہ میں اس کا عزم اعتماد و توکل اور ایمان و یقین بہت بڑھا ہوا تھا۔

۵۵۵ھ میں نور الدین کو حصن الاکرا کے معرکہ میں (جو بقیعہ کے معرکہ کے نام سے مشہور ہے) عیسائیوں کے اچانک حملہ کر دینے کی وجہ سے شکست ہوئی، نور الدین حص کے قریب شہن سے چند میل کے فاصلہ پر مقیم تھے،

۱۔ لے الکامل ج ۱۱ ص ۶۳-۶۴ ۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الکامل ج ۱۱ ص ۱۱۹۔

بعض خیر خواہوں نے کہا کہ بادشاہ کا، فتحیاب دشمن کے اتنے قریب قیام کرنا، مناسب نہیں نورالدین نے ان کو خاموش کیا اور کہا کہ اگر ہزار سوا بھی میرے پاس ہوں تو مجھے دشمن کی پروا نہیں، خدا کی قسم میں جب تک اپنا اور اسلام کا انتقام نہ لے لوں گا کسی چھت کے نیچے نہ آؤں گا، نورالدین نے بڑی دریا دلی سے اہل لشکر کو عطایا اور رقوم کی تقسیم کی بعض لوگوں نے ان سے کہا بھی کہ فقہاء، فقراء اور صوفیہ و قراء کے لئے جو وظائف اور رقوم خزانہ شاہی سے مقرر ہیں، ان سے اس موقع پر کام لیا جائے، نورالدین نے غضبناک ہو کر جواب دیا کہ مجھے تو نصرت الہی کی امید رہی فقراء و ضعفاء کی دعا اور رضا سے ہے، حدیث میں آتا ہے کہ ”اللہ کی طرف سے رزق اور مدد کمزور بندوں کی بدولت ہوتی ہے“ میں کس طرح ایسے لوگوں کی مدد بند کر دوں جو ایسے وقت میں میری طرف سے جنگ کرتے ہیں، جب میں اپنے بستر پر سوتا ہوتا ہوں اور ان کے تیر خطا نہیں جاتے، درانحالیکہ جن کا تم تذکرہ کرتے ہو، وہ صرف اس وقت جنگ کرتے ہیں، جب مجھے دیکھتے ہیں، اور ان کے تیر کبھی خطا کر جاتے ہیں، کبھی نشانہ پر لگتے ہیں، ان غریبوں کا تو سبیت المال میں حق بھی ہے، میں ان کا حق لے کر دوسروں کو کیوں کر دے دوں؟

نورالدین نے عیسائیوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی پوری تیاری کی، لشکر کو انعامات و تقسیمات سے نہال کر دیا، سرحدی مقامات اور اسلامی ریاستوں کے امراء و حکام کو پراثر خطوط لکھے، اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ اور شرکت و رفاقت کی ترغیب دی، ان مقامات کے زہاد و عباد اور صلحاء و فقراء کو بھی خطوط لکھے، جن میں فرنگیوں کی زیادتیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا، اور ان سے دعا کی درخواست کی، اور اس کی خواہش کی کہ وہ مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کریں، چنانچہ ان حضرات نے رور و کر لوگوں کو خطوط پڑھ کر سنائے، اور سلطان کے لئے دعا کی، لوگوں میں ہوش جہاد کی ایک لہر پیدا ہو گئی، وایان ملک اپنے اپنے لشکر لے کر آئے، ادھر عیسائیوں نے بھی اپنی پوری طاقت اور ہر طرف کی افواج مقابلہ کے لئے جمع کر دیں، لیکن

سلطان نے اپنی نذر پوری کی، اور عیسائیوں کی متحدہ طاقت پر فتح حاصل کر کے حارم پر قبضہ کر لیا۔ نور الدین کے ایمان و یقین کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قلعہ بانیاس کے محاصرہ میں اس بجائی نصرة الدین امیر ایران کی ایک آنکھ جاتی رہی، نور الدین نے دیکھا تو بجائی سے کہا کہ اگر تم کو وہ اجر و ثواب نظر آجائے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رکھا ہے تو تم کو تنہا ہو کہ دوسری آنکھ بھی راہ خدا میں کام آجائے۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

صلاح الدین ایوبی کی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معجزہ اور اسلام کی صداقت و ابدیت کی روشن دلیل ہے۔

ایک متوسط درجہ کے کرد شریف زادہ اور خاندانی سپاہی کی حیثیت سے ان کا نشو و نما ہوا، ہر کی فتح اور صلیبیوں کے مقابلہ میں میدان میں آنے سے پہلے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کرد و نوجوان

لے الکامل ج ۱۱ ص ۱۲۲، ۱۲۳ ۲۵ ایضاً ص ۱۲۳ ۳۵ سلطان صلاح الدین ایوبی اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کے والد کا نام ایوب تھا، اسی نسبت سے سارا خاندان ایوبی کہلاتا ہے، یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کا کوئی تعلق ابو ایوب انصاری سے ہے، سلطان اور ان کا پورا خاندان نسلاً کر دے، یہ قوم اب بھی عراق، شام، ترکی اور ایران میں پائی جاتی ہے۔

۳۵ ان کے والدین اور اہل خاندان مشرقی آذربائیجان کے گاؤں ”دوین“ کے رہنے والے تھے، ان کا تعلق قبیلہ ہذلیہ کی ایک شاخ ”روادیہ“ سے تھا جو کردوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا شاوی اپنے دونوں لڑکوں ایوب نجم الدین اور شیر کوہ اسد الدین کو لے کر بغداد منتقل ہو گئے تھے، اس کے بعد مکریت میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں شادی کا انتقال ہوا، کچھ دن کے بعد یہ دونوں لڑکے مجاہد الدین بہروز کو تو ال شہر کے علی بن اعلیٰ ہو گئے، جو سلطان مسعود بن خیث الدین محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف سے مامور کیا گیا تھا، نجم الدین ایوب اس کے بعد عماد الدین زنگی

سے متعلق ہو گئے، اور قلعہ ”بلبیک“ وغیرہ کے محافظ بنادینے لگے، (صلاح الدین ایوبی از محمد فرید ابو جید ص ۶۱، ۶۲)

بیت المقدس کا فاتح اور عالم اسلام کا محافظ ثابت ہوگا، اس کی قسمت میں وہ سعادت لکھی ہے جو بڑے بڑے عالی نسب شرفاء اور صلحا کے لئے قابل رشک ہے اور تاریخ میں وہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے گا جس سے روح مبارک تک کو شادمانی حاصل ہوگی۔

لین پول لکھتا ہے کہ ”بجائے اس کے کہ صلاح الدین سے کوئی علامت ایسی ظاہر ہوتی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ آئندہ کوئی بڑا آدمی ہونے والا ہے وہ ایک روشن مثال اس خاموش اور پرامن نیکی کی بنا رہا جو شریف طبیعتوں کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے دور رکھتی ہے“

لیکن جب اللہ تعالیٰ کو ان سے کام لینا منظور ہوا تو اس کا غیبی سامان کیا گیا، ان کو ان کے دلی نعمت نور الدین نے سخت اصرار و حکم سے مصر بھیجا، قاضی بہاء الدین ابن شداد سلطان کے معتقد خاص لکھتے ہیں کہ ”سلطان نے مجھ سے خود بیان کیا کہ میں بڑی ناگواری اور مجبوری سے مصر آیا، میرا مصر آنا بالکل میری مرضی نہیں ہوا، میرا معاملہ بالکل وہی ہے جس کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے وَعَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ“

زندگی میں تبدیلی

مصر پہنچ کر جب صلاح الدین کے لئے میدان بالکل صاف ہو گیا، اور مصر کی زمام ملکیت ان کے ہاتھ میں آگئی تو ان کی زندگی کیسے بدل گئی، یہ خیال دل میں جم گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی بڑا کام لینا ہے، اور اس کام کے ساتھ عیش و راحت کا کوئی جوڑ نہیں۔

قاضی بہاء الدین ابن شداد لکھتے ہیں کہ ”حکومت (مصر) کی باگ ڈور ہاتھ میں آ جانے کے بعد دنیا ان کی نظر میں ہیچ ہو گئی، شکر گزاری کا جذبہ ان کے دل میں موجزن ہوا، شراب سے توبہ کی عیش و تفریح سے منہ موڑ لیا، اور ایک سنجیدہ اور جفاکش زندگی اختیار کی، اور اس میں دن بدن ترقی ہی ہوتی گئی۔“

لین پول بھی یہی لکھتا ہے:-

”اب جہاں تک صلاح الدین کا اپنی ذات سے تعلق تھا، اس نے اپنی زندگی کے قواعد سخت کر دیئے
متقی اور پرہیزگار تو وہ ہمیشہ کا تھا، مگر ابن میں اور سختی اختیار کی دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کا
خیال بالکل ترک کر دیا، اور اپنے اعمال پر بھی سخت پابندیاں عائد کیں، اور اپنے ساتھیوں کے حق میں خود
ایک مثال بنا، اس نے اپنی تمام طبعیت کو ششیں اس بات میں صرف کیں کہ ایک ایسی اسلامی سلطنت
قائم کرے جس میں کفر و کفر کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت ہو، چنانچہ ایک موقع پر اس نے کہا
”جب خدا نے مجھے مصر دیا تو میں سمجھا کہ فلسطین بھی مجھے اللہ کو دنیا منظور ہے“

اس وقت سے صلاح الدین کی زندگی کا مقصد آخر تک اسلام کی نصرت اور حمایت رہا، اور
اس نے عہد کر لیا کہ کفار پر جہاد کرے گا۔^۱

جہاد کا عشق

سلطان کو جہاد سے عشق تھا، جہاد اس کی سب سے بڑی عبادت، سب سے بڑی لذتِ عیش اور اس کی روح
کی غذا تھی۔

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ:-

”جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں سا گیا تھا، اور ان کے قلب و دماغ پر چھا
گیا تھا، یہی ان کا موضوع گفتگو تھا، اسی کا ساز و سامان تیار کرتے رہتے تھے، اور اس کے اسباب و مسائل
پر غور کرتے، اسی مطلب کے آدمیوں کی ان کی تلاش رہتی، اسی کا ذکر کرنے والے اور اسی کی ترغیب دینے
والے کی طرف وہ توجہ کرتے، اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انھوں نے اپنی اولاد اور اہل خاندان اور وطن

”مسیحی لشکر کے چیدہ اور منتخب جوانوں کو قید کر لئے گئے، گائی بادشاہ یروشلم اور اس کا بھائی چائیلون (حنین) کا رنجی نالائقی کا ہمفری طبقات داویہ اور بیطار کے دونوں مقدم اور بڑے بڑے عیسائی شرفاء گرفتار کر لئے گئے..... باقی فلسطین کے تمام عیسائی بہادر اور شہسوار مسلمانوں کے پہرے میں تھے، مسیحی لشکر کے معمولی سپاہی پیدل اور سوار جو زندہ بچے تھے، سب مسلمانوں کے اسیر ہو گئے تھے، ایک ایک مسلمان سپاہی تیس تیس عیسائیوں کو جنھیں خود اس نے گرفتار کیا تھا خیمے کی رسی میں باندھ لے جاتا دیکھا گیا، ٹوٹی ہوئی صلیبوں، اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں میں مردوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے، جیسے پتھر پتھر پڑے ہوں، اور کٹے ہوئے سر زمین پر اس طرح بکھرے پڑے تھے، جیسے خوبوڑیا کے کھیت میں خوبوڑے پڑے نظر آئیں..... مدتوں تک جنگ کا یہ میدان جس میں یہ فونی لڑائی ہوئی تھی، اور جہاں بیان کیا جاتا تھا کہ تیس ہزار آدمی مارے گئے تھے، مشہور رہا ایک سال کے بعد سپید سپید ہڈیوں کے تونے اور ڈھیر دور سے لوگوں کو نظر آتے تھے، اور جانوروں کے کھانے کے بعد جو ٹکڑے لاشوں کے بچے تھے، وہ بھی میدان میں جا بجا پڑے دکھائی دیتے تھے۔“

سلطان کی دینی حمیت

اس فتح کے ساتھ یہ واقعہ بھی تاریخ میں یادگار رہے گا جس سے سلطان کی دینی حمیت اور اس کی قوتِ ایمانی کا اندازہ ہوتا ہے، مناسب ہے کہ یہ واقعہ بھی ہم انگریز مورخ کی زبان سے سنیں۔

”سلطان صلاح الدین نے اپنا خیر رطائی کے میدان میں نصب کرایا جب خیر نصب ہو گیا، تو حکم دیا کہ قیدی سامنے حاضر کئے جائیں، بادشاہ گائی اور کچی نالہ چاٹیلون (حینن) دونوں اندر لائے گئے، سلطان نے بادشاہ یروشلم کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اور اُسے پیاسا دیکھ کر روت میں سر دکنے ہوئے پانی کا

کٹورا دیا، گالی نے پانی پیا، اور پانی کا کٹورا والی کرک ریچی نالڈ کو دیا، سلطان یہ دیکھ کر ناخوش ہوا اور ترجمان سے کہا کہ بادشاہ سے کہو کہ میں نے اس شخص کو پانی نہیں دیا ہے، بادشاہ گالی نے دیا ہے، روٹی اور نمک جسے دیتے ہیں، وہ محفوظ سمجھا جاتا ہے، مگر یہ آدمی اس قسم کی حفاظت میں بھی میرے انتقام سے نہیں بچ سکتا، صلاح الدین انکا کہہ کر کھڑا ہوا اور ریچی نالڈ کے سامنے آیا، ریچی نالڈ جبے خیمہ میں داخل ہوا تھا، برابر کھڑا رہا تھا، سلطان نے اس سے کہا سن! میں نے تجھے قتل کرنے کی قسم دو مرتبہ کھائی تھی، ایک مرتبہ تو اس وقت جب کہ تو نے مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا، دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ تو نے دھوکے اور دغا بازی سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا، دیکھ میں اب تیری بے ادبی اور توہین کا انتقام لیتا ہوں، انکا کہہ کر صلاح الدین نے تلوار نکالی اور حبشیا کہ عہد کیا تھا، ریچی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، جو کچھ رقی باقی تھی اسے پہرے والوں نے آکر ختم کیا۔

بادشاہ گالی اس قتل کو دیکھ کر لرز گیا، اور سمجھا کہ اب اس کی باری آئے گی، صلاح الدین نے اس کا اطمینان کیا، اور کہا کہ بادشاہوں کا دستور نہیں کہ وہ بادشاہ کو قتل کریں، اس شخص نے بار بار عہد شکنیاں کی تھیں، اب جو کچھ گذر گیا گذر گیا!

ابن شداد نے لکھا ہے کہ سلطان نے ریچی نالڈ کو طلب کیا، اور کہا کہ ھا نا انتصر لمحمد علیہ الصلوٰۃ والسلام، (لو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقام لیتا ہوں) ابن شداد نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے اس کو اسلام کی دعوت دی، مگر اس نے قبول نہیں کی۔

لے قاضی ابن شداد کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ جب ان بکس حجاج نے اسے انسانیت و شرافت کی درخواست کی تو اس نے گستاخانہ کہا کہ اپنے محمد سے کہو کہ تمہیں رہائی دیں، یقیناً صلاح الدین کو پہونچا، اور اس نے منت مانی کہ اگر یہ بے ادب اس کے

فتح بیت المقدس

حطین کی فتح کے بعد وہ مبارک موقع جلد آگیا، جس کی سلطان کو بے حد آرزو تھی، یعنی بیت المقدس کی فتح، قاضی ابن شداد نے لکھا ہے کہ۔

”سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی، اور اس کے دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ اس کے متعلیٰ نہیں تھے۔“

اسی سال ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء رجب کو سلطان بیت المقدس میں داخل ہوئے اور پورے ۹۰ برس کے بعد یہ پہلا قبلہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کی تھی، اسلام کی تولد میں آیا، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ سلطان کے داخلہ کی تاریخ بھی وہی تھی، جس تاریخ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی۔ قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:-

”یہ عظیم الشان فتح تھی، اس مبارک موقع پر اہل علم کی بہت بڑی جماعت اور اہل حرفہ اور اہل طرق کی کثیر تعداد جمع تھی، اس لئے کہ لوگوں کو جب ساحلی مقامات کی فتح اور سلطان کے ارادہ کی اطلاع ملی تو مصر و شام سے علماء نے بیت المقدس کا رخ کیا، اور کوئی روشناس اور معروف آدمی سمجھے نہیں رہا، ہر طرف دعا و تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا، بیت المقدس میں (۹۰ برس کے بعد) جمعہ کی نماز ہوئی، قہر منورہ پر جو صلیب نصب تھی، وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا، اور اسلام کی فتح مندی اور اللہ تعالیٰ کی مدد کھلی آنکھوں نظر آرہی تھی۔“

نور الدین زنگی مرحوم نے بیت المقدس کے لئے بڑے اہتمام اور بڑے صرف سے منبر بنوایا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ بیت المقدس واپس دلائے گا، تو یہ منبر نصب کیا جائے گا، صلاح الدین نے حلب سے وہ منبر طلب کیا اور اس کو مسجد اقصیٰ میں نصب کیا۔

اسلامی اخلاق کا مظاہرہ

صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی، دنیادلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا وہ عیسائی مورخ کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

”صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت نائٹ ثابت نہیں کیا تھا جیسا کہ اس موقع پر کیا، جب یروشلم مسلمانوں کے حوالہ کیا جا رہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز افسران ذمہ دار نے جو اس کے تحت تھے، شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی ظلم و زیادتی کو روکتے تھے، اور اس کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی وقوعہ جس میں کسی عیسائی کو گزند پہنچا ہو، پیش نہ آیا، شہر کے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا، اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پرتغین تھا کہ ہر شہر والے کو جو زبردیہ ادا کر چکا ہے، باہر جانے دے“

پھر سلطان کے بھائی العادل اور بطریق اور بالیان کے ہزار ہزار غلام آزاد کرنے کے تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا

”اب صلاح الدین نے اپنے امیروں کو کہ میرے بھائی اپنی طرف سے اور بالیان اور بطریق نے اپنی طرف سے خیرات کی، اب میں اپنی طرف بھی خیرات کرتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں سنا دیں کہ میں تمام بوڑھے آدمی جن کے پاس زبردیہ ادا کرنے کو نہیں ہے، آزاد کر کے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں اور یہ سب باب البحر سے نکلنے شروع ہوئے اور سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک ان کی صفیں شہر سے نکلتی رہیں، یہ خیر و خیرات تھی، جو صلاح الدین نے بیشمار مفلسوں اور غریبوں کے ساتھ کی۔

غرض اس طرح سلطان صلاح الدین نے اس مطلوبہ مفتوح شہر پر اپنا احسان و کرم کیا جب سلطان کے ان احسانات پر غور کرتے ہیں تو وہ وحیائہ کو کیتس یاد آتی ہیں جو شروع کے صلیبوں کے ۱۰۹۱ء میں یروشلم کی فتح پر کیتس نے جب گودھے اور تکیہ ڈیروں کے کوچوں و بازار میں گزرتے تھے تو وہاں مردے پڑے اور جان بلب زخمی لوٹتے تھے جب کہ

بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو ان صلیبیوں کی سخت اذیتیں دے کر رانٹھا، اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا، جہاں
قدس کی چھتوں اور برجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے، وہیں ان صلیبیوں نے انھیں اپنے تیر و گ چھید کر
گرایا تھا، اور جہاں ان کے اس قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹ لگایا تھا، جبکہ اس مقدس شہر کو ظلم و
بدنامی کے رنگ میں انھوں نے رنگایا تھا، جہاں رحم و محبت کا وعظ جناب مسیح نے نایا تھا، اور فرمایا تھا کہ
خیر و برکت ملے ہیں، وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں، ان پر خدا کی برکتیں نازل رہتی ہیں۔

جس وقت یہ عیسائی اس پاک و مقدس شہر کو مسلمانوں کا خون کر کے اس کو نذرِ بزار ہے تھے اس وقت وہ ان کلام کو بھول گئے تھے، اور ان بے رحم عیسائیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں ان پر رحم و کرم ہو رہا تھا۔

صفاتِ خداوندی میں سب سے بڑھ کر صفتِ رحم ہے، رحمِ عدل کا تاج اور اس کا جلال ہے، جہاں عدل اپنے اختیار اور استحقاق سے کسی کو جان سے مار سکتا ہے، رحم جان بچا سکتا ہے۔

اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یرشلم کو باریاب کیا، تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالیٰ و صلہ انسان اور صلاحیت اور شہامت میں مکیا، اور بے مثل شخص تھا۔^{۱۱}

صلیبی سیلاب

بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر ابل پڑا، جس میں یورپ کے تقریباً تمام مشہور جنگ آزما، اور مشہور بادشاہ اور سپہ سالار تھے، قیصر، فریڈرک، رچرڈ شیردل، شاہان انگلستان، فرانس، صقلیہ، آسٹریا

برگنڈی، فلانڈرز کے ڈیوک اور نارٹ اپنی آہن پوش فوجوں کے ساتھ امنڈ آئے، ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا، اور اس کے اعتراف اور چند حلیف جو پورے عالم اسلام کی طرف سے ممانعت کاہتے تھے

صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل

آخر پانچ برس کی مسلسل غوریز و فوجوں آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۲ء میں رملہ پر دونوں جویوں میں جو ٹھک کر چھوڑ دیے گئے تھے، صلح ہوئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدرستہ ان کے قبضہ میں رہے، ساحل پر عسکری مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اور سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگین تھا، صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی، اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا، اس کے ہاتھوں مکمل ہوا، عیسائی مورخ اس کی کامیابی اور جنگ صلیبی کے نامبارک سلسلہ کے اختتام کا ذکر اس طرح کرتا ہے:-

• جنگ مقدس فاتحہ کو پہنچا، پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں، جولائی ۱۱۹۲ء میں جلیلین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دو دہائیوں کے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک لچ زمین بھی نہ تھی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے، تو صور سے لے کر یافک ساحل پر بحر زین کی ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، اس صلح نامہ پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی، عیسائیوں کو کچھ فتح کیا تھا، اس کا بڑا حصہ فرنجیوں کے پاس رہا، لیکن اگر صرف جان مال کا لحاظ کیا جائے، تو نتیجہ نہایت حیرت انگیز تھا، پاپاے روم کی فریاد سنتے ہی کل عیسائی دنیا نے ہتھیار اٹھائے تھے، قیصر فریڈرک شاہ ان انگلستان فرانس و صقلیہ، آسٹریا، کالیپولڈ برگنڈی کا ڈیوک، فلانڈرز کا کاؤنٹ صدا مشہور و معروف بیرن اور تمام عیسائی قوموں کے نارٹیرولم کا عیسائی بادشاہ اور غلطین کے دیگر عیسائی و ایوان ملک طبقہ داویہ اور طبقہ البیطار کے بڑے بڑے شہسوار اس کو شش میں مصروف ہوئے کہ بیت المقدس پر اپنا

قبضہ اور بیروٹلم کی مسیحی سلطنت جو ٹٹنے کے قریب ہے، پھر سرسبز ہو جائے، لیکن انجام کیا ہوا؟ اسی دوران میں تیسرے فریڈرک قضا کر گیا، شاہان انگلستان، فرانس اپنے اپنے ملک کو سدھائے اور ان کے بڑے بڑے شریف اور معزز ساتھی ارض ایلیا میں خاک کا پیوند ہوئے، لیکن یروشلم اس پر بھی سلطان صلاح الدین کا رہا، صرف ساحل عکہ کی مختصر سی ریاست پر اس کا برائے نام عیسائی بادشاہ حکومت کرتا رہا۔ تیسری جنگ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی، مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹٹ سے نہ کر سکی، صلاح الدین کی سپاہ ہمینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی محروشی اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی، مگر کسی زبان پر حوت شکایت نہ تھا کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا، دریائے دجلہ کی دور دراز وادیوں میں ممکن ہے کہ سلطان کے تابع و ایان ملک کے دل میں اس ہمیشہ کی طلبی ملک پر کچھ شکایت پیدا ہوئی ہو، لیکن بہر کیف اپنی اپنی فوجیں سلطان کی خدمت میں بڑی جان نثاری اور نیک خواہی کے ساتھ لائے، آخری جنگ جو ارسوت پر ہوئی، اس میں موصل کی فوجوں نے بڑی مردانگی اور جانبازی سے کام لیا، ان تمام لڑائیوں میں سلطان کو ہمیشہ مصر اور عراق کی فوجوں سے مدد ملنے کا بھروسہ رہا۔۔۔

اور یہی تقویت ملک شام کی شمالی اور مرکزی فوجوں سے رہی، کوہترکان، عرب، مصری سب مسلمان اور سلطان کے خادم تھے، او طلبی پر خادموں کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے، باوجود اس کے کہ ان کی نسل و قوم جدا تھی، اور باوجود قومی چشمکوں اور قبائلی غرور و تفاخر کے سلطان نے ان کو ایسا اثر و شکبنا رکھا تھا کہ تمام لشکری و واحد نظر آتا تھا، سب ایک ہی لشکر کے رکن رہے، دو ایک مرتبہ اس میں شک نہیں کہ ان کو متفق اور متحد رکھنے میں مشکلات پیش آئیں، اور بعض نازک مواقع ایسے بھی آئے کہ ان کی طبیعتوں میں فرق پیدا ہوتا معلوم ہوا، باوجود یا پرفوج کے فرد کے یہ تمام مختلف النسل قومیں ۱۱۹۲ء کے موسم غزوت تک سلطان کے حکم کے تابع رہیں، اور جس طرح ۱۱۸۷ء میں پہلی مرتبہ خدا کی

راہ میں کام کرنے کو انھیں طلب کیا تھا، اسی طرح اخیر تک راہ خدا میں وہ کام کرتی رہیں، اس تمام زمانہ میں نہ تو سلطان کا کوئی صوبہ اس سے منحرف ہوا اور نہ کسی ماتحت سردار یا بلج گزدار ریاست نے اس سے بغاوت کی، گو جو تو قحاحات ان کی خیر خواہی اور جفاکشی سے رکھی گئی تھیں وہ کافی طور پر ایسی تھیں کہ مضبوط سے مضبوط اعتقاد اور قیادت کی طاقت کو بھی آزمائش میں لا کر ہرا دیتیں، صرف عراق میں سلطان کے ایک عزیز کی سرکشی کی مثال جس کی اصلاح فوراً معافی لے کر کر دی گئی، ایسی ہے جس کا استثنا اس اثر کو اور قوت کے ساتھ ثابت کرتا ہے، جو سلطان اپنی رعایا پر رکھتا تھا، جب جنگ پنج سالہ کی یہ آزمائشیں اور تکلیفیں ختم ہوئیں تب بھی سلطان کردستان کے پہاڑوں سے لے کر صحرائے نوبہ تک بذاتِ واحد حکمران رہا، اور ان حدود سے بھی دور کردستان کا بادشاہ ارمینہ کا کاتلین (حاکم وقت) قونیہ کا سلطان اور قسطنطنیہ کا قیصر اس بات کا شوق رکھتا ہے کہ صلاح الدین کو اپنا دوست اور مدد و معاون سمجھیں، لیکن صلاح الدین ان دوستوں اور اتحادیوں میں سے کسی کا زیر بار احسان نہ ہوا، اس کی مدد کو نہ آئے مبارکباد دینے البتہ حاضر ہوئے یہ کل کشمکش صرف صلاح الدین نے کی تھی، بجز سلطان کے بھائی العادل کے جو آخری زمانہ میں بین طور پر سب کے سامنے آیا، ممکن نہیں کہ کوئی شخص کسی ایک پہ سالار یا مشیر کو بتا سکے جس کی نسبت کہہ سکیں کہ وہ سلطان کا مشیر یا صلاح کار ہو کر اس پر حاوی ہو گیا تھا، ایک مجلس حرب البتہ اس کے یہاں تھی، جو معاملات جنگ میں مشورہ دیتی تھی، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ سلطان کی صیغہ رائے پر اس کی غلط رائے غالب آگئی، جیسا کہ صورا اور عکد کے سامنے ہوا تھا، لیکن اس مجلس میں بھی اس کے کسی ایک رکن کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے کہ اس کی رائے نے سلطان پر کسی دوسرے کی رائے سے زیادہ اثر کیا ہو، بھائی بیٹے، بیٹھے، پڑنے رفیق، نئے ماتحت عامل، اور ہوشیار قاضی، محتاط اور وقار شعار متحد وزیر، متعصب و اعظا، اور ملا سبھی اس میں متفق الکلام تھے کہ جہاد کیا جائے اور سب میں شریک بھی ہوئے، اور سب نے آفاقی بڑی تندی اور خیر خواہی سے اپنی اپنی لیاقت اور قوت کے مطابق مدد کی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا، جو اس بات کو بھولا ہو کہ آقا کون ہے؟ اس تشویش فکر اور محنت و

جانفشانی کے نازک وقت میں صرف ایک دل اور ارادہ تھا، جو سب پر حاوی تھا، اور یہ دل اور ارادہ سلطان صلاح الدین کا تھا۔

وفات

بالآخر اپنا مقدس فریضہ ادا کر کے اور عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے محفوظ کرنے کے بعد ۲ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا، اس وقت ان کی عمر ساڑھن سال کی تھی، قاضی بہاء الدین بن شداد سلطان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”۲ صفر کی شب کو جو سلطان کی علالت کا بار ہوا دن تھا، مرض میں شدت ہو گئی، اور قوت گھٹ گئی شیخ ابو جعفر امام الکلاہ کو جو ایک نہایت صالح اور بزرگ شخص تھے، زحمت دی گئی کہ رات کو قلعہ میں رہیں کہ اگر رات کو وہ ساعت مقررہ آگئی، جو سب کو پیش آنے والی ہے تو وہ اس وقت سلطان کے پاس ہوں اور ان کو تلقین کر سکوں، اور اللہ کا نام لیں، رات کو سلطان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفر کے لئے پارہا پارہ ہیں، شیخ ابو جعفر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تلاوت و ذکر میں مشغول تھے، تین دن پہلے سے ان پر ایک ذہول اور غفلت طاری تھی، کسی کسی وقت ان کو ہوش آتا تھا جب شیخ ابو جعفر نے تلاوت کرتے ہوئے **عُوذُ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ عَالِمُ الْغُیْبِ وَالشَّہَادَۃِ** پڑھی تو سلطان کو ہوش آگیا، ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، اور پھر کھل گیا، اور کہا صبح ہے، اور یہ کہ کہ جان جان آفریں کے سپرد کی، یہ چہا خند کاون صفر کی پہنچ اور فجر کا وقت تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خلفائے راشدین کی وفات کے بعد سے ایسا سخت من مٹانوں کی تاریخ میں نہیں آیا، قلعہ، شہر اور تمام دنیا پر ایک وحشت سی رہی تھی، اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیسا ستاٹا اور کبھی اسی تھی، میں پہلے جب سنتا تھا کہ لوگ دوسروں پر قربان ہو جانے اور ان کا فدیہ لینے

کی تہنکارتے ہیں تو سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک مجاز اور تکلف کی باتیں ہیں، لیکن اس دن معلوم ہوا کہ یہ حقیقت ہے، خود میں اور بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ سلطان پر اپنی جان قربان کر سکیں، اور اس کی طرف سے فدیہ ہو جائیں تو وہ اس کے لئے تیار تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ سلطان اپنے ترکہ میں صرف ایک تینار اور ۴۴ دہم چھوٹے تھے، کوئی ملک مکان، جائیداد، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تدفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھانس کے پوئے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔

درویش سیرت سلطان

قاضی ابن شداد سلطان کی سیرت، اخلاق و عادات اور خصوصیات میں لکھتے ہیں :-

”سلطان نہایت صحیح العقیدہ، راسخ الاعتقاد مسلمان تھے، عقائد میں اہل السنۃ و الجماعۃ کے ہم مسلک تھے“

ہم اعتقاد نماز و واجب کے بڑے پابند، ایک موقع پر فرمایا کہ ساہا سال ہو گئے، میں نے ایک نماز بھی بے جہتا

نہیں پڑھی، حالت مرض میں بھی امام کو بلا لیتے، اور تکلف کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، سنن و اہل بیت پر

مداومت تھی، رات کو حتی الامکان نوافل پڑھتے، اگر رات کے نوافل رہ جاتے تو (از شافیہ کے مسلک کے

مطابق) نماز فجر سے پہلے ادا کرتے، ان کو آخری بیماری میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا، صرف تین دن

جن میں ان پر بیوشی طاری رہی، نماز فوت ہوئی، زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت ہی نہیں آئی، اس لئے کہ

انھوں نے کبھی اتنا پس انداز ہی نہیں کیا، جس پر زکوٰۃ فرض ہو، ان کی ساری دولت صدقات و خیرات میں

خرچ ہوئی، صرف ۴۴ دہم نامری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائیداد، ملکیت نہیں چھوڑی۔

رمضان میں روزے کے سخت پابند تھے، کچھ روزے ان کے ذمہ باقی تھے، قاضی فاضل کی یادداشت میں تحریر تھے، وفات سے پہلے پہلے بڑے اہتمام سے وہ سب روزے قضا کئے، معالج نے ہر چند متح کیا، لیکن فرمایا کہ کل کا حال مجھے معلوم نہیں، چنانچہ ان کی قضا کے بعد ہی خود قضا کر گئے۔

حج کی بڑی آزد تھی، لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا، وفات کے سال اس کا شوق بہت غالب تھا، لیکن نوبت نہیں آنے پائی۔

قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا، کبھی کبھی اپنے برج میں پہرہ داروں سے دو دو تین تین چار چار پارے سن لیتے، بڑے شائع، واضح، رقیق القلب تھے قرآن مجید سن کر اکثر آنکھوں میں آنسو جاری ہو جاتے، حدیث سننے کے بڑے شائق تھے، اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے، حدیث کی قرأت کے وقت لوگوں کو احقر تا بیٹھ جانے کا حکم دیتے، اگر کوئی عالی سلسلہ حدیث کا شیخ ہوتا تو خود اس کی مجلس میں جا کر حدیث سننے، خود بھی حدیث کے قرأت کا شوق تھا، اگر کسی حدیث میں کوئی عبرت کی بات ہوتی تو آنکھیں پونہم ہو جاتیں، میو میدان جنگ میں بعض مرتبہ دو صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث کی سماعت کی کہ یہ وقت خاص فضیلت کا ہے، دینی شاعر کی بڑی تعظیم کرتے، مہروردی محمد کو انہی کے ایما سے ان کے صاحبزادہ الملک الظاہر نے قتل کروایا ان کو خدا پر بڑا بھروسہ اور اس کی ذات عالی کے ساتھ بڑا حسن ظن تھا، کھٹن کھڑوں اور نازک اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعا و مناجات کی عادت تھی، ایک مرتبہ بیت المقدس کو صلیبی افواج کی طرف سے جو اس کے قریب مجتمع تھیں، سخت خطرہ لاحق تھا، سلطان کو بیت المقدس کی بڑی فکر تھی، اور وہ کسی طرح بھی وہاں سے چلے جانے پر راضی نہ تھے، شب جمعہ تھی، جازلوں کی راتیں تھیں، میں تنہا خدمت میں حاضر تھا، ہم دونوں رات بھر ذکر و دعا میں مشغول رہے، سلطان کے علاج پر اکثر خشکی اور یوسست غالب آیا یا کرتی تھی، رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ ان کا مزاج نامساز ہو جائے گا، میں نے عرض کیا کہ کچھ دیر آرام فرمالیں، فرمایا شاید تمہیں نیند آنے

سنایا ہے اس لئے مجھے مشورہ دیتے ہو؟ یہ کہہ کر وہ اٹھے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں موزن نے صبح کی اذان دی
 میں عموماً فجر ساتھ ہی پڑھا کرتا تھا، حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال رہے ہیں، مجھے دیکھ کر
 فرمایا کہ میں نے جھپکی بھی نہیں لی، ہم نماز میں مشغول ہو گئے، مجھے ایک خیال آیا، اور میں نے عرض کیا کہ میرے
 ذہن میں ایک بات آئی ہے، اور انشاء اللہ وہ مفید ہوگی، وہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس
 گواہ کو اگر دعا مانگیں، اولین رکھیں کہ وہی یہ مشکل آسان کر سکتا ہے، فرمایا کہ اس کی کیا ترکیب ہے؟ میں نے
 عرض کیا کہ آج جمعہ کا دن ہے، مسجد جاتے ہوئے آپ غسل فرمائیں، اور مسجد اقصیٰ میں اس مقام پر نماز پڑھیں
 جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم عراج میں تشریف لے گئے، اور پہلے کسی معتبر آدمی کے ذریعہ بالکل پوشیدہ طور پر
 کچھ صدقہ کریں، پھر اذان و اقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھیں ایک حدیث میں اس کی فضیلت
 اور اس وقت دعا کی قبولیت کی خبر دی گئی ہے، اور سجدہ میں سر رکھ کر عرض کریں کہ خدا یا مادی اسباب او
 دنیاوی سہارے سب ٹوٹ چکے، اب تیرے دین کی مدد اور فتح کے لئے صرف یہی سہارا رہ گیا ہے کہ تیرے
 آستانہ پر سر رکھ دیا جائے، اور تیرے سہارے کو مضبوط کر لیا جائے، اب صرف تیرا بھروسہ ہے، اولاً ہی
 میرا حامی و ناصر ہے، مجھے امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائے گا، سلطان نے ایسا ہی کیا
 میں نے اپنے معمول کے مطابق ان کے پہلو میں نماز پڑھتی میں نے دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہیں، آنسوؤں
 سے ان کی داڑھی تر ہو گئی ہے، اور جاننا ز پر آنسو ٹپ ٹپ کر رہے ہیں، میں نے نہیں سنا کہ انھوں نے
 کیا دعا کی، اسی دن سے ان کی دعا کے قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگے، صلیبی فوجوں میں انتشار و
 اضطراب پیدا ہوا، پے در پے اطمینان بخش اطلاعات آتی رہیں، یہاں تک کہ دو شنبہ کی صبح تک
 میدان بالکل صاف ہو گیا، اور حملہ آور فوجیں بیت المقدس کا خیال چھوڑ کر رمل کی جانب
 چلی گئیں۔

محاسن اخلاق

جادات و فضائل اعمال کے علاوہ حاکمانہ فضائل، عدل، عفو و حلم، جود و سخاوت، مروت و شرافت، صبر و استقامت، شجاعت و فتوت اور شہامت و علو ہمت کے اوصاف عالیہ سے آراستہ تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ ”ہفتہ میں دو بار، دو شنبہ و پنجشنبہ کو اذن عام ہوتا تھا، فقہاء، قضاة و علماء اور اہل مقدمہ حاضر ہوتے، بڑے چھوٹے امیر غریب، بوڑھے اور عام بڑھیوں تک کو آنے کی اجازت تھی، سفر و حضر میں بھی اس معمول میں فرق نہ آتا، رات دن میں ایک بار خود معاملات کو دیکھتے، اور رقعات و فراہین پر خود دستخط کرتے، کبھی کسی صاحب غرض اور حاجت مند کو ناکام واپس نہ کرتے، اس کے ساتھ ساتھ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے۔

اگر کوئی فریاد یا شکایت کرتا تو خود کھڑے ہو کر اس کا مقدمہ سنتے اس کی دلداری کرتے اور اس معاملہ سے پوری دلچسپی لیتے، ایک مرتبہ ایک معمولی شخص نے ان کے بھتیجے تقی الدین کے خلاف (جو سلطان کو بہت عزیز تھے) دعویٰ کیا، سلطان نے فوراً ان کو طلب کیا، اور مقدمہ کی سماعت کی، خود ان کے خلاف ایک شخص نے دعویٰ کیا، سلطان نے معاملہ کی پوری تحقیق کی، اگرچہ مدعی کا حق ثابت نہیں ہوا، لیکن سلطان نے اس کو ناکام واپس نہیں کیا، اور خلعت و مال سے سرفراز کیا۔

بڑے بردبار اور متحل مزاج تھے، مورخ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ”اپنے رفقاء و خدام کی غلطیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی کرتے، بعض مرتبہ کوئی ایسی بات سنتے جس سے ان کو تکلیف یا ناگوار ہو، لیکن وہ اس کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے اور نہ اپنے طرز عمل سے کوئی فرق آنے دیتے، ایک مرتبہ پانی مانگا، پانی نہیں آیا، پھر مانگا، پھر نہیں ملا، یہاں تک کہ ایک ہی مجلس میں پانچ مرتبہ

کو نوبت آئی، آخر میں کہا کہ دوستو! میں تو پیاس سے مر جا رہا ہوں، اتنے میں پانی آیا، سلطان نے پی پیا۔

اور اس تاخیر پر کچھ نہ کہا، ایک مرتبہ سخت بیماری سے اٹھے اور غسلِ صحت کے لئے حمام میں گئے پانی بہت گرم تھا، ٹھنڈا پانی مانگا، خادم نے پانی حاضر کیا، پانی کچھ پھلک کر ان پر گرا، ضعف کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوئی، پھر ٹھنڈا پانی مانگا، اس مرتبہ ٹھنڈے پانی کا پورا طشت گر گیا، اور سارا پانی ان پر آگیا، اور وہ مرتے مرتے بچے، لیکن صرف اتنا کہا کہ مجھے مارنے کا ارادہ ہو تو کہ دو، خادم نے معذرت کی اور وہ خاموش ہو گئے، اور کوئی باز پرس نہیں کی، قاضی ابن شداد نے سردارانِ فوج کی غلطیوں اور اہل دربار کی بے عنوانیوں سے درگزر اور سلطان کے عفو و حلم کے متعدد موثر واقعات لکھے ہیں۔^{۳۵}

”جو دو سخاوت کا یہ حال تھا کہ بقول ابن شداد بعض اوقات فتح کئے ہوئے صوبے دوسروں کو بخش دیئے آدھ فتح کیا، ایک سردار ابن قرہ ارسالا نے ان سے خواہش کی اور انھوں نے بخش دیا بعض مرتبہ سامانِ بیچ کر وفود کو عطایا و انعامات سے نوازتے، محافظینِ خزانہ بعض اوقات کسی نازک وقت کے لئے کچھ چھپا کر رکھ لیتے کہ سلطان کو اگر خبر ہوگی، تو وہ رہنے نہیں دیں گے، ایک مرتبہ انھوں نے دوسروں پر رکھ کر یہ بات کہی کہ بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جو روپیہ اور مٹی کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے اپنا ہی حال بیان کیا ہے۔“^{۳۶}

”مرگوت و شرافت کا یہ حال تھا کہ آنے والے اور ملاقات کرنے والے کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے، خواہ کافر ہو، صید کا والی ملاقات کے لئے آیا، سلطان نے اس کی بڑی خاطر کی، اپنے ساتھ کھانا کھلایا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت بھی دی، اور اس کے فضائل و محاسن بیان کر کے اس کو اسلام کا ترغیب دی، اس مرگوت و شرافت کا نتیجہ تھا کہ اپنے سب سے بڑے حریف رچرڈ کو اس کی بیماری میں مبتلا اور پھل بھیتے رہے۔“^{۳۷}

۱۔ تاریخ ابن خلکان ترجمہ سلطان صلاح الدین ۳۵۰ ایضاً ۳۵۱ النوادر السلطانیہ ص ۲۲۱۲ ۳۵۲ ایضاً ص ۱۲۱۳

۲۔ الفتح القدسی فی الفتح القدسی عماد الدین الکاتب۔

”سلطان بڑے شریف النفس، رقیق القلب اور درد مند انسان تھے، ظلم کو برواشت نہ کر سکتے تھے کسی آفت رسیدہ کو ورنہ مخلوق کی تکلیف کی تاب نہ لا سکتے، ابن شداد لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عیسائی بڑھیا ان کے پاس آئی، وہ سینہ پیٹتی تھی اور برابر روتے جا رہی تھی، سلطان نے سبب پوچھا، کہا کہ میری چھوٹی سی بچی کو ڈاکو میرے خیمہ سے اٹھالے گئے، مجھے روتے پوری رات ہو گئی، سلطان کے ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ سلطان شفیق و مہربان ہیں، ہم تمہیں ان کے پاس پہنچا دیتے ہیں، تم ان سے فریاد کرنا، انھوں نے مجھے آپ کی خدمت میں پہنچا دیا، اب میں اپنی بچی آپ ہی سے لوں گی، سلطان کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا، ان کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں، اسی وقت ایک شخص کو لشکر کے بازار میں بھیجا کہ تحقیق کرے کہ کس نے اس کی بچی کو خرید لیا ہے، جس نے خریدا ہو، اس کو قیمت دے کر، اور بچی کو لے کر آئے، تھوڑی دیر میں وہ سواد بچی کو کاندھے پر لئے ہوئے نظر آیا، بڑھیا زمین پر گر گئی اور اپنی پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک اپنی (مغربی) زبان میں کچھ کہتی رہی پھر غوش غوش اپنی بچی کو لے کر چلی گئی۔“

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ جب سلطان کسی تیم کو دیکھتے تو محبت و شفقت کی باتیں کرتے، اور اس کی دجوئی فرماتے، اس کو کچھ عنایت فرماتے، اگر کوئی پرورش کرنے والا نہ ہوتا تو اپنی طرف سے اس کا کچھ انتظام فرماتے، اسی طرح جب کسی غیر شخص یا اور بچے کو دیکھتے تو بڑے متاثر ہوتے، اس کے ساتھ کچھ سلوک کرتے۔“

مردانہ اوصاف

صبر و انتقامت اس درجہ کی تھی کہ قاضی ابن شداد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ کمرے گھنٹوں تک اس قدر دلنے اور پھوٹے تھے کہ بیٹھنے سے معذور تھے، یہاں تک کہ دسترخوان بچھا اور کھانا تناول نہ کر سکے اس لئے کہ بیٹھنے کی قدرت ہی نہ تھی، اس کے باوجود دشمن کے مقابل صفت آرا تھے، میں نے دیکھا ہے کہ صبح سے

مغرب تک گھوڑے پر سوار ایک طرف سے دوسری طرف برابر چکر لگاتے اور افواج اور انتظامات کا معائنہ فرماتے اور پھوڑوں کی تکلیف کو تحمل سے برداشت کرتے، میں تعجب کا اظہار کرتا تو فرماتے کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔

ایک مہر میں حالت بیماری میں برابر دشمن کا تعاقب کیا، ایک رات میں اور طبیب سلطان کے پاس تھے، ہم تیمارداری بھی کرتے تھے اور ان کی طبیعت بھی پہلاتے تھے، سلطان کبھی سوتے کبھی جاگتے، یہاں تک صبح ہو گئی، سلطان سوار ہو کر تیار ہو گئے، اپنے لڑکوں کو انٹر کے راستے میں سب آگے کیا، اور سب کو خدا کے نذر کر دیا، ایک ایک کر کے سلطان نے سب کو روانہ کر دیا، صرف میں اور طبیب رہ گئے، شام تک سلطان اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور جنگ کی نگرانی کی، یہاں تک کہ رات کو لشکر کو مستح اور ہوشیار رات گزارنے کی اجازت ملی، اور ہم اور سلطان اپنے خیمہ میں واپس آئے۔

شجاعت میں سلطان ضربا مثل تھے، قاضی ابن شداد راوی ہیں کہ سلطان دن میں ایک ایک دو بار دشمن کے گرد گشت کرتے، گھسان کی لڑائی میں سلطان تنہا گھوڑے پر صفوں کے درمیان چکر لگاتے، ایک کو تل گھوڑا سائیس کے ساتھ ہوتا، اور وہ خیمہ سے میسر تک فوجوں میں گھستے، صفیں چیرتے نکل جاتے فوجی دستوں کو بلاتے، ان کو مناسب مقامات پر پھرنے یا بڑھنے کا حکم دیتے، ان کے اطمینان اور بے خوفی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ سلطان نے مختلف مواقع پر حدیث سنی ہے، لیکن کبھی عین مہر کے اور دو صفوں کے درمیان حدیث سننے کی نوبت نہیں آئی، اگر یہ شرف بھی حاصل ہو جا تو بہت اچھا ہے چنانچہ سلطان نے صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث شریف کی سماعت کی، انھوں نے کبھی دشمن کی تعداد کی پرواہ نہیں کی، اور نہ کبھی اس کا اثر قبول کیا، بعض بعض مرتبہ پانچ پانچ چھ لاکھ کی تعداد ان کے مقابلے میں تھی، اللہ نے ان کو فتح دی، اور کثیر خلقت قتل اور گرفتار ہوئی، ایک مرتبہ دشمن کے کچھ اوپر

علم و فضیلت

”اس کا اصلی رجحان طبیعت و دنیا کی طرف تھا علمائے وقت سے احادیث سننے، ان کے براہین اور راویوں کے سلسلہ کی تحقیق، مسائل فقہ پر بحث، آیات قرآنیہ کی تفسیر میں اسے بڑا انہماک رہتا تھا، اور سب سے بڑھ کر اس بات کا ذوق تھا کہ مذہب اہل سنت و الجماعت کی تائید اور ثبوت قوی دلائل سے دیا جائے۔“

فاطمی حکومت کا زوال و اصلاح الدین کا دوسرا کارنامہ

سلطان صلاح الدین کا مصر میں اقتدار عبیدی سلطنت (جو عام طور پر فاطمی شہزادے کا خاتمہ تھا) ۵۹۹ھ سے ۶۴۶ھ تک پورے دو سو اڑسٹھ سال بڑی شان و شوکت سے قائم رہی، اور اس نے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ کے عقائد، اعمال و اخلاق اور تمدن پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا، یہ دور حکومت اعتدالی عجائبات عجیب و غریب احکام اور مضحکہ خیز قوانین سے پر تھا جس کے بعض نمونے مشہور مورخ مقریزی کی کتاب مخطوط الآثار سے پیش کئے جاتے ہیں:-

۳۶۲ھ میں قانون میراث میں ترمیم کی گئی، اور قانون بنایا گیا کہ اگر ستونی نے بیٹی چھوڑی ہو تو بیٹے بھتیجے بچا وغیرہ کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، اس قانون کی خلاف ورزی کو حضرت فاطمہؑ کے ساتھ عداوت کا ماردن سمجھا جاتا ہے ہلال کا دیکھنا پوری ملک مصر میں موقوف ہو گیا روزہ اور عید حساب سے ہونے لگے۔ ۳۷۲ھ میں پورے ملک مصر میں تراویح کی سرکاری مانعت کر دی گئی، موطا امام مالک کے ایک نسخہ کے پائے جانے پر ایک شخص کی تشہیر کی گئی۔

۳۹۲ھ میں ۱۳ آدمیوں کو اس جرم میں زد و کوب کیا گیا، اور ان کی تشہیر کی گئی کہ انھوں نے صلوات بعضی (ناز چاشت) پڑھی تھی، ۳۹۵ھ میں طوخی (ایک نرکاری) کو جو اہل مصر کو بہت مرغوب تھا، اس نے ممنوع قرار دیا گیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت پسند تھی، برصیرہ کی اس نے مانعت ہوئی کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو مرغوب تھی، اسی سلسلہ میں تمام مساجد دیواروں، مقابر اور صحن میں سلف کو ست و شتم اور لعنت لکھی گئی، اور اس کو منقش کیا گیا، ۴۱۱ھ میں ”الظاهر لا عزاء دین اللہ“ نے شراب کی عام اجازت

۱۔ محققین انساب کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ بنی عبید کو خاندان نبوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، ان کا مورث اعلیٰ عبید بن جحسہ یا یہودی تھا، قاضی ابوبکر محمد بن الطیب نے اپنی کتاب ”لکشف جن اسرار الباطنیہ“ اور قاضی عبد الجبار نے کتاب ”تبیات النبوة“ اور

مقدس نے اپنی کتاب ”لکشف ما کان علیہ بنو عبید“ میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

دی، عیش و عشرت اور لہو و لعب کی گرم بازاری ہوئی، اسی زمانہ میں ملک میں سخت گرائی اور بیاریوں کا زور تھا، لوگ محل شاہی کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور اجوع اجوع (بھوک بھوک) کے نعرے لگاتے تھے، لوٹ مار کی کثرت ہوئی۔ ۳۲۴ء میں فی عہد جس کی عمر سال کی تھی، سواری نکلی تمام بازار آستہ تھے، لوگ زمیں بوس ہوتے تھے۔ ان خلفاء میں متعدد اشخاص ایسے تھے، جو نہایت کمسنی میں خلیفہ بنائے گئے، اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت فرض قرار دی گئی، مستنصر باللہ شرب خلیفہ ہوا تو سات برس کی عمر تھی، آخر احکام اللہ کی عمر خلافت کے وقت پانچ سال ایک مہینہ کچھ دن تھی، الفاطمہ ناصر اللہ خلافت کے وقت صرف پانچ سال کا تھا، عاصد الدین اللہ کی عمر جب وہ خلیفہ ہوا گیارہ سال تھی۔

سلطان صلاح الدین کی حکومت سے اس دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہوا مصر سے شیعیت و رفض کے آثار مٹنے لگے، سنت کا فروغ ہوا، جاہل مدارس قائم ہوئے جن میں علمائے سنت علوم و دینیہ کی تعلیم دیتے، رفتہ رفتہ عبیدی حکومت کے اثرات بالکل زائل ہو گئے، اس کے ساتھ اسماعیلیت جو تقریباً تین صدیوں تک مصر کا سرکاری مذہب رہا تھا، مصر میں غریب الوطن ہو گیا، مورخ مصر مقریزی لکھتا ہے:-

واضحیٰ مذہب الشیعة والاسماعیلیة
 شیخہ، اسماعیلیہ اور امامیہ کا مذہب بے پوش ہو گیا،
 ولا مامیۃ حتی فقد من ارض مصر کلھا۔
 یہاں تک کہ پورے ملک مصر میں اس کا ہر وجود نہیں تھا

عبیدی حکومت کا یہ صد سالہ عہد اسلام کے لئے ایک دور ابتلا تھا جس میں مسلسل شریعت و سنت اور عقائد و اخلاق کے ساتھ تسخیر و تلامع جاری رہا، اہل سنت اور اہل علم مقہور و مغلوب رہے، سفلہ طبیعت، اوباش مزاج، اور بد دین غالب حاوی رہے، علامہ مقدسی اپنی کتاب کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین میں اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وبقی هذا البلاع علی الاسلام من اقل
 عبیدیوں کی حکومت آغاز سے اختتام تک یہ بلا

دولتم الی اخرها وذلک من ذی الحجۃ
 اسلام پر سلطان ہوا اس کی ابتداء ہی ۱۲۵۹ء سے
 ہوئی ہے اور اس کا خاتمہ ۱۲۶۷ء پر ہوتا ہے لکن دوسرے
 ستین و تسعین و مائتین الی ستم مئین
 و ستین و خمسائۃ و فی ایامہم کثرت الرافضۃ
 حکومت میں رافضی کی کثرت اور ان کا غلبہ ہوا، لوگوں
 پر حاصل اندکس تفرک کے لئے اور دوسروں کی
 اقتدار کی شامی حلقہ پر بسنے والے کوہستانوں نصیر اور
 دروزیوں کے عقائد انہی کے اثر سے خراب ہوئے، شیشی
 (بھنگا استعمال کرنے والے) انہی کی ایک قوم ہیں، ان
 اسماعیلیوں کے مبلغین کا جواثر و نفوذ ان کوہستانوں کے
 اندران کی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے ہوا، وہ
 دوسروں میں نہیں ہو سکا، انہی کے دور حکومت میں
 فرنگیوں نے شام اور جزیرہ کے اکثر اسلامی شہروں پر
 قبضہ کر لیا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ
 خاندان اتابک برسر اقتدار ہوا، اور صلاح الدین
 جیسے جاہد سامنے آئے جنہوں نے اسلامی ملک زیر نوازیایا
 کیا، اور اس حکومت سے بندگان خدا کو نجات دلا۔

اس انقلاب سلطنت پر جو ایک بڑے دینی و اخلاقی انقلاب کا پیش خیمہ تھا، صحیح العقیدہ مسلمان
 اور مجتہدین سنت کی مسرت بالکل قدرتی بات تھی، علامہ مقدسی نے جن کی ولادت سے صرف ۲۹ سال پہلے
 انقلاب ہوا تھا، اور ان تغیرات و اثرات کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، جو اس کے نتیجہ میں پیش آئے تھے،

اپنی سرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:-

انقرضت تلك الدولة وزالت هي
الاسلام بمصر بانقراضها الذلة۔
ی حکومت ختم ہوئی، اور اس کے ساتھ ساتھ مصر میں
اسلام کی ذلت کا دور بھی اختتام کو پہنچا۔

حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب ”الصواعق المرسلة“ میں باطنیوں کے عروج اور اس کے اثرات، پھر
نور الدین اور صلاح الدین کے ہاتھوں اس سلطنت کے زوال کا تذکرہ ان پُر جوش الفاظ میں کیا ہے:-

”ان باطنیوں کی دعوت مشرق میں تو مضاعف ہو گئی، اور مغرب میں رفتہ رفتہ اس کا ظہور شروع ہوا، یہاں تک
وہ بڑی طاقتور دعوت بن گئی، اور اس کے پیچھے گئے، اور اس کے علمبردار مغرب اقصیٰ کے اکثر شہروں پر قابض ہو گئے
پھر انھوں نے آگے قدم بڑھایا، اور مصر تک پہنچ گئے، انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا، اور قاہرہ کی بنیاد رکھی، انھوں نے
اور ان کے حکام و قضاة نے کھلے طریقہ پر اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، انہی کے زمانہ میں رسائل اخوان الصفا
تصنیف ہوئے، اور ابن سینا نے ”اشارات“ اور ”شفاء“ اور دوسری تصنیفات لکھیں، خود ابن سینا کا بیان ہے کہ
میرے والد حاکم باشر (فاطمی خلیفہ اور داعی) کے مبلغین میں سے تھے، ان فاطمیوں کے دور میں سنت و آثار کا جلن ہو
ہوا، اور کتب سنت بالائے طاق رکھ دی گئیں کہیں کوئی چھپ چھپا کر ان کو دیکھتا ہوگا، اور عمل کرتا ہوگا، اس دعوت
کا تمیز، امتیاز اور بنیادی اصول یہ تھا کہ عقل کو انبیاء علیہم السلام کی وحی و تعلیمات پر ترجیح حاصل ہے۔

رفتہ رفتہ سارے ملک مغرب، مصر و شام و حجاز پر ان باطنیوں کا تسلط ہو گیا، عراق پر بھی سال بھر ان کا
قبضہ رہا، اہل سنت ان کے دور حکومت اور ان کی ملکیت میں ذمیوں (مسلمان حکومت کی غیر مسلم رعیت)
کی طرح رہتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ذمیوں کو وہ امن و امان اور عزت و اعتبار حاصل تھا، جو اہل سنت کو
نصیب نہ تھا، کتب علماء اس دور میں قابلِ گردن زدنی قرار پائے، کتب و اثرین انبیاء ان کے قیدی خزانوں میں
پڑے پڑے دنیا سے چلے گئے۔

شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام

سلطان صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں، ان کی علمی و دینی سرپرستی، جابجا دینی مدارس کے قیام، نیز شیعہ اثرات کے اضمحلال اور سنی العقیدہ سلاطین کے اثر سے علمی و عملی زندگی میں تازگی پیدا ہوئی، اور علوم شرعیہ کے تعلیم و تعلم اور ان میں کمال پیدا کرنے کی طرف عالم اسلام میں از سر نو توجہ ہوئی، اس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں متعدد باوقار دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوت و اصلاح کا فریضہ انجام دیا، اور حکومت اور زمانہ کے غلط رجحانات کا مقابلہ کیا، ان میں سب سے زیادہ با عظمت شخصیت شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام (م ۶۶۴ھ) کی ہے، جو اپنے علم و تقویٰ اور حق گوئی و بیباکی میں نادرہ روزگار اور قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔

علمی عظمت

عز الدین بن عبد السلام دمشق میں ۵۹۵ھ میں پیدا ہوئے، اساتذہ دمشق اور مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی، جن میں فخر الدین بن عساکر، سیف الدین آدمی، حافظ ابو محمد القاسم بن عساکر جیسے اجلہ علماء و اساتذہ وقت تھے، بعض روایتوں کے مطابق انہوں نے جوانی میں پڑھنا شروع کیا، لیکن جلد تمام علوم میں تبحر

حاصل کر لیا، اور ان کے معاصرین ان کی علمی جلالتِ شان اور عظمت کا اعتراف کیا، علامہ ابن دقین العید نے

اپنی بعض تصانیف میں ان کو سلطان العلماء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ جب ۶۳۹ھ میں مصر تشریف لے گئے تو حافظ عبد العظیم المنذری صاحب کتاب "الترغیب والترہیب" نے فتویٰ دینے سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ جس شہر میں عز الدین بن عبد السلام ہوں وہاں دوسرے کے لئے فتویٰ دینا درست نہیں، شیخ جمال الدین بن الحاجب کا قول ہے کہ فقہ میں شیخ عز الدین کا پایہ امام غزالی سے بلند ہے۔ ذہبی اپنی کتاب "العبر" میں لکھتے ہیں:-

انتهت الیہ معرفة المذهب مع الزهد
فقه کے علم اور زہد و ورع میں ان کو کمال حاصل
والووع وبلغ رتبة الاجتهاد۔
تھا، اور درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے۔

شیخ عز الدین بن عبد السلام نے عرصہ تک دمشق میں "زاویہ غزالیہ" میں درس دیا، جامع اموی میں خطابت و امامت کے منصب پر عرصہ تک فائز رہے، شیخ شہاب الدین البوشامہ کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے بدعات کا ازالہ ہوا، جو ان کے زمانہ میں رواج پذیر ہو گئی تھیں، صلاۃ الرغائب اور نصف شعبان کی کھل کر مخالفت کی، اور ان کو بدعت ثابت کیا، بعض اکابر علماء ان کے بارہ میں ساکت اور متردد تھے، الملک الکامل نے دمشق کے عہدہ قضا کے لئے بڑا اصرار کیا، شیخ نے بڑی شرطوں کے ساتھ اس کو منظور کیا، اسی عرصہ میں ایک بار وہ الملک الکامل کی طرف سے دربار خلافت (بغداد) میں سفیر بن کر گئے۔

لہ طبقات الشافئیین الکبریٰ ج ۵ ص ۱۴۱ حسن المحاضرة للسيوطی ص ۱۳۱ صلاۃ الرغائب ایک نماز تھی، جو تائیس رجب کو بارہ رکعتوں اور خاص ترکیب کے ساتھ شب کو پڑھی جاتی تھی، اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی جاتی تھی، یہ نماز ۴۴۸ھ میں ایجاد ہوئی، اور عام بدعات کی طرح تیزی سے پھیل گئی، شیخ عز الدین بن عبد السلام نے اس کے ظہور کی پوری تاریخ لکھی ہے، ملاحظہ ہو "تاج السادة" شرح احوال ص ۴۲۳، نصف شعبان پندرہویں شب کو شکر کعتیں خاص ترکیب کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں بدعت ہیں، ابن سبکی نے اس کو بدعت مذمومہ لکھا ہے، امام نووی نے اس کے لئے موضوع منکر اور

سلاطین کو صلاح نیک و اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی

شیخ عز الدین کی شخصیت شام میں سب سے بڑی دینی شخصیت تھی جس کا سلاطین وقت تک احترام کرتے تھے، وہ بڑے باوقار، بارعب اور خوددار تھے، انھوں نے کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا یا دربار داری کرنا گوارا نہیں کیا جب کبھی بادشاہ وقت نے خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گئے، اور اس کو صحیح مشورہ دیا، اور اس کی اور اسلام مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

سلطان الملک الاشرف نے مرض الموت میں اپنے سب سے بڑے عہدہ دار کو شیخ کی خدمت میں بھیجا، اور کہا، کیا کہ آپ کا محب موسیٰ بن الملک عادل ابو بکر سلام عرض کرتا ہے، اور عیادت اور دعا کی درخواست کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ آپ اس کو کوئی ایسی نصیحت فرمائیں جو کل خدا کے سامنے اس کے کچھ کام آئے، شیخ نے سن کر کہا کہ یہ عیادت افضل عبادت ہے، اس لئے کہ انشاء اللہ اس کا نفع متعدی ہے، چنانچہ تشریف لے گئے، سلطان ان کی تشریف آوری سے بیحد مسرور ہوا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اس سے پہلے سلطان کو کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی، اور سلطان عرصہ تک ان سے ناراض رہا تھا، سلطان نے اس کی معافی چاہی اور کہا کہ آپ

اچھٹی ساتویں صدی میں اشعریت و حنبلیت کے اختلاف نے باوجود بنیادی اتحاد کے تقریباً وہ شکل اختیار کر لی تھی، جو چوتھی صدی میں اعتزال و سنیت کے اختلاف کی تھی، اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے، اور خابہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے، ہر گز وہ خوش فہمی کے ساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت و شریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دے دیا گیا، اور رائی کا پابڑ بن گیا، تحریف و تحصب نے اس کو بھی کفر و ایمان کا معیار قرار دے دیا، شیخ عز الدین کے زمانہ میں یہ مباحث بڑی شدت اختیار کر چکے تھے، وہ عقیدہ و علم اشعری تھے، الملک الاشرف خابہ کا معتقد اور حنبلیت کی طرف مائل تھا، ابتدا میں اس کو شیخ سے بے گمانی اور شکایت پیدا ہوئی، لیکن شیخ کی ملاقات اور فیصلی

معلومات کے بعد اس کی بے گمانی دور ہو گئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۸۵، ۹۵)

مجھے معاف فرمائیں، میرے لئے دعا بھی فرمائیں، اور مجھے کچھ نصیحت بھی فرمائیں، شیخ نے فرمایا کہ جہاں تک معاف کرنے اور باز پرس کرنے کا تعلق ہے، میں روزانہ سونے سے پہلے اللہ کے بندوں کو اپنی طرف سے معاف کر دیتا ہوں، اور اس وقت سوتا ہوں جب کہ کسی کے ذمہ میرا کوئی حق یا مطالبہ یا تشکایت باقی نہیں رہتی، اور میرا اجر مخلوق کے بجائے اللہ کے ذمہ ہوتا ہے۔ "فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ"

باقی رہی دعا تو میں سلطان کے لئے اکثر دعا کیا کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی صلاح میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر و فلاح ہے، اللہ تعالیٰ سلطان کو ان امور کی بصیرت عطا فرمائے جن سے وہ خدا کے سامنے سرخرو ہو، رہی نصیحت نواب وہ سلطان کی آمادگی اور تقاضے کی وجہ سے فرض واجب ہو گئی ہے، مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کی فتوحات اور دشمنوں پر غلبہ کی دھوم ہے، اس وقت حالت یہ ہو رہی ہے کہ تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے جا رہے ہیں، ان کو اس بات سے شہ لی ہے کہ آپ کو اس وقت اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے ہر نفیوس جنگ کرنے کی فرصت نہیں، اس وقت آپ کا رخ الملک الکامل سے جنگ کرنے کی طرف ہے، اور آپ ان کے مقابلہ کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں، الملک الکامل آپ کے بڑے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ آپ اپنا رخ اپنے بھائی کی طرف سے ہٹا کر دشمنان اسلام کی طرف پھیر لیں، اور اس اخیر وقت میں اپنا رشتہ نہ توڑیں، آپ اللہ کے دین کی مدد اور اس کی سر بلندی کی نیت کریں، اگر اللہ تعالیٰ سلطان کو صحت عطا فرماتا ہے، تو ہم اللہ سے کفار پر آپ کے غلبہ کی امید رکھتے ہیں، اور آپ کے نامہ اعمال میں یہ سعادت لکھی جاتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کا کچھ اور فیصلہ ہے تو سلطان اپنی نیت کی برکت کے ساتھ دنیا سے جلتے ہیں۔

سلطان نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو اس بروقت تنبیہ اور مخلصانہ مشورہ پر جزائے خیر عطا فرمائے، اسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رخ بجائے مصر کے (جو الملک الکامل کی جانب تھا) تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے، اور فوج اس مقام سے کوچ کر کے مقام قصیرہ میں پڑاؤ ڈالے، چنانچہ دن کے دن اس کی تعمیل ہوئی، اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کا ارادہ اب تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ہے۔

الملك الاشرف نے مزید نصیحت کی فرمائش کی، شیخ نے فرمایا کہ بادشاہ تو اس حال میں ہے اور ناسمین سلطنت اور اہل کاران حکومت رنگ ریاں کر رہے ہیں، شراب کے دور چل رہے ہیں گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے، نئے نئے محاصل اور ٹیکس مسلمانوں پر لگائے جا رہے ہیں آپ کے لئے خدا کے حضور میں سب سے افضل عمل پیش کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سب گندگیوں کو دور کریں، یہ نئے نئے ٹیکس بند کریں، اور تمام ظالمانہ کارروائیاں روک دیں، اور اہل معاملہ کی داد دے کر دیں، الملك الاشرف نے اسی وقت ان سب چیزوں کی ممانعت کے احکام جاری کئے، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دینی خدمت اور خیر خواہی پر تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے غیر دے، اور اپنے لطف و کرم سے مجھے جنت میں آپ کی محبت نصیب فرمائے، اسی کے ساتھ ایک ہزار دینار مصری نذر کئے، شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کی، اور فرمایا کہ میری یہ ملاقات خالصتہً لوجہ الشرح ہی، میں اس میں دنیا کی کوئی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔

بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت

الملك الاشرف کے جانشین صالح اسمعیل (ابوالخیش) نے الملك الصالح نجم الدین ایوب بادشاہ مصر کے مقابلہ میں (جس کے شام پر حملہ کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی، اور حق الخدمت کے طور پر شہر صیدا الواقع اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا، اس دوستانہ تعلق کی بنا پر فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ دمشق میں آکر ہتھیار خریدتے شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آکر ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں، تاجرانِ اسلام نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے، اس لئے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے، شیخ کی طبیعت پر بادشاہ کی اس بے حسیتی اور اسلام کی اس ذلت و بے بسی کا بڑا اثر تھا، انھوں نے بادشاہ کے لئے خطبہ میں دعا ترک کر دی، اس کے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے فارغ ہو کر بڑے جوش کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ الہی!

اسلام اور حامیان اسلام کی مدد اور نصرت فرما، اور طہرین و دشمنان دین کو ذلت و نکبت نصیب فرما اور تمام مسلمان بڑی رقت و اثر کے ساتھ آمین کہتے تھے، حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دی شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصہ تک مجبوس رہے، کچھ عرصہ کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کئے گئے۔

اسی اثنا میں سلطان صالح اسمعیل، الملک المنصور والی حمص، اور سلاطین فرنگ اپنی افواج و عساکر کے ساتھ مصر کے ارادہ سے بیت المقدس آئے، صالح اسمعیل کے دل میں شیخ عزالدین کی ناراضگی برا بھلاستی رہتی تھی، اور اس کو اس کی فکر تھی، اس نے اپنے عمائد و خواص میں سے ایک شخص کو اپنا روال دیا، اور کہا کہ یہ روال شیخ کی خدمت میں پیش کرنا، اور انتہائی خوشامد و استمال کے ساتھ ان سے کہنا کہ سابقہ خدمات و مناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آسکتے ہیں اگر وہ منظور فرمائیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں ان کو مجبوس کر دینا، امیر نے شیخ سے بڑی خوشامد نہ بانیں کیں، اور ان کی تنظیم و تکیم اور ان کی دجوبی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور آخر میں کہا کہ آپ ذرا کے ذرا بادشاہ سے نیاز مند نہ مل لیں، اور اس کی دست بوسی کریں، تو قیصر رفقہ دفع ہو جائے گا، اور آپ صاف و ترقی کے ساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آجائیں گے، شیخ نے اس کا جو جواب یا وعدہ نایخ میں ہمیشہ یاد گار ہے گا، انھوں نے فرمایا:-

واللہ یا مسکین ما ارضاه ان یقبل یدی

فضلا عن اقبل یدہ یا قوم انتم فی واد

وانانی واد والحمد للہ الذی عافانی

مما ابتلاکم بہ۔ (طبقات الشافعیہ - ج ۴)

یہ جواب سن کر امیر نے کہا کہ پھر مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کروں، شیخ نے کہا شوق سے جو کچھ تم سے ہو سکے اس سے

دریغ نہ کرو، امیر نے ان کو بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں رکھا، شیخ اپنے خیمہ میں قرآن مجید

پڑھتے رہتے تھے، اور بادشاہ اپنے خیمہ کے اندر سنا تھا، ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ تم شیخ کو قرآن مجید پڑھنا ہوا سنتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں کہا جانتے ہو، یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے (هذا الکبر قسمی المسلمین) میں نے اس کو اس لئے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعہ سپرد کر دینے کے خلاف تھا، اور اس پر معترض تھا، میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دوسرے منصبوں سے معزول کیا، اور اس کو دمشق سے شہر بدر کر دیا، اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے، عیسائی بادشاہوں نے کہا کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھو کے بیٹھتے۔

اسی عرصہ میں مصری افواج آئیں، صالح اسماعیل کو شکست ہوئی، فرنگی افواج قتل و غارت ہوئیں، اور شیخ صحیح و سلامت مصر روانہ ہو گئے۔

راستہ میں جب کرک کی ریاست سے گزرنا ہوا تو والی کرک نے قیام کی درخواست کی، فرمایا کہ:-
”تمہارا یہ مختصر شہر میرے علم کا تحمل نہیں ہو سکتا“

شیخ عز الدین مصر میں

مصر میں سلطان مصر الملک صالح نجم الدین نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جامع عمرو ابن العاص کا خطیب مقرر کیا، اور الوجہ القبلی مصر کا عہدہ قضا اور ویران مساجد کی آبادی کا کام سپرد کیا، سلطان نے جب مدرسہ صالحیہ کی تعمیر کی، تو مذہب شافعی کی تعلیم شیخ عز الدین کے سپرد کی، اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم و اشاعت علم کا فرض انجام دیا، اور لوگوں کو بہت نفع ہوا۔

شیخ کی حق گوئی و بیباکی

اسی دوران میں ایک مرتبہ فخر الدین عثمان نے جو قصر شاہی کا مہتمم اور عملاً سلطنت مصر کا منظم اعلیٰ تھا

لہ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۱۱ بروایت شیخ شرف الدین عبد اللطیف فرزند شیخ عز الدین ابن عبد السلام

مصر کی ایک مسجد کی چھت پر طبل خانہ کی عمارت بنوائی اور وہاں طبل و نقارہ بجنے لگا، شیخ عبدالدین کو جب اس واقعہ کی تحقیق ہوئی تو انھوں نے (بحیثیت قاضی اور مہتمم مساجد کے) اس عمارت کے انہدام کا حکم دے دیا اور اس جرم میں فخر الدین کو ساقط الشہادۃ قرار دیا، اور ساتھ ہی ساتھ عہدہ قضا سے استعفا دے دیا اس کا رد والی سے سلطان کی نگاہ میں شیخ کی منزلت کم نہیں ہوئی، مگر اس نے عہدہ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر نہیں کیا، ادھر شیخ کے فیصلوں کا اتنا احترام اور ان کا دینی نفوذ و اثر اس قدر تھا کہ اسی زمانہ میں الملک الصالح سلطان مصر نے خلیفہ بغداد کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی جب سفیر کی باریابی ہوئی، اور اس نے سلطان مصر کا پیغام پہنچایا تو اس سے دریافت کیا گیا کہ یہ پیغام تم نے خود سلطان مصر کی زبان سے سنا ہے یا کسی کے واسطے سے؟ اس نے کہا کہ میں نے یہ پیغام مہتمم قصر شاہی فخر الدین کی زبان سے سنا ہے، خلیفہ نے کہا کہ فخر الدین کی شہادت معتبر نہیں اس کو شیخ عبدالدین نے ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے، اس لئے ہم اس کی روایت قبول نہیں کر سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفارت پھر مصر واپس آئی، اور براہ راست سلطان سے پیغام سن کر بغداد واپس ہو کر خلیفہ کو پیغام پہنچایا۔

ان کی جرات کا اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربار شاہی تھا، بادشاہ اپنے ترک احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دور رویہ افواج شاہی دست بستہ کھڑی تھیں، امراء حاضر ہو کر آداب تسلیمات بجا لاتے تھے، اور زمین بوس ہوتے تھے، اس بھرے دربار میں دفعۃً شیخ نے بادشاہ کو نام لے کر خطاب کیا اور کہا کہ ایوب! خدا کو تم کیا جواب دو گے، جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لئے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے؟ بادشاہ نے کہا کہ کیا یہ واقعہ ہے؟ شیخ نے بلند آواز سے فرمایا، ہاں فلاں میخانہ میں شراب آزادی سے بک رہی ہے، اور دوسرے ناگفتنی کام ہو رہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے داد عیش دے رہے ہو، بادشاہ نے کہا کہ جناب والا مجھے اس میں کچھ دخل نہیں، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہو رہا ہے، شیخ نے فرمایا کہ پھر تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو، جن کا جواب یہ ہوتا ہے: **اِنَّا وَجَدْنَا ابَاءَنَا عَلٰی اُمَّةٍ** (یہ ہمارے باپ دادا کے زمانہ سے چلا آیا ہے) سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔

شیخ کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دربار سے واپسی پر میں نے عرض کیا کہ حضرت اکیا واقعہ ہے؟ فرمایا کہ میں نے بادشاہ کو جب اس شان و شوکت کے ساتھ اجلاس کرتا ہوا دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ منظر دیکھ کر اس پر تکبر کا حملہ ہو، اور وہ اپنے نفس کا شکار ہو جائے، میں نے اس کی اصلاح کے لئے یہ بات کہی، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ خوف نہیں معلوم ہوا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال اس وقت ایسا مستحضر اور پیش نظر تھا کہ وہ مجھے اس کے مقابلہ میں ایک بے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

فرنگیوں سے جہاد

وہ زمانہ فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے خالی نہ تھا، ایک مرتبہ فرنگی فوجیں منصورہ تک پہنچ گئیں، اور مسلمانوں پر انھوں نے غلبہ حاصل کر لیا، شیخ مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو استجاب دعا کی نعمت عطا فرمائی تھی، ابن السبکی طبقات میں لکھتے ہیں کہ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ہوا کا رخ بدل گیا، فرنگیوں کے جہاز ٹوٹ گئے، اور اکثر فرنگی غرق ہو گئے۔

مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام

اس زمانہ میں تاتاری عالم اسلام پر جا بجا سے یورش کر رہے تھے، اسی اثنا میں انھوں نے مصر کا رخ کیا، تاتاریوں کی مسلمانوں پر جو ہیبت مٹھی ہوئی تھی، وہ ضرب المثل ہے، مصر میں ہر اس کی پھیل گئی، سلطان مصر اور اہل مصر کی ہمت مقابلہ کی نہیں ہوتی تھی، شیخ الاسلام نے ہمت دلائی، اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو، میں فتح کی ضمانت کرتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ میرے خزانہ میں روپیہ کم ہے، میں تجارت سے قرض لینا چاہتا ہوں، شیخ نے فرمایا کہ پہلے اپنے محل کے جواہرات، اور اپنی بیگیاں کے زیورات نکالو، ارکان سلطنت،

اور امراء اور بار اپنی اپنی بیگیا کے وہ زیورات حاضر کریں جو حرام ہیں، اور اس کے سکے ڈھلوائے جائیں، اور وہ لشکر میں تقسیم ہوں، اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے پہلے قرض کی کوئی ضرورت نہیں، شیخ کا اتنا عجب تھا کہ بادشاہ اور امراء سلطنت نے بے چون و چرا جو اہرات و زیورات شیخ کے سامنے حاضر کر دیئے، اور ان سے جنگ کے مصارف پورے ہو گئے، اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

امراء سلطنت کا نیلام

شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ان امراء سلطنت کو نیلام کیا، جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے، اور شرعی طریقہ پر آزاد نہیں کئے گئے تھے، یہ امراء سلطنت نسلا ترک تھے، اور سلطنت مصر پر بڑے حاوی تھے، ان میں سے ایک نائب السلطنت تھا، شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ امراء شرعی طریقہ پر آزاد نہ ہوں، ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں، اور وہ عالم غلاموں کے حکم میں ہیں، ان کے فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کر دی اور وہ بڑی دقت میں پڑ گئے، یہ دیکھ کر ان امراء کے حلقہ میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی، انھوں نے ایک دن جمع ہو کر شیخ کو طلب کیا، اور کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، شیخ نے فرمایا کہ ہم ایک مجلس طلب کریں گے، اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے، اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا، انھوں نے سلطان سے عرض کیا کہ شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں، اور سر بازار نیلام کرنے کو کہتے ہیں، بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا، مگر انھوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، اس گفت و شنید میں بادشاہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا، جو شیخ کے خلاف شان تھا، بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا کہ شیخ کو اس معاملہ سے کیا تعلق، اور وہ امراء کے قضیہ میں کیوں پڑتے ہیں، شیخ یہ سن کر ناراض ہوئے، اور انھوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کر لیا، اپنا سامان جانور پر بار کیا، اور گھروالوں کو سوار کیا، اور روانہ ہو گئے، ان کی روانگی

کی خبر سن کر قاہرہ میں کھلبلی مچ گئی، شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ ان کے پیچھے ہو گیا، علما، صلحا، تجار، سب ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے، سلطان کو اطلاع ہوئی، اور کسی نے اس سے کہا کہ شیخ عز الدین چلے گئے تو تمہاری سلطنت جاتی رہے گی، سلطان خود سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا، اور ان کو منار شہر واپس لایا اور طے ہوا کہ امرا سلطنت کا وہ خود نیلام کریں، یمن کر نائب السلطنت نے بڑے خوشامدانہ لہجہ میں ان کو اس راہ سے باز رکھنا چاہا، لیکن وہ اپنی راے پر قائم رہے، نائب کو غصہ آگیا، اس نے کہا کہ یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کرے گا، ہم ملک کے حاکم ہیں؟ خدا کی قسم! میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا، چنانچہ وہ اپنے عمل کے ساتھ سوار ہو کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا، انگلی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، دروازہ کھٹ کھٹایا، شیخ کے صاحبزادہ باہر نکلے تو یہ حال دیکھا کہ نائب السلطنت شمشیر برہنہ لئے دروازہ پر کھڑا ہے، انھوں نے اندر جا کر شیخ سے یہ حال کہا، شیخ نے بے پرواہی سے جواب دیا کہ بیٹا! تمہارے والد کا یہ رتبہ کہاں کہ اللہ کے راستے میں شہید ہو، یہ کہہ کر وہ باہر نکلے، ان کا کلن تھا کہ تلوار نائب السلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کے جسم پر عرش طاری ہو گیا، اس نے رو کر شیخ سے دعا کی درخشاں کی، اور کہا کہ میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں، فرمایا: میں تمہارا نیلام کروں گا، اور تمہیں فروخت کروں گا۔ اس نے کہا کہ ہماری قیمت آپ کس میں صرف کریں گے؟ فرمایا: مسلمانوں کے کاموں میں، اس نے عرض کیا کہ قیمت وصول کون کے گا؟ فرمایا: میں خود اس لئے کہا بہت اچھا، چنانچہ شیخ نے ایک ایک کے سب امرا کو نیلام کیا، ہر ایک پر بولی بولی گئی، شیخ نے (ان کے اعزاز کے طور پر) ان کے دام بہت لگائے اور بہت بڑی بولی پر ان کو فروخت کیا، اور قیمت وصول کر کے خیر کے کاموں میں صرف کی، اور وہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر گئے، ابن السبکی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ کسی اور کے متعلق سننے میں نہیں آیا، ایک عالم کی عظمت اور اس کے رعب و داب کی یہ انتہائی مثال ہے۔

شیخ عز الدین اور سلاطین مصر

مصر میں شیخ کی زندگی میں بڑے انقلابات آئے، وہ مصر آئے تھے تو ایوبی سلطنت کا زمانہ تھا، اور

صلاح الدین کا خاندان حکومت کر رہا تھا، ان کی زندگی ہی میں یہ خاندان ختم ہوا، الملک الصالح نجم الدین ایوب کے جانشین الملک المعظم توران شاہ کے بعد ترکی النسل امر اکادور حکومت آیا، وہ شیخ کے قدردان اور نیاز مند رہے اور ان کی تعظیم و تکریم اور بزرگداشت میں کوئی کمی نہیں آئی، خصوصیت کے ساتھ مصر کا نامور ترک سلطان الملک النظار ہریرس، شیخ کا بڑا ادب شناس، اور ان کی شخصیت سے متاثر تھا، شیخ ہی کے مشورہ سے سقوط بغداد اور سلطنت عباسیہ کے اختتام پر سلطان نے بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم کے چچا ابو القاسم احمد کو جن کا لقب المستنصر ہے، ۶۵۹ھ میں مصر میں اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا، پہلے شیخ عبداللہ نے بیعت کی، پھر الملک النظار ہریرس نے، پھر قاضی القضاۃ تاج الدین وغیرہ نے۔

مکارم اخلاق

شیخ اپنے علم و فضل، وقار و ہیبت کے ساتھ بڑے کریم النفس، فیاض اور بخیر تھے، قاضی القضاۃ بدر الدین بن حماد ناقل ہیں کہ دمشق کے زمانہ قیام میں ایک سال بڑی گرانی کا آیا، باغات کے دام بہت گر گئے، اور بہت سستے بننے لگے، شیخ کی اہلیہ محترمہ نے ان کو ایک زیور دیا کہ گرمی گزارنے کے لئے ایک بلخ خرید لیں، انھوں نے وہ زیور فروخت کر کے ساری قیمت خیرات کر دی، اہلیہ نے پوچھا کہ آپ نے باغ خرید لیا؟ فرمایا کہ ”ہاں! مگر جنت میں میں نے دیکھا کہ لوگ بڑی عسرت اور تکلیف میں ہیں، میں نے اس کی قیمت ان پریشان حال لوگوں پر صرف کر دی“ انھوں نے فرمایا، **جَزَاكَ اللهُ**۔

قاضی القضاۃ موصوف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ شیخ تنگ حالی کے باوجود بڑے فراخ دست اور بخیر تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے پاس کچھ دینے کو نہ ہوتا تو اپنا عامہ چکر اس کا ایک ٹکڑا دے دیتے۔ شیخ عبداللہ صرف سلاطین ہی کے مقابل میں جری اور حق گو نہ تھے، بلکہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی

اسی طرح بیباک اور حق شناس تھے، ابن السبکی اور سیوطی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مصر کے زمانہ قیام میں ان سے ایک فتویٰ میں غلطی ہو گئی تو انھوں نے اعلان کروادیا کہ جس کو ابن عبد السلام نے فلاں فتویٰ دیا ہو، وہ اس پر عمل نہ کرے اس لئے کہ وہ غلط ہے۔

ابن السبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم ظاہری کے کمالات کے ساتھ دولت باطنی سے بھی مالا مال تھے، اگرچہ ان کے ایمان و یقین، اعتماد علی اللہ، بے خوفی و شجاعت، ارباب دنیا کی بے وقعتی کے واقعات خود اس پر دلیل ہیں، لیکن ابن السبکی نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے امام طریقت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے استفادہ کیا تھا، اور ان کی طرف سے ارشاد و تربیت کے لئے مجاز تھے، سیوطی نے شیخ ابوالحسن شاذلیؒ سے بھی ملاقات و استفادہ کا ذکر کیا ہے۔

امریا المعروف اور نہی عن المنکر کے بارہ میں شیخ کا مسلک

شیخ علمی و فطری طور پر بھی اس کے قائل تھے کہ امریہ المعروف اور نہی عن المنکر بدعات اور گمراہیوں کی علامتیں مخالفت و انکار علماء کا فریضہ ہے، اور اس سلسلہ میں ان کو خطرات شدید بھی برداشت کرنے چاہئیں، اور ہر طرح کے مصائب کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

الملک الاشراف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

وبعد ذلک فاننا نزعیم انتامن جملة	ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے
حزب اللہ وانصار حینہ و جندہ	ہیں اور اس کے دین کے مددگار اور اس کا لشکر
وکل جندی لا یخاطر بنفسہ فلیس	ہیں وہ لشکر جو اپنے کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے
مجنون	تیار نہ ہو، وہ لشکر ہی نہیں ہے۔

ان کا خیال تھا کہ علم و زبان علماء کا ہتھیار ہیں، اس لئے ان کا جہاد یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو حق کی تائید اور باطل کی مخالفت میں کام میں لائیں، ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:-

قد امرنا الله بالمجاهدة في نصرته دينه، الا
ان سلاح العالم علمه ولسانه مكالات
سلاح الملك سيفه ولسانه، فكلما لا يجوز
للعولك اعتمادا على حجتهم عن المحدثين
والمشركين لا يجوز للعلماء اعتماد
الستهم عن الزائغين والمبتدعين^{له}
الله تعالى نے ہم کو اپنے دین کی مدد کے لئے جہاد و
جہاد کا حکم دیا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ عالم
کا ہتھیار اس کا علم اور اس کی زبان ہے، جیسا کہ بادشاہ
کا ہتھیار اس کی تلوار اور تیر و سنان ہے تو ہر طرح بادشاہوں
کے لئے اپنے ہتھیاروں کو نیام میں رکھنا جائز نہیں،
اسی طرح علماء کے لئے اہل زلیخ و ضلال اور بدعتی
سے اپنی زبان کو بند کرنا جائز نہیں۔

ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں عالم ربانی کو ہر طرح کے خطرات برداشت
کرنا چاہئیں گویا ان کو ان علماء سے اتفاق نہیں ہے، جو ہر طرح کے خطرہ میں پڑنے کو مطلقاً ناجائز سمجھتے ہیں
اور آیت ”وَلَا تَقْلُوبُوا يَدَيَّكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ سے غلط اور بے محل استدلال کرتے ہیں، اسی خط
میں بڑے موثر انداز میں فرماتے ہیں:-

والخاطرة بالنفوس مشروعة في اعزاز
الدين، ولذا لا يجوز للبطل من المسلمين
ان ينغمس في صفوف المشركين وكن ذلك
الخاطرة بالامر بالمعروف والنهي عن المنكر
ونصرة قواعد الدين بالحج والبراهين
دين کے اعزاز و غلبہ کے لئے جانوں کو خطرہ میں ڈالنا
دین میں مشروع ہے اسی لئے مسلمان ضرور کے لئے جائز
ہے کہ مشرکین کی صفوں میں گھس جائے، اسی طرح سے امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں اپنے کو خطرہ میں ڈالنا اور
اصول دین کی دلائل و براہین کے ذریعہ تقویت مشروع ہے

مشروعة فمن خشي على نفسه سقط عنه
 المصوب وبقي لا استجاب ومن قال بان
 التعزيب النفوس لا يجوز فقد بعد عن الحق
 ونأى عن الصواب وعلى الجملة فمن أثر
 الله على نفسه أثره الله ومن طلب رضا
 الله بما يسخط الناس رضي الله عنه وأرضى
 عنه الناس ومن طلب رضا الناس بما
 يسخط الله سخط الله عليه وأسخط عليه
 الناس وفي رضا الله كفاية عن رضا
 كل أحد۔ (طبقات ج ۵ ص ۹)

عرب شاعر نے خوب کہا ہے:-

فلتد تحلو والحياة مريّة
 وليتك ترضى ولا نام فضا

(کاش کہ آپ کی محبت کی حلاوت مجھے حاصل ہو جاتی، پھر چاہے زندگی کتنی ہی تلخ ہوتی، اور کاش کہ آپ مجھ سے راضی ہو جاتے، چاہے ساری دنیا ناراض ہوتی۔)

ان کی زندگی بتلاتی ہے کہ انھوں نے ساری عمر اپنے اس عقیدہ اور مسلک پر عمل کیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں اور اپنے نزدیک کسی غلط اور خلاف شرع چیز کی تردید میں اپنی جان مال آبرو وطن و عہدہ کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

شیخ کی تصنیفات

شیخ جس طرح کامیاب مدرس، وسیع النظر فقیہ اور تبحر مفتی تھے، اسی طرح کہنہ مشوق مصنف بھی تھے۔

ان کی تصنیفات میں "القواعد الکبریٰ" اور کتاب مجاز القرآن خاص وقعت رکھتی ہے، ابن السبکی لکھتے ہیں:

وهذان الكتابان شاهدان باماتته
وعظیم منزلتہ فی علوم الشریعۃ۔
یہ دونوں کتابیں ان کی امامت اور علوم شریعت
میں ان کے علو منزلت پر شاہد ہیں۔

ان دونوں کتابوں کا انھوں نے دو الگ کتابوں میں اختصار کیا ہے ابن السبکی نے ان کی دو اور کتابوں
"شجرۃ المعارف" اور الدلائل المتعلقة بالملائکۃ والانسان علیہم السلام کی بھی خصوصی تعریف کی ہے ان کی ایک
کتاب "مقاصد الصلۃ" خود ان کے زمانہ میں بڑی مقبول ہوئی، اور لوگوں نے اس کی ہزاروں نقلیں کیں، چھوٹی
بڑی تصنیفات کے علاوہ ان کے فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ ہے جو فقہ شافعی کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

امام غزالیؒ کے بعد شیخ عبدالرین غالباً دوسرے عالم اور مصنف ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ احکام شرعیہ کے
مقاصد و لطائف پر گفتگو کی، اور شریعت کے اسرار و نکات بیان کئے، اس موضوع کے سب سے بڑے مصنف شیخ الاسلام
شاہ ولی اللہ صاحبؒ محدث دہلوی نے تھجۃ الشراۃ لکھ کر مقدمہ میں اس موضوع کے پیش رو مصنفین میں تین بزرگوں
حجۃ الاسلام غزالیؒ ابوسلیمان خطابیؒ اور شیخ الاسلام عبدالرین کا نام لیا ہے۔

شیخ کی وفات

۹ جمادی الاولیٰ ۶۶۷ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں شیخ کی وفات ہوئی، یہ الملک نظام میریس کا عہد حکومت تھا،
اس کو شیخ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، کہتا تھا کہ خدا کی شان ہے شیخ کی وفات میرے عہد حکومت ہی میں مقدر تھی،
جنازہ میں امر اور دربار اکران سلطنت اور افواج شاہی شریک تھیں، سلطان خود کا ندھازیا، اور دفن میں شریک ہوا۔
شیخ کا جنازہ جب قلعہ کے نیچے سے گزرا اور سلطان نے خلعت کا از دحام دیکھا تو اپنے خواص میں سے کسی سے
کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہے، اس لئے کہ یہ شخص جو مرجع خلافت ہے اگر اشارہ کر دیتا
تو میری سلطنت چلی جاتی، اس کے انتقال کے بعد مجھے اب اپنی سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا ہے۔

فتنہ نانار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش

ناناری حملے اور اس کے اسباب

ساتویں صدی میں عالم اسلام کو وہ حادثہ پیش آیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی اور جو قریب تھا کہ اس کی ہستی کو فنا کر دے، یہ تاتاری غارتگروں کا حملہ تھا، جو مورخ کی طرح مشرق سے بڑھے، اور سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔

اس منحوس واقعہ کا سبب سلطان وقت علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی بظاہر ایک غلطی اور بے تدبیری تھی کہ اس نے پہلے ان تاتاری تاجروں کو قتل کرا دیا، جو اس کے ملک میں تجارت کے لئے آئے تھے، پھر جب جنگیز خاں نے اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے ایک سفارت بھیجی تو خوارزم شاہ نے سیفر کو بھی قتل کرا دیا، اس پر تاتاری خاقان جنگیز خاں نے برا فروختہ ہو کر خوارزم شاہی سلطنت اور پھر پورے عالم اسلام پر حملہ کر دیا۔

لیکن قرآن مجید میں اعمال و اخلاق کے نتائج اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کا جو اندی اور عالمگیر قانون بتایا گیا ہے اور خاص طور پر سورہ اسرا کی ابتدا میں بنی اسرائیل کی تباہی، قتل عام و نکبت و ذلت اور بیت المقدس کی تخریب بے حرمی کی جو داستان عبرت سنائی گئی ہے، اس کی روشنی میں اس فتنہ عالم آشوب

لہ اس موقع پر سورہ اسرا کی آیات وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ فِي الْكَلْبِ لُتْفِدًا فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلَمَنَّ أَنَّا بِآيَاتِنَا

سے لے کر وَلَيُنَبِّئُهُنَّ مَا عَمِلْنَ إِنَّا آنِيزُوا“ تک آیات پر غور کیا جائے۔

اور اس وقت کی دنیاۓ اسلام کی اس قیامتِ صغریٰ کا حقیقی سبب صرف اتنا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک بادشاہ نے کوتاہ نظری و بے تدبیری سے کام لیا، اور اچانک یہ سیلابِ عالم اسلام پر امن ڈپڑا، اور ایک فرد کی غلطی سے ساری ملت اسلامیہ کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا، جس کے لئے نہ وہ تیار تھی، نہ اس کی مستحق، قرآن مجید کا چراغ اگر ہاتھ میں لے کر اس وقت کے مسلمانوں کی اخلاقی، دینی، تمدنی اور سیاسی حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ یہ منحوس واقعہ اچانک پیش نہیں آیا، اور اس کے اسباب اس سے کہیں زیادہ وسیع، گہرے اور ٹھوس ہیں، جتنے سمجھ اور بیان کئے گئے ہیں، اس کے لئے ہم کو کئی سال پیچھے ہٹ کر اپنا کام شروع کرنا پڑے گا، اور اس وقت کی اسلامی سلطنتوں، اہم ترین تمدنی مراکز اور اسلامی معاشرہ پر ایک جمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات (۵۸۹ھ) پر اس کی وسیع وزیرِ خیز سلطنت اس کی اولاد و خاندان کے افراد میں تقسیم ہو گئی، دنیا کے بہت سے بانیانِ سلطنت اور الوالعزم فرمانرواؤں کی طرح اس کی اولاد اس کی صلاحیتوں کی وارث اور اس کی صحیح جانشین ثابت نہ ہو سکی، عرصہ تک وہ ایک دوسرے سے دست و گریبان اور برسرِ پیکار رہے بعض اوقات ان میں سے بعض افراد نے اپنے ہی بھائیوں اور افرادِ خاندان کے خلاف صلیبی فرمانرواؤں اور فرنگی حریفوں سے بھی مدد لینے اور ان سے ساز باز کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا، جس کا ایک نمونہ شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام کے تذکرہ میں گندر چکا ہے اس طوائف الملوک خاندانی رقابتوں اور خانہ جنگیوں سے سلطنت کے زیرِ فرمان ممالک میں سیاسی انتشار، انتظامی ابتری اور اخلاقی زوال رونما تھا، لوگ ایک بے یقینی کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے، صلیبیوں اور فرنگیوں کی بار بار ان اسلامی شہروں پر تاخت ہوتی رہتی تھی، جن کو سلطان صلاح الدین نے بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد واپس لیا تھا، انتظامی و اخلاقی دونوں طرح کی کوتاہیوں اور بے راہ روی کا نتیجہ وباؤں، امراض اور شدید قحط کی شکل

۱۔ ہندوستان میں عالمگیر اعظم اور اس کے جانشینوں کی مثال ہمارے لئے کافی ہے۔

میں رونا ہوا، اور مصر جیسے زرخیز ملک میں جو دوسرے ملکوں کا بھی پیٹ بھر سکتا تھا، ۵۹۷ء میں جبکہ چچا تھی
 الملک عادل اور الملک لافضل کی خانہ جنگی نے مصر کو بھجھوڑ کر رکھ دیا تھا، دریائے نیل میں طغیانی نہیں آئی
 اور مصر میں ایسی گرانی رونا ہوئی، اور ایسا شدید قحط پڑا کہ آدمی نے آدمی کو بھون کر کھایا، موت کی ایسی گم باراڑی
 تھی کہ مردوں کو کفن دینا ممکن نہ تھا، مورخ ابو شامہ کے بیان کے مطابق تنہا الملک عادل (سلطان مصر) نے
 صرف ایک مہینہ میں دو لاکھ بیس ہزار مردوں کو اپنے ذاتی مال سے کفن دیا، کتوں اور مردوں کے کھانے کی نوبت
 آگئی، بہت بڑی تعداد میں بچے بھون بھون کر کھائے گئے، اور اس کی ایسی عمومیت ہوئی کہ اس میں لوگوں کو
 کوئی قیاحت نہیں محسوس ہوتی تھی، مورخ ابن کثیر کے بیان کے مطابق جب کھانے کے لئے بچے اور چھوٹی عمر کے
 لڑکے نہیں رہے تو جس آدمی کا جس آدمی پر زور چلا، اس نے اس کو بھون کر کھالیا، سنت الشہ کے مطابق آسمانی
 تنبیہات کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور ایسے غیر معمولی واقعات پیش آ رہے تھے، جو توبہ انابت اور اصلاح حال
 کا خیال و جذبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، چنانچہ اسی ۵۹۷ء میں ایک عظیم زلزلہ آیا جس کی زویم خاص
 طور پر ملک شام، بلاد روم اور عراق تھے، اس کی ہلاکت آفرینی اور دہشت انگیزی کا اندازہ اس سے
 ہو سکتا ہے کہ تنہا شہر نابلس اور اس کے اطراف میں بیس ہزار انسان زلزلہ میں دب کر مر گئے، "مرأۃ الزمان"
 کے مصنف کا بیان ہے (جو شدید مانعہ سے خالی نہیں ہے) کہ اس زلزلہ کا شکار گیارہ لاکھ انسان ہوئے۔
 ادھر غیر معمولی حوادث پیش آ رہے تھے، جو مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے
 بالکل کافی تھے، ادھر عالم اسلام کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی اور برادر کشی کا سلسلہ جاری تھا،
 ۶۰۱ء میں ایک ہی خاندان کے دو افراد قتادہ حسینی امیر مکہ اور سالم حسینی امیر مدینہ میں سخت جنگ
 ہوئی، ۶۰۲ء میں غوریوں اور خوارزم شاہیوں کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور مسلمانوں نے مسلمان کا
 خون بہایا، ادھر یہ ہو رہا تھا، ادھر (۶۰۳ء) میں فرنگیوں نے شام کے مختلف علاقوں پر حملے شروع کئے،

۶۱۰ھ میں جزیرہ کے مسلمان حکام نے فرنگیوں سے سازش کی، ۶۱۶ھ میں فرنگیوں نے مصر کے شہر دیماط پر قبضہ کر لیا، جو فوجی و دفاعی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

ادھر مکرر خلافت دارالسلام بغداد میں سلطنت کی ظاہری شان و شوکت عجمی تکلفات اور دولت و تمدن کے کھوکھلے مظاہر اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئے تھے، خلفاء کے منظور نظر مصاحبین اور معتزین کی دولت (جو غلام کی حیثیت سے حرم خلافت میں داخل ہوتے تھے، اور فراش ساتی، اہمیت تو شک خانہ وغیرہ کے منصوبہ پر فائز تھے) کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خلیفہ الظاہر کے زر خرید علار الدین الطبری الظاہری کی سالانہ آمدنی جو اس کو اپنی نئی جائیداد سے حاصل ہوئی تھی، تین لاکھ دینار تھی، بغداد میں اس کے محل کی کوئی نظیر نہ تھی یہی حال مجاہد الدین ایبک الدویدار المستنصر کی دولت کا تھا، ان لوگوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی میں جو ہیز دیا، اور جو تحائف تقسیم کئے، ان کو پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے آخر الذکر کی جاگیر کی آمدنی پانچ لاکھ دینار سالانہ تھی یہی حال الصلاح عبدالغنی بن فاخر فراش کا تھا، جو زیور علم سے عاری لیکن شاہانہ معیار کی زندگی گزارتا تھا، اس کے مقابلہ میں سلطنت عباسیہ کے سب سے بڑے مدرسہ المستنصریہ کے لائق اساتذہ کی تنخواہیں اتنی حقیر تھیں کہ اس کا یقین کرنا مشکل ہے ان میں سے بڑے بڑے اساتذہ کو ۱۲ دینار ماہوار سے زیادہ نہیں ملتے تھے جب کہ اس کے مقابلہ میں عہد عباسی کے ایک امیر الشراہی کے ایک خادم نے چار ہزار دینار ایک امیر کی شادی میں ٹائے اور تین ہزار دینار شراہی کی طرف سے ایک پرندہ کی قیمت میں جو اس کے لئے تحفہ میں موصول سے لایا گیا تھا، ادا کئے گئے۔^{۵۹}

شان و شوکت کے اظہار کے لئے عید اور جائنشین کے موقع پر جو شاہانہ جلوس بغداد میں نکلتے تھے سارا شہر

لے جزیرہ سے مراد وہ علاقہ ہے جو حلب اور فرات کے درمیان واقع ہے اس کو بلاد ما بین النہرین بھی کہتے ہیں، اس کا مغربی شمالی حصہ ”الجزیرہ“

کے نام سے مشہور ہے اور مغربی مشرقی حصہ عراق کے نام سے مشہور ہے۔ ۵۹ البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۵۹

۵۹ یہ سب معلومات اس عہد کی معاصر تاریخوں ”الحوادث الجامعہ“ اور ”العصر المسبک“ سے ماخوذ ہیں۔

ان میں شرکت کرنے، ان کا تاشاد دیکھنے میں محاور خود فراموش ہو جاتا تھا، نمود و نمائش کے اسواسطیٰ بے تکلف

دینی فرائض ان میں نظر انداز ہوتے تھے اور نمازیں قضا ہوتی تھیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ ۶۳۷ھ کے عید کے موقع پر جو شاہی جلوس نکلا، وہ رات کو جا کر ختم ہوا، اس کی ایسی مشغولیت اور محویت رہی کہ لوگوں نے اس دن عید کی نماز نصف شب سے پہلے قضا کر کے پڑھی، اسی طرح ۶۳۷ھ کی عید الاضحیٰ کو اہل بغداد شہر کے باہر خلیفہ کا شاہی جلوس دیکھنے نکلے، اور نماز عید انھوں نے غروب آفتاب کے وقت پڑھی۔

خلیفہ کے لئے زمین بوسی کا عام رواج تھا، اسی طرح سے آستانہ بوسی اور زمین پر ناک رکھنے کا بھی دستور تھا، اور اس کی کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، جامدادوں کی مضبوطی کے واقعات بکثرت پیش آتے تھے، رشوت کی گرم بازاری تھی، باطنیوں، عیاروں اور ٹھگوں کی سرگرمی تیز ہو گئی تھی، اخلاقی بے راہ روی بہت بڑھ گئی تھی، دل بہلانے والے مشاغل کا زور تھا، مغنیات کی کثرت تھی، اور دولت جمع کرنے کا شوق حد سے فروں تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاری، ایران و ترکستان کو تہ و بالا کر رہے تھے، اور اسلام کے سب سے بڑے قلعہ بغداد پر ان کی نگاہیں تھیں، مورخ ابن کثیر ۶۳۶ھ کے آغاز کی ان الفاظ کے ساتھ خبر دیتا ہے کہ اس سن ہجری کی ابتدا اس شان سے ہوئی کہ سلاطین بنی ایوب (سلطان صلاح الدین کے خاندان کے بادشاہ) ایک دوسرے سے نبرد آزما اور برسہا برس رہیں، دار الخلافہ بغداد میں کچھ ایسا انتشار برپا رہا کہ ۶۳۷ھ سے ۶۴۳ھ تک خلفاء اسلام کے قدیم و سلسل معمول کے خلاف خلیفہ کی طرف سے نہ جج کا انتظام ہوا، اور نہ خلافت کعبہ بدل گیا، ۲۱ دن تک بیت اللہ شریف کی دیواریں بالکل کھلی رہیں، لوگوں نے اس سے بد شکونی لی۔

۵۷۵ھ میں الناصر لدین اللہ تخت خلافت پر بیٹھا، اس کو چھیالیس سال سے زیادہ مسلسل خلافت حکومت کا موقع ملا، یہ اتنی طویل مدت ہے، جو کسی عباسی خلیفہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی، لیکن اس کا دور خلافت عباسیہ کا تاریک ترین دور تھا، مورخین نے بڑے سخت الفاظ میں اس پر تنقید اور اس کے اعمال و اخلاق کی

خدمت کی ہے مورخ ابن اثیر نے ان لفظوں میں اس کو یاد کیا ہے۔

”رعیت کے ساتھ اس کا سلوک نہایت خراب اور ظالمانہ تھا، اس کے زمانہ میں عراق کا ملک ایران ہو گیا ملک کے باشندے مختلف شہروں اور ملکوں میں متفرق و آوارہ ہو گئے، اس نے اُن کی جائیدادیں اور دولتیں ضبط کر لیں، اس کے کاموں میں بڑا انصاف تھا، آج ایک بات کرتا تھا، کل اس کے خلاف اس کو تمام ترکچہ پی تفریحی مشاغل سے تھی، اس نے جو انفرادی و سپہ گری کے لئے ایک خاص وردی ایجاد کی، صرف اس وردی والوں کے لئے مردانہ کھیلوں اور فنون سپہ گری کے مظاہرہ کی اجازت تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردانہ کمالات اور فنون سپہ گری کا عراق سے خاتمہ ہو گیا، خلیفہ کی شیفنگی ان تفریحات سے حد کو پہنچ گئی، اہل ایران کا بیان ہے کہ اسی نے سب پہلے تانابوں کو اسلامی قلم و پر حملہ کرنے کی طرف متوجہ کیا، اور ان کے پاس پیام بھیجا۔“

۶۲۲ھ میں ان اصرار دین الشریک وفات ہوئی، اور مستنصر بالله (۶۲۳-۶۲۷) اس کا جانشین ہوا، خلیفہ دیندار، پاکیزہ سیرت، پاکیزہ خصائل اور بہت سے اوصاف و خصوصیات میں خلفاء صالحین کی یادگار تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کو انتظام و اصلاح کے لئے زیادہ مدت نہ مل سکی، ۶۲۷ھ میں اس کی وفات پر اس کا فرزند مستعصم بالله خلیفہ ہوا، مستعصم ایک صحیح العقیدہ، دیندار، محتاط خلیفہ تھا، جو کبھی سکرانہ و محراب کے قریب نہیں گیا، ہر مہینہ دو شنبہ اور جمعرات اور راہِ رجب کے روزے رکھتا تھا، قرآن کا حافظ تھا، وقت پر نماز پڑھنے کا شدت سے پابند تھا، لیکن مؤرخ ابن اثیر کے قول کے مطابق طبیعت میں ضرورت سے زیادہ نرمی اور بیدار مغزی کی کمی تھی، دولت کے معاملہ میں کسی قدر رخصی اور بخیل واقع ہوا تھا۔

۶۲۷ھ میں ابن العلقمی کے نام خلافت عباسیہ کی وزارت عظمیٰ کا قرعہ غالب نکلا، خلافت کے نظم و نسق میں اس وقت سے بڑی برہمی پیدا ہوئی، جب ۶۵۵ھ میں بغداد میں شیعہ سنی کا زبردست جھگڑا ہوا

۱۔ لے خوارزمی سلطنت کا زور توڑنے کے لئے جس سے خلیفہ بغداد کے تعلقات خراب تھے، ۵۷ تاریخ الکامل ج ۱۲ ص ۱۸۱۔

۲۔ ملاحظہ ہو البیان والنهاية ج ۱ ص ۱۵۹ ۳۔ پورا نام مؤید الدین ابوالطالب محمد بن احمد بن علی محمد العلقمی ہے۔

شیعوں کے مکانات یہاں تک کہ ابن اعلقی کے عزیزوں کے مکانات تک لوٹ لئے گئے، ان واقعات کے دل میں بڑی کاپیرا ہونا اور جذبات انتقام کا ابھرنا بعید از قیاس نہیں اس وقت اگرچہ تاتاری خطرہ بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا، اور تاتاری فوجیں بغداد کی طرف بڑھ رہی تھیں، وزیر ابن اعلقی کی ہدایت اور حکم سے بغداد کی افواج میں زبردست تخفیف کی گئی، سواروں کی تعداد گھٹا کر دس ہزار کر دی گئی، بقیہ سپاہیوں کو رخصت کر دیا گیا، اور ان کے منصب روک لئے گئے یہاں تک کہ ان کو بازاروں اور مسجدوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا گیا، شعراء نے اسلام کی کسمپرسی پر مرثیے کہے۔

مستعصم اگرچہ ذاتی طور پر نیک سیرت اور نیک خیال خلیفہ تھا، اور اصلاح و ترقی کا خواہشمند بھی تھا، لیکن زمانہ کافساد، معاشرہ کا انتشار اور اہل حکومت کا بگاڑ اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ اس کو روکنے اور حکومت و معاشرہ میں اصلاح کی نئی روح پھونکنے اور اس کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے ایسے اولوالعزم اور طاقتور شخصیت رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی، جو عام طور پر تاریخ میں نئی سلطنتوں کے بانی اور نئے عہد کے فاتح ثابت ہوئے ہیں، یہ واقعہ تاریخ میں بار بار پیش آیا ہے کہ اکثر حکمران خاندانوں کے آخری افراد اور کسی زوال پذیر سلطنت کا آخری فرمانروا اپنی ذات سے صلاحیت شعرا، اصلاح پسند اور نیک سیرت تھا، لیکن اس خاندان یا اس سلسلہ سلطنت کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور فساد بڑھتے بڑھتے اس آخری نقطہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب اس کو آخری منزل پر پہنچنے اور اس کے قدرتی نتائج کے ظاہر ہونے سے بظاہر کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی، چنانچہ اس خاندان اور حکومت کا زوال تاریخ میں اسی شخص کے نام لکھا گیا، جو اپنے بہت سے پیشروں سے بہتر تھا، اور بہت حد تک اصلاح حال کا خواہشمند تھا۔

اگرچہ بغداد میں اہل اصلاح کی ایک تعداد علم و درس اور عبادت میں مشغول تھی، اور کچھ الشر کے بندے خائفانوں اور مساجد میں غلو نشین اور مکیو تھے، لیکن حکام اور آسودہ حال طبقہ میں بگاڑ پھیل گیا تھا،

اس عہد کا ایک مورخ ابوالحسن خزر جی اپنے زمانہ کے اہل عراق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”جاگیروں اور جائیدادوں کے حصول کا شوق بہت بڑھ گیا ہے، رخاہ عام کے کام اور اجتماعی مصالح سے لوگوں کی نظر ہٹ گئی ہے، ان دنیاوی امور میں شغولیت بہت بڑھ گئی ہے، جو جائز نہیں ہے، محال سلطنت کے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے، اور سب کو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی فکر ہے۔“
آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ :-

”یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے، سلطنت کفر کے ساتھ تورہ جاتی ہے، ظلم کے ساتھ نہیں رہتی۔“

اُدھر عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں خوارزم شاہی بلا شرکت غیرے حکومت کر رہے تھے، یہ بڑے جاہ و جلال کی سلطنت تھی، جو پانچویں صدی کے آخر میں سلطنت سلجوقیہ کے کھنڈروں پر قائم ہوئی، مصر و شام، عراق و حجاز اور شمال مغرب میں ایٹا، کوچک کے مختصر سلجوقی علاقہ، اور جنوب مشرق میں غوریوں کی نوخیز سلطنت کو مستثنیٰ کر کے تقریباً سارا عالم اسلام خوارزم شاہیوں کے زیر نگین تھا، اس خاندان کا سب سے بڑا واصلہ مند عالی ہمت اور کشور کشا سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ - ۶۱۷ھ) تھا، جو اپنے عہد کا سب سے بڑا نہ صرف مسلمان بادشاہ بلکہ شاید اپنے عہد کا سب سے طاقتور سلطان تھا، ہیرلڈ لمب (H. LAMB) اپنی کتاب ”چنگیز خاں“ میں صحیح لکھتا ہے :-

”اسلامی ملکوں کے قلب میں سلطان محمد خوارزم شاہ اورنگ شاہی پر فدائے جنگ بنا بیٹھا تھا، اس کی قلمرو ہندوستان کی سرحد سے بغداد تک اور بحر خوارزم (آرال) سے خلیج عجم تک چلا گئی تھی، سلجوقی ترکوں کے سوا جنھوں نے صلیبیوں پر فتوحات حاصل کی تھیں، اور مصر کے سلاطین، ملکوں سے قطع نظر کر کے جو روز افزوں ترقی پرتھے، باقی جس قدر اسلامی سلطنتیں تھیں، ان پر سلطان محمد خوارزم شاہ بالکل چھایا ہوا تھا، سلطان محمد رتبہ میں شہنشاہ تھا، عباسی خلیفہ ناصر الدین الشراس سے ناراض تھے، مگر اس کی قوت کو مانتے تھے، خلیفہ

۱۔ ملاحظہ ہو مضمون ”عصر الشراہی ببغداد“ از ناجی معروف رسالۃ الاقلام، بغداد شمارہ محرم ۱۳۸۶ھ۔

بغداد دنیاوی اقتدار سے محروم ہو کر پاپائے روم کی طرح صرف دین کا بادی و رہنما رہ گیا تھا۔

عرب مورخین علامہ الدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت و اخلاق کی کسی بڑی کمزوری اور کسی قابل ذکر خصلت عیب کی طرف اشارہ نہیں کرتے، بلکہ اس کی دینداری، خوش اعتقادی اور شجاعت و صلابت کا عام طور پر اعتراف کرتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ساری صلاحیتیں اور طاقتیں ان چھوٹی بڑی اسلامی سلطنتوں کے ختم کرنے میں صرف ہوئیں جو اس وسیع مشرقی حصہ میں کہیں واقع تھیں، ایک طرف شمال و مغرب میں اس نے سلجوقیوں کو ان کے آخری حدود تک پسپا ہونے پر مجبور کیا، دوسری طرف مشرق اور جنوب میں وہ ہمیشہ غوریوں سے نبرد آزما رہا، اور ان کو بھی ایک محدود حصہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا، ایران و ترکستان کی سپہ گری کا بہترین عنصر اس غیر ختم سلسلہ جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گیا تھا، ان زرخیز و مردم خیز ممالک کے شہروں و قصبات کی فضا اور ذہن پر جنگ ہر وقت چھائی ہوئی رہتی تھی، مفتوحہ ممالک کی دولت شاداب و حاصل خیز ملکوں کی پیداوار، دستکاروں اور اہل صنعت کی تلاش و خراش کی وجہ سے جو سلطنت و طاقت کے اس مرکز میں جمع ہو گئے تھے، تمدن اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا، اور فراغت و لامارت اور فتوحات کے سائے لازم جمع ہو گئے تھے، اس وقت کی تمدنی خرابیوں و کمزوریوں کا ذکر تو ان تاریخوں میں ملنا مشکل ہے، جن کو صرف سرکار دربار سے سروکار تھا، اگر اس کا سراغ کچھ مل سکتا ہے، تو اہل دل صوفیاء و مشائخ اہل صلیحین کی بیاضوں، ملفوظات اور مواظع میں، جن کا بڑا حصہ تاتاری سیلاب کے نذر ہو گیا، چنگیز خاں کا سیسی مورخ ہیرلڈ ایمبلی کا یہ بیان محض دینی تعصب اور مبالغہ آرائی پر محمول نہیں کیا جاسکتا کہ:-

”مسلمانوں کی دنیا جنگ و پیکار کی دنیا تھی، اور ایسی دنیا تھی جو نغمہ و سرود سے بھی شغل رکھتی تھی، اور

کان بھی اچھے پائے تھے، لیکن اس ظاہر کے ساتھ باطن میں ایک ہیجان کی حالت ہمہ وقت ضرور رہتی تھی،

بادشاہوں کی جگہ غلام اور ملوک حکومت کرتے تھے، دولت جمع کرنے کا شوق بہت تھا، اخلاقی برائیاں

اور ملکی نازشیں بھی کچھ کم نہ تھیں، انتظام امور ایسے لوگوں کے سپرد تھا، جو رعایا کو لوٹے اور کھاتے تھے، عورتوں کی نگہداشت خواجہ سراؤں کے ذمہ تھی، اور ایان کا مالک خدا تھا۔

خوارزم شاہی سلاطین سے اس موقع پر بھی وہی مہلک غلطی ہوئی، جو اسپین کے عرب فرمانرواؤں نے کی تھی، اور جس کو الہی قانون مکافات نے معاف نہیں کیا، یعنی یہ کہ انھوں نے اپنی ساری طاقت سلطنت کی توسیع و استحکام اور حریفوں کی سرکوبی میں صرف کی، اور اس انسانی آبادی میں جو ان کی سرحد سے متصل تھی، اور بجائے خود ایک دنیا تھی، تبلیغ اسلام، اور ان تک خدا کا آخری پیغام پہنچانے کی کوئی فکر نہیں کیا، جذبہ دینی سے قطع نظر کہ سیاسی فراست اور دور بینی کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اس وسیع انسانی آبادی کو اپنا ہم آہنگ اور ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتے، اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس خطرہ سے محفوظ ہو جاتے، جو نہ صرف ان کو بلکہ پورے مسلمانوں کو پیش آیا۔

یہ زمانہ اور حالات تھے، جب تاتاری ابتداً اپنے سردار اور قائد چنگیز خاں کی قیادت میں عذاب الہی کی طرح عالم اسلام کے مشرقی حصہ ایران و ترکستان کی طرف بڑھے، پھر اس بغداد کی بھی نوبت آگئی، جہاں کا نقشہ اوپر کی سطروں میں گذر رہا ہے، اور بالآخر انھوں نے ۶۵۶ھ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی ﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُ لَآ تَنْصِبُنَّ لِلَّهِ دِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾

عالم اسباب میں اس کا قریبی محرک یہ واقعہ ہوا کہ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو پیام بھیجا کہ میں بھی ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ہوں، اور آپ بھی ایک وسیع سلطنت کے تاجدار ہیں، بہتر ہے کہ ہم دونوں تجارتی تعلقات قائم کریں، ہمارے تاجر بے خوف و خطر آپ کے قلمرو میں جائیں، اور یہاں کی مخصوص پیداوار اور مال لے چکے خاں ۶۵۳ھ ہیر لڈیمب ماغوزاز ترجمبولوی عنایت الشرماحب مرحوم ۶۵۳ھ چنگیز خاں کی سلطنت کی ابتدا ۶۵۵ھ سے ہوئی، خوارزم شاہ کی حکومت پر پہلا حملہ ۶۵۶ھ میں ہوا، اس کا انتقال ۶۶۲ھ میں ہوا، اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اس کے مقاصد کی

تکمیل کی ۶۵۶ھ میں جب بغداد پر حملہ ہوا تو تاتاری افواج کا قائد اور امیر چنگیز خاں کا پوتا ہلاک خاں تھا۔

وہاں فروخت کریں، اور آپ کے تاجر اطمینان کے ساتھ ہمارے ملک میں آئیں، اور وہاں کا مال فروخت کریں، خوارزم شاہ نے اس کو منظور کر لیا، اور تجارتی تعلقات قائم ہو گئے، اور تجارتی قافلے بے تکلف دونوں ملکوں میں آنے جانے لگے، اس کے بعد کیا پیش آیا، جس سے عالم اسلام اچانک خون کے سمندر میں ڈوب گیا، اس کی تفصیل مغربی مورخ کی زبان سے سنئے، جس کی اسلامی مورخین کے بیان سے حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے۔

ہیرلڈ لیمب اپنی کتاب ”چنگیز خاں“ میں لکھتا ہے:-

”لیکن تجارت کے تعلقات جو چنگیز خاں نے قائم کئے تھے، وہ اتفاق سے یک سخت ختم ہو گئے، اور یہ اس طرح پیش آیا کہ قراقرم سے تاجروں کا ایک قافلہ مغرب کو آ رہا تھا کہ راستہ میں اترا کر حاکم نے جس کا نام انیل ہی تھا قافلہ کے سب آدمیوں کو گرفتار کر لیا، اور اس کی اطلاع اپنے آقا یعنی خوارزم شاہ کو اس طرح کی گویا اس قافلہ میں جاسوس بھی موجود ہیں، انیل ہی کا یہ خیال بالکل قرین عقل تھا۔

حاکم اترا کر کے پاس سے اطلاع کے آتے ہی سلطان محمد خوارزم شاہ نے بے سوچے سمجھے حکم دے دیا کہ قافلہ کے کل تاجروں کو ہلاک کر دیا جائے، چنانچہ اس حکم کے مطابق قراقرم سے آئے ہوئے کل تاجر قتل کر دیئے گئے، اس کی اطلاع جس وقت چنگیز خاں کو ہوئی تو اس نے فوراً اپنے سفیر بھیج کر خوارزم شاہ سے اس کی شکایت کی، سلطان محمد نے سفیروں کے سردار کو بھی قتل کر دیا، اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے، ان کی داڑھیاں جھلوا دیں، اس سفارت میں سے جن لوگوں کی جان بچ گئی تھی، وہ چنگیز خاں کے پاس آئے اور کل حال عرض کیا، دشت گوئی کا خان حال سننے ہی ایک پہاڑی پر چڑھ گیا کہ تنہائی میں اس واقعہ پر غور کرے، مغلوں کے ایلچی کو مار ڈالنا ایسا فاضل تھا، جسے بغیر مزے کے چھوڑنا ممکن نہ تھا، یہ حرکت ایسی تھی جس کا بدلہ لینا مغلوں کی گذشتہ روایات کے لحاظ سے ضروری تھا۔

چنگیز خاں نے کہا جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے، اسی طرح زمین پر دو خاقان

نہیں رہ سکتے۔

اسلام کے مشرقی ممالک تاتاریوں کی زد میں

تاتاریوں نے پہلے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور اس کو ایک توہ خاک بنادیا، شہر کی آبادی سب کوئی زندہ نہیں بچا، پھر مرقد کو خاک سیاہ کر دیا، اور ساری آبادی کو فنا کے گھاٹ اٹار دیا یہی حشر عالم اسلام کے نامی گرامی شہروں بے ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم کا ہوا، خوارزم شاہ جو عالم اسلامی کا واحد فرمانروا اور سب طاقت و سلطان تھا، تاتاریوں کے خوف سے بھاگا پھرتا تھا، اور تاتاری اس کے تعاقب میں تھے، یہاں تک کہ ایک نامعلوم جزیرہ میں اس نے قضا کی۔

خوارزم شاہ نے ایران و ترکستان کی اسلامی ریاستوں اور خود مختار حکومتوں کو اپنی شاہی خیمہ کر لیا تھا، اس لئے جب انھوں نے تاتاریوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو پھر ان کا مقابلہ کرنے والا مشرق میں کوئی نہ تھا، تاتاریوں کی ہمیت اور مسلمانوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ایک تاتاری ایک گلی میں گھسا ہے، جہاں سو مسلمان موجود تھے کسی کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی، اور اس نے ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا، اور کسی نے ہاتھ تک نہ اٹھایا، ایک گھر میں ایک تاتاری عورت مرد کے بھیس میں گھس گئی اور تنہا سارے گھر والوں کو قتل کر دیا، پھر ایک قیدی کو جو اس کے ساتھ تھا، احساس ہوا کہ یہ عورت ہے تو اس نے اس کو قتل کیا، بعض اوقات تاتاری نے کسی مسلمان کو گرفتار کیا، اور اس سے کہا کہ اس پتھر پر سر رکھ دے، میں خنجر لاکر تجھے ذبح کروں گا، مسلمان سہاڑا رہا، اور بھاگنے کی ہمت نہ ہوئی، یہاں تک کہ وہ شہر سے خنجر لایا اور اس کو ذبح کیا۔

تاتاری یورش عالم اسلام کے لئے ایک بلا، عظیم تھی، جس سے دنیا، اسلام کی چولیس ہل گئیں، مسلمان مہبوت و ششدر تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہر اس اور یاس کا عالم طاری تھا

تاریوں کو ایک بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا، ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابل قیاس سمجھی جاتی تھی

یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا کہ "إِذَا خِلَ لَكَ أَنَّ التَّوَلَّى لَدَيْهِمْ مُؤَافَلًا تَصِيقٌ" یعنی اگر تم سے کہا جائے کہ تاریخوں کو کہیں شکست ہوئی ہے، تو یقین نہ کرنا، جن ملکوں یا شہروں کی طرف ان کا رخ ہو جاتا، سمجھ لیا جاتا تھا کہ ان کی شامت آگئی، جان و مال، عزت و آبرو، مساجد و مدارس کسی کی غیر نہیں تھی، تاریخوں کا رخ کرنا بربادی، قتل عام، ذلت و بے آبروی کا مرادف تھا، ایک مرتبہ تقریباً سارا عالم اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنہ جہاں سوز کی لپٹ میں آگیا، مورخ ہر طرح کے واقعات پڑھتا اور لکھتا ہے اس کے سامنے قوموں کی بربادی اور ملکوں کی تباہی کے اتنے مناظر گذرتے ہیں کہ اس کی طبیعت بے حس اور اس کا قلم بیدار نہ ہو جاتا ہے، لیکن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر جیسا مورخ (جس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ دنیا کی تاریخ لکھی ہے) اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکا وہ لکھتا

"یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک پس پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں اب بھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر رہا ہوں، واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر موت سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے؟ کاش میں نہ پیدا ہوا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا، اور بھولا بسر ہو جاتا، لیکن مجھے بعض دوستوں نے اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد تھا، لیکن میں دیکھا کہ نہ لکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، یہ وہ حادثہ عظیمی اور مصیبت کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے، لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا اس دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا، اور شاید دنیا قیامت تک (یا جوج ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے، ان حیلوں نے کسی پر دم نہیں کھایا، انھوں نے عورتوں، مردوں، اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے، اور

پیٹ کے بچوں کو ارڈالا اَنَاجِلَہ وَاَنَّا لِلّٰہِ رٰجِعُوْنَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

یہ حادثہ عالمگیر و عالم آشوب تھا، یہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم میں پھیل گیا۔

”مرصا و العباد کا مصنف جو اس تاتاری حملہ کا شاہد یعنی ہے، اور جس کا مولدے اور مسکن بہر ان اس تاتاری غارت گری کے نذر ہو چکے تھے، لکھتا ہے:-

”تاریخ شہور سنہ سبع و عشر و ستائے شکر خندول کفار تاتار تاخذ لہم اللہ و دَعَوَهُمْ اَسْتِیْلَا

برآں دیار و آن فتنہ و فساد و قتل و دہم و حرق کہ ازاں ملا عین ظاہر گشت در بیچ عصر در زمان کفر و اسلام

کس نشان نہ دادہ است و در بیچ تاریخ نیامہ و قبل ازیں بیشتر چکود بود کہ از یک شہرے کہ مولد و منشا

ایں ضعیف است قیاس کردہ اند کہ بیش ہفت صد ہزار آدمی بقتل آمدہ است و اسیر گشتہ از شہر و

ولایت و فتنہ و فساد آن ملا عین مخاذیل بر حلقی اسلام و اسلامیان ازاں زیارت است کہ در حیز عباد

گنجد و ایں واقعہ ازاں شائع تر است در جہاں کہ بشرح حاجت فتنہ و اگر عیاداً بالشر غیرت و حمیت

اسلام در نہاد ملوک و سلاطین و خنبکہ کہ عہدہ رعایت مسلمانی و مسلمانان در ذمہ ایشان است کہ

”الامیر سراج علی سر عیتہم و ہُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْہُمْ“ و اریحیت و رجولیت دین و امن ایشان

نکیر و تبا اتفاق جمعیت کنند و کمر انقیاد فرمان اِنْخَرُوا وَاِخْفَاؤُا وَتَحٰا لَّا وَجْہًا لِّدِیَارِہُمْ اَمَّا اَلْکُمْ

وَ اَنْفُسِکُمْ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ“ بر میان جان بندند و نفس و مال و ملک در دفع این فتنہ نہا کنند بوجہ آئی آید

کہ بیک بارگی مسلمانی بر انداختہ شود و اکثر بلاد اسلام بر افتاد این بقیت را نیز بر اندازند جہاں کفر گہر و دود خند

یا اللہ خوف و خطر آن است کہ مسلمانی آن قدر اسے کہ ماندہ بود شوی معاملہ مامعیاں بے معنی چنان بر خیزد

کہ نہ اسم ماند نہ رسم۔

تنہا عالم اسلام نہیں اس وقت کی پوری متمدن دنیا تاتاریوں کے حملہ سے لرزہ بر اندام تھی، جہاں

ان کے پہونچنے کے بہت کم امکانات تھے، وہاں بھی دہشت پھیلی ہوئی تھی، لیکن اپنی مشہور کتاب "تاریخ انحطاط و سقوط رومہ" میں لکھتا ہے:-

"سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لئے نہیں نکلے۔"

کیمبرج کی تاریخ عہد وسطیٰ کے مصنفوں نے مغلوں کے اس شدید تصادم کو جس کا محرک چنگیز خان بڑی خوبی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"انسان کی طاقت سے باہر تھا کہ مغلوں کو روک سکیں، دشت و صحرا کے تمام خطروں پر وہ غالب آئے پہاڑ، سمندر، موسمی سختیاں، قحط، وبائیں کوئی بھی ان کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکا کسی قسم کے خطروں کا انھیں خوف نہ تھا، کوئی قلعہ ان کے حملہ کی تاب نہ لا سکتا تھا، اور حم کے لئے کسی مظلوم کی فریاد ان پر اثر نہ کرتی تھی، یہاں میدانِ تاریخ میں ایک نئی طاقت سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے، یہ طاقت اور زور ایسا تھا، جس نے بہت سی ملکی اور سیاسی قضیوں کا چشم زدن میں فیصلہ کر دیا، اور انھیں اس طرح مٹا دیا، جیسے آسمان زمین پر گر کر سب چیزوں کو مٹا دے، یہ ملکی اور سیاسی قضیے بھی ایسے تھے کہ اگر آفت نازل نہ ہوتی تو آگے چل کر یا تو کسی کے حل کئے وہ حل نہ ہوتے، اور اگر جاری رہتے تو کبھی ختم ہونا نہ جانتے، تاریخِ عالم میں اس نئی قوت کا ظہور یعنی ایک شخصِ واحد کی یہ قابلیت کہ بنی نوع انسان کے تمدن کو بدل دے، چنگیز خاں سے شروع ہوا، اور اس کے پوتے قوبلائی خاں پر ختم ہو گیا، جس کے زمانہ میں مغلوں کی سالم اور بسیط سلطنت نے تقسیم و تفریق کے آثار ظاہر کرنے شروع کر دیے، ایسی طاقت کبھی دنیا کے پردہ پر ظاہر نہیں ہوئی۔"

بغداد کی تباہی

بالآخر یہ وحشی عالم اسلام کو زیر و زبر کرتے، خون کے دریا بہاتے اور آگ لگاتے ۶۵۶ھ میں چنگیز خاں

کے پوتے ہلاکو خاں کی سرکردگی میں دنیاۓ اسلام کے دار الخلافت اور اس عصر کے سب سے بڑے علمی مرکز اور
متمدن شہر بغداد میں داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، بغداد کی تباہی اور مسلمانوں کے
قتل عام کی تفصیل طویل اور بہت دردناک ہے، کچھ اندازہ ان مورخین کے بیانات سے ہوگا، جنہوں نے
اس حادثہ کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور اس کی تفصیلات دیکھنے والوں سے سنیں، مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں:

”بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا، چالیس دن کے بعد یزید کا شہر جو دنیا کا چر و فز
ترین شہر تھا، ایسا ویران و تاراج ہو گیا کہ قھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے، بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے
ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے، ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں، اور سارے شہر میں
بدبو پھیلی جس سے شہر کی ہوا خراب ہو گئی، اور سخت وباء پھیلی جس کا اثر تمام ملک پہنچا، اس ہوا اور وباء سے
بکثرت مخلوق مری، گرانی، وبا اور فناء، تینوں کا دور دورہ تھا“

شیخ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں:-

”ہلاکو خاں نے خلیفہ بغداد (مستنصر) کو ایک خیمہ میں اتارا اور وزیر ابن العلقمی نے علماء و اعیان شہر کو
دعوت دی کہ خلیفہ اور ہلاکو کے صلح نامہ پر گواہ بنیں، وہ آئے تو ان سب کی گردن اڑادی گئی، اسی طرح ایک
ایک گروہ کے بعد دیگرے بلایا جاتا اور اس کی گردن اڑادی جاتی، پھر خلیفہ کے معتدین و مقربین کو بلایا گیا
اور ان کو بھی قتل کر دیا گیا، خلیفہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ اگر اس کا خون زمین پر گرے تو کوئی بڑی
آفت آئے گی، ہلاکو تو تردد تھا، نصیر الدین طوسی نے کہا کہ یہ کچھ مشکل بات نہیں، خلیفہ کا خون نہ بہایا جائے، بلکہ

لے البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶

دوسری طرح اس کی جان لی جائے چنانچہ اس کو فرش میں پھینک دیا گیا، اور چھوڑ کر وہاں سے اس کو ختم کر دیا گیا۔

بغداد میں ایک ہمدن سے زیادہ قتل عام جاری رہا، اور صرف وہی بچ سکا، جو چھپا رہا، کہا جاتا ہے کہ ہلاکوں نے مقتولین کو شمار کرایا، تو ۸۰ لاکھ مقتول شمار ہوئے۔

عیسائیوں کو حکم دیا گیا کہ علانیہ شراب پیئیں اور سورگ گوشت کھائیں، اگرچہ رمضان کا زمانہ تھا مگر مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ شرکت کریں، مسجدوں کے اندر شراب انڈلی گئی، اور اذان کی ممانعت کر دی گئی، یہ وہ بغداد ہے جو (جب سے آباد ہوا) کبھی دار الکفر نہیں ہوا تھا، وہاں وہ واقعہ پیش آیا جو کبھی تاریخ میں پیش نہیں آیا۔ بغداد ہزار خرابیوں کے باوجود عالم اسلامی کا سب سے بڑا شہر، علوم و فنون کا مرکز، ہزار ہا علماء، صلیحا، سکن اور دار الخلافت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی آبرو تھا، اس کی بربادی نے تمام حساس مسلمانوں کو تڑپا دیا، اور ہر طرف اس کا ماتم کیا گیا، شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو بغداد میں طالب علمی کر چکے تھے اور اس کی رونقیں دیکھے ہوئے

(باقی ص ۳۲۰) کے بعد خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر کے، خلیفہ بغداد مستعصم باللہ کے پاس ہلاکونے اطاعت کا حکم بھیج دیا اور اسلٹ ہوئی رہی، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اب ہلاکونے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا، مغلجوم سعدونخس کے بہت متقدّم تھے، حام الدین نامی ایک نئی فوجی اس کے دربار میں تھا، اس نے کہا کہ حملہ بغداد کی یہ گھڑی خس ہے، اور جب کسی بادشاہ نے خلافت پر ہاتھ ڈالا ہے، تو اسے مرنے کی کھانی پڑی ہے، اور کسی نہ کسی بلا میں گرفتار ہوا ہے، اگر آپ حملہ کرتے ہیں، تو باریش بند ہو جائے گی، طوفان اور زلزلے آئیں گے، اور ایک عالم ویران ہو جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بادشاہ (منکوقاآن) ہلاک ہو جائے گا، یں کہ ہلاک ہو کر متروک ہو گیا، ہلاکونے طوسی کی رائے معلوم کی کہ اگر بغداد حملہ کنیم عاقبت چہ ہو؟ ہاشم طوسی نے جواب میں کہا، چیرے خود ہاشم، جزا ینکے بجائے خلیفہ خان خواہد ہو، ہلاکونے طوسی اور حام الدین دونوں کو ہلاک کرنا خواہ کر لیا، طوسی نے کہا کہ ہزاروں محاربہ شہید کر دیئے گئے، مگر کوئی خدا ظاہر نہیں ہوا، اگر جاسیوں کی خصوصیت کہتے ہو تو ظاہر ہو دیکھو، جن لوگوں کے حکم سے خلیفہ وقت امین سے جنگ کی، اور اس قتل کر دیا، متوکل کو اس رکوں اور غلاموں اتفاق کر کے مار ڈالا، متعز اور متضد کو امر اور غلاموں نے ختم کر دیا، مگر کوئی زلزلہ اور طوفان نہیں آیا۔ ۲۵ لاکھ آبادی میں یہ کچھ بعید نہیں، بعض مورخین نے مقتولین کی تعداد اس کم بیان کی ہے

تھے، ایک دل دوزم تیرہ کہا جس میں اس وقت کے تمام مسلمانوں کے زخمی دلوں کی ترجمانی ہے، اس کے چند اشارے نقل کئے جاتے ہیں:-

برزوال ملک مستعصم امیر المومنین	آسماں راحق بود گرنوں ببارد بر زمین
سر بر آوردین قیامت در میان خلق ہیں	اے محمد گر قیامت می بر آری سر ز خاک
ز استان بگذشت و مارا خون دل آراستیں	نازنینان حرم را خون خلق نازنین
در خیال کس نگشتی کا پنچناں گرد و چنیں	زیہار از دور گیتی و انقلاب روزگار
قیصر اں روم سر بر خاک خاقاں بر زمین	دیدہ بردار لے کہ دیدی شوکت بیت اہرام
ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہاد جیسے جس	خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریختہ
خاک نخلستان بطحا را کتبہ با خون عجیب	وجہ خونابست زیں پس گر ہند بر پشت
می تو اں دانست بر روش ز برج افتادہ چیں	رفے در یاد ہم آمد زیں حدیث ہولناک
کمتریں دولت مرا یشاں را بہشت برتریں	نوحہ لائق نیست بر خاک شہیدان زانکہ ہست
مہربان را دل بسوزد در فراق نازنین	لیکن از رفے مسلمانوں و راہ مرحمت

بغداد کے بعد تاتاریوں نے حلب کا رخ کیا، اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ بھی بغداد کا سا سلوک کیا، وہاں سے دمشق کی طرف بڑھے اور حجاجی الاولیٰ ۵۵۷ھ میں اس پر قبضہ کر لیا، شہر کے عیسائیوں نے تاتاری فاتحوں کا شہر سے نکل کر استقبال کیا، اور ان کو تحائف پیش کئے، اور ان کے حاکم کے پاس سے فرمان لے کر آئے، اور شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے، ابن کثیر جو خود دمشق کے رہنے والے ہیں، اس واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں، جس سے مسلمانوں کی بے بسی، ذلت و کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے:-

”عیسائی باب تو اسے داخل ہوئے، وہ صلیب کو لوگوں کے سروں پر بلند کئے ہوئے تھے، اور اپنا مخصوص

لگا رہے تھے، وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ دین برحق یسوع مسیح کا دین غالب آیا، اور اسلام اور اہل اسلام کی صاف صاف مذمت کرتے تھے ان کے ہاتھوں میں شراب کے برتن تھے جس مسجد کے پاس سے گزرتے، اس کے پاس شراب چھڑکتے کچھ شراب کی بوتلیں تھیں، جن کو لوگوں کے چہروں اور کپڑوں پر چھڑکتے تھے، گلیوں اور بازاروں میں جو شخص بھی گزرتا، اس کو حکم دیتے تھے کہ صلیب کی کھڑے ہو کر تعظیم کرے، مسلمان یہ نقشہ دیکھ کر جمع ہو گئے، اور ان کو دھکائے کر کنیئر، مریم تک پہنچا دیا، وہاں عیسائی مقرر نے کھڑے ہو کر مسیحیت کی تعریفیں فرمیں گی، اور دین اسلام، اور اہل اسلام کی مذمت کی۔

ابن کثیر ذیل المراءۃ کے حوالہ سے آگے لکھتے ہیں :-

”عیسائی جامع مسجد میں شراب لئے ہوئے داخل ہوئے، ان کی نیت تھی کہ اگر تاتاریوں کا زیادہ دھنا ہوا، تو وہ بہت سی مسجدوں کو گرا دیں گے، جب شہر میں یہ واقعات پیش آئے تو مسلمان قاضی، شاہ اور علماء جمع ہو کر قلعہ میں گئے، اور تاتاری حاکم قلعہ ”ایل سیان“ سے شکایت کی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بڑی ذلت سے نکال دیئے گئے، اور عیسائیوں کے سر پر آوردہ لوگوں کی بات مانی گئی۔“ اِنَّا لَنُفِخُ فِي الصُّورِ ۝ اِنَّا لَنُفِخُ فِي الصُّورِ ۝

شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا، اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا جو ان کی غارت گری سے بچا ہوا تھا، سلطان مصر الملک المنظر سیف الدین قطر کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے، اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے، اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے، چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۵ھ کو عین جالوت کے مقابلہ پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا، اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی، وہ بُری طرح سے بھاگے مصریوں نے ان کا تعاقب کیا، اور کثرت سے ان کو قتل کیا، اور بڑی تعداد میں گرفتار۔

سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں :-

تاتاریوں کو شرمناک ہزیمیت ہوئی، اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں نے ان پر فتح پائی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا، اور وہ اس طرح سراسیمہ ہو کر بھاگے کہ لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئیں، وہ آسانی سے ان کو کپڑے لیتے تھے اور لوٹتے تھے۔

عین جالوت کے معرکہ کے بعد سلطان الملک انطاہر سیرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی، اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا، اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں!

تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام

قریب تھا کہ سارا عالم اسلام اس سیلابِ بلا میں بہ جائے، اور جیسا کہ اس وقت کے اہل نظر اور دردمند مسلمان مصنفین نے خطرہ ظاہر کیا ہے، اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جائے کہ دفعۃً تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام شروع ہو گئی، اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور مسلمان بادشاہ نہ کر سکے، وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام دیا، اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے اس ناقابلِ تسخیر قوم کا اسلام سے سحر اور مسلمانوں کے فاتح کا اسلام سے مفتوح ہو جانا ہے، تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق و باد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا، اور عالم اسلام کو بزورِ شمشیر فتح کر لینا، اتنا عجیب واقعہ نہیں، اس لئے کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان بیماریوں، کمزوریوں کا شکار تھا، جو بالعموم تمدن و تہذیب کی انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہوا کرتی ہیں، اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں، اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی اور خون خوار خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معمایہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں

یہ نیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست و پا مسلمانوں کے دین کی حلقہ بگوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادی اور سیاسی طاقت کھو چکا تھا، اور جس کے پیروؤں کو تاری سخت ذلت اور خوارت کی نظر سے دیکھتے تھے، پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوتِ اسلام (PREACHING IN ISLAM) میں استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے پھ اٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مخلوق کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا یہ ایسا کام تھا، جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلات پیش آئیں کیونکہ دو مذہب س بات کی کوشش میں تھے، کہ مخلوق اور تاراریوں کو اپنا معتقد بنائیں وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہو گیا جس وقت بد مذہب اور عیسائی مذہب و اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مخلوق کو جنھوں نے ان تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پاٹ لیا تھا، اپنا مطیع بنائیں؟“

”اسلام کے لئے ایسے وقت میں بد مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا، اور مخلوق کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا، جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی، مخلوق کے طوفانِ ہلاکت سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا، وہ مشہور و معروف شہر جو ایک زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے، اور جہاں ایشیا کے ارباب علم و فضل آباد تھے، اکثر جلا کر خاک کر دیئے گئے تھے، مسلمانوں کے عالم اور فقیر یا تو قتل کئے گئے، یا ان کو غلام بنایا گیا، خاندانِ خل جو اسلام کے سوائے اور سب مذہبوں پر مہربان تھے، اسلام کے ساتھ مختلف درجہ کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے، چنگیز خاں نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شرع کے مطابق

۱۔ دعوتِ اسلام (مترجم مولوی غایت اللہ) ص ۲۳۱، ۲۳۲ ۲۔ مخلوق نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ چینی تماشے والے جب پردہ پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں، تو ایک تصویر میں سفید راجہ کا ایک بڑھا آدمی آتا ہے جس کی گردن گھوڑے کی دُم سے بندھی ہوتی ہے، اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مخلوق کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہنچائے (ہو دور تھ پہلی جلد ص ۱۵۹)۔

ذبح کریں ان کو قتل کرو یا جائے، اسی حکم کو قبطائی خان نے اپنے زمانہ میں از سر نو جاری کیا، اور اس ملک پر یو کے لئے مخبر اور خبروں کے لئے انعام مقرر کئے، اور اس طرح سات برس تک مسلمانوں کو سخت سے سخت آزار پہنچائے، غلوسوں اس موقع پر دولت جمع کر لی، اور غلاموں نے آزاد ہونے کے لئے آقاؤں پر ذبح کا الزام لگایا، کیونکہ خاقان کے ہمدیں (۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۰ء) جس نے کل انتظام سلطنت دو عیسائی وزیروں پر کر رکھا تھا، مسلمانوں کو سخت آذیتیں پہنچائیں، اور خوقان نے بھی جو چوتھا ایچان (۱۲۴۰ء تا ۱۲۴۹ء) ہو مسلمانوں پر ظلم کئے، اور عدالت اور مال کے محکموں میں جس قدر سامیال کی پائتھیں وہ خالی کر لیں، اور اکل دربار میں آنا بند کر دیا، باوجود ان شکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں، انہی مسلمانوں کا مذہب قبول کیا جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندنا تھا۔

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے، اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں، اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا، ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے، جن مخلصین نے اس خون آشام تاریخی قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کا نام دنیا کو معلوم ہے، مگر ان کا یہ کارنامہ کسی اسلامی کارنامہ سے کم نہیں، اور ان کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک ہے، گا کہ انھوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی تولیت میں دے دیا، جو خدائے واحد کی پرستار اور رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی علمبردار تھی۔

چنگیز خاں کی سلطنت انتقال کے بعد اس کے چار بیٹوں کی چار شاخوں میں بٹ گئی تھی، ان چاروں شاخوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی اور تاریخی خاقان اور ان کی دعوت و تبلیغ اور اثر سے تاریخی قوم مسلمان ہونا شروع ہو گئی، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر تقریباً ساری تاریخی قوم مسلمان ہو گئی۔

لے ہو ورتھ ۱۱۱۱ء، جس وقت دیکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہو گیا، اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہنچا

پروفیسر آرنلڈ نے دعوتِ اسلام میں اس کے جستہ جستہ واقعات لکھے ہیں، چنگیز خاں کے بڑے بیٹے جو جی خاں کی شاخ میں جو سلطنت کے مغربی حصہ سیراد اور اپر حکمران تھے، اشاعتِ اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:-

مغلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا، وہ برک خاں تھا، جو ۱۲۵۶ء سے ۱۲۶۶ء تک سیراد اور کا خان رہا۔ اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت لکھا ہے کہ ایک ن وہ ایک کارواں میں پہنچا، جو بخارا سے آتا تھا، اس میں دو مسلمان تاجر تھے، جن کو برک خاں الگ لے گیا، اور اسلام کے متعلق کچھ سوالات ان سے کئے، مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام و ارکان اس خوبی سے بیان کئے کہ سیراد اور کا مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا، وہ اسلام لیا۔ اس کا حال برک خاں نے اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا، اور اس کو بھی اسلام قبول کرنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد برک خاں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا، اسلام قبول کرنے کے بعد برک خاں نے سلطان مصر رکن الدین بیکر سے مصاحبت کرنی، اس مصاحبت کا باعث خود سلطان مصر اس طرح ہوا کہ اس نے سیراد اور کے دو مغلوں کی نہایت خاطر مدارات کی، ان مغلوں کا قصہ یہ ہے کہ جب خان سیراد اور ہلاکو خان فاتح بغداد میں عداوت زیادہ بڑھی تو یہ دو مغلوں جو ہلاکو خان کی فوج میں بھرتی تھے بھاگ کر شام کے ملک میں چلے آئے اور یہاں سے وہ بڑے اعزاز کے ساتھ قاہرہ پہنچائے گئے، جہاں دباؤ مصر سے ان کو اسلام قبول کرنے کی ہدایت ہوئی، سلطان رکن الدین نے ان مغلوں میں سے دو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے چند سفیر کئے، اور برک خاں کو ایک خط لان کی معرفت روانہ کیا، جب یہ لوگ سیراد اور سے قاہرہ کو واپس آئے تو سلطان کو خبر دی کہ برک خاں کے امیروں کے ہاں اور ایک شہزادی کے ہاں ایک ایک امام اور مؤذن مقرر ہے اور بچوں کو کتب میں قرآن پڑھایا جاتا ہے، سلطان سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ہم قاہرہ سے

۱۲۵۶ء میں رکن الدین بخارا راہ دی نے برک خاں کے لئے ایک کتاب لکھی جس میں رسالت کو برہان ثابت کیا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے

مذہبی مناظروں کا حال لکھا ہے، ابوالغازی توم ۱۸۴۱ء ۳۵ قریزی ۱۸۴۱ء ۳۵ ایضاً ۲۱۵

تاتاری سلطنت اور خاندان چنگیز خاں کی دوسری شاخ دولت الیمانیہ میں اشاعتِ اسلام کے متعلق آرنلڈ لکھتا ہے:-

”ایران میں جہاں ہلاکوحاں دولت ایٹھانیر کا بانی ہوا، ترکوں میں اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی (ہلاکوحاں کا بیٹا ککودار جو اپنے بھائی باقاخاں کا جانشین ہوا، دولت ایٹھانیر کا پہلا بادشاہ تھا، جس نے اسلام قبول کیا، ایک عہد نویس عیسائی مصنف نے لکھا ہے کہ ککودار کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی، بچپن میں اس کو اصطباغ ملا تھا، اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا، لیکن ککودار جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے اثر و صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، اور سلطان محمد (یا احمد) نام رکھا، اور جس قدر ہو سکا، اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کر لیں، اور اس کے لئے انعام و اکرام اور اختیار اور عزت لوگوں کو بخشی، یہاں تک کہ اس کے زمانہ میں بہت تاتاری مسلمان ہو گئے، اس بادشاہ نے سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر ذیل کے مراسلہ سے بھیجی۔

”خدا کی قوت اور قآن کے اقبال سے سلطان احمد کا فرمان بادشاہ مصر کے نام، بعد تمہید کے واضح ہو کہ خدا نے اپنی عنایت اور ہدایت کی روشنی سے آغاز نو جوانی کے زمانہ میں ہم کو اپنی الوہیت اور وحدانیت کا اقرار کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنے اور اپنے دوستوں اور نیک بندوں کی نسبت خوش اعتقاد رہنے کی ہدایت کی تھی، وہ جس کی کو ہدایت پر لانا چاہتا ہے اس کے دل کو مذہب اسلام قبول کرنے کے لئے

۱۷۸ مقریزی ۱۸۵۲ ایضاً ۲۲۲ ۱۷۹ وصاف نے اس بادشاہ کو مسلمان ہونے سے پہلے تگودار اور مسلمان ہونے کے بعد احمد

کھول دیتا ہے، ہم اس وقت سے آج تک دین کا بول بالا کرنے اور مذہب اسلام اور مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کرنے پر اہل رہے، یہاں تک کہ والد بزرگوار اور برادر بزرگ کی طرف سے حکمرانی کی نوبت ہم تک پہنچی، اور خدا نے اپنی مہربانی سے ہماری امیدوں کو پورا کیا، اور حکومت و سلطنت ہم کو عنایت کی، پھر قربت الی (کوڑتائی) مبارک میں جس سے وہ مجلس مراد ہے جس میں تمام بھائی بند اور شہزادے اور بڑے بڑے امیر اور فوج کے سردار نمودار کرنے کے لئے بیٹھے ہیں، سب نے مل کر یہ اقرار کیا کہ ہمارے برادر بزرگ کے حکم سے فوج کشی کو جاری کیا جائے، اور ہماری فوجوں میں سے جن کی کثرت سے زمین باوجود وسیع ہونے کے تنگ ہے، اور جن کی صولت اور ہیبت سب کے دل کانپتے اور تھرتھرتے ہیں، ایک جم غفیر کو اطراف میں روانہ کیا جائے، اور یہ فوج کشی ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ ہو جس کے سامنے بلند پہاڑ جھک جاویں، اور سنگ خارا کے چٹان نرم پڑ جاویں، ہم نے اس مقصد پر غور کیا، جس پر ان کے ارادے پختہ اور ان کی رائیں متفق تھیں، اور ان سب کا خلاصہ جو معلوم ہوا، وہ اس عام نیکی کے خلاف تھا، جس کے جاری کرنے کا ہم ارادہ رکھتے تھے، اور جس سے مراد یہ ہے کہ شکار اسلام کو زندہ کیا جائے، اور جو احکام ہماری طرف سے جاری ہوں، ان سے غور و غریزی موقوف ہو، اور دنیا کی مصیبت کم ہو، اور دنیا کے اطراف میں امن و امان کی ہوا چلے، اور تمام شہروں کے حاکم ہماری شفقت اور مہربانی سے آرام پائیں، کیونکہ ہم خدا کی تعظیم کرتے ہیں، اور خدا کی مخلوق پر مہربان ہیں، اس لئے خدا نے ہمارے دل میں الہام کیا کہ ہم مشتعل آگ کو بجھائیں، اور فتنہ و فساد کو فرو کریں، اور جن لوگوں نے میرا رے دیئے، ان کو اس تدبیر سے مطلع کریں، جس سے دنیا کی بیاریاں اور تکلیفوں کے دور ہونے کی امید ہے، اور جس کو سب پہلے عمل میں لانے کی سب سے آخری علاج سے باز رہنے کی خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے، اس لئے ہم بیگانوں کو جنجش میں لانے، اور کانٹوں پر چلے چڑھانے میں جلدی نہیں کرتے ہیں، اور جب تک حقیقات ظاہر نہ ہو، حجت قوی نہ ہو، ہم اسلام کی اجازت نہیں دیتے، شیخ الاسلام قدوة العارفین کی نصیحت سے جو امور مذہبی میں ہمارے سب سے بہتر تدبیریں ہمارے اس ارادہ کو جو فلاح و بہبودی کی خواہش پر مبنی ہے، اور اس رائے کو جس سے کامیابی کی امید ہے، پختہ اور مصمم کر دیا، چنانچہ ہم نے یہ فرمان

جاری کیا، جو اپنے دلوں کے لئے خدا کی رحمت اور نہ ماننے والوں کے لئے خدا کا عذاب ہے، ہم نے اس فرمان کے
 اتنے دلوں کے لئے قاضی القضاۃ قطب الدین شیرازی اور تائب بہار الدین کو جو اس سلطان کے عامل تھے، روانہ
 کیا ہے، تاکہ لوگوں کو ہمارے طریقے سے واقف کریں، اور تمام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے عبادت گاہوں کے لئے ہمارے دل میں
 پوشیدہ ہے، سب اس سے آگاہ ہوں، نیز ان سب لوگوں کو اس بات سے مطلع کریں کہ خدا نے ہم کو بصیرت و
 ہدایت عطا کی ہے، اور اسلام ان تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے، جو مسلمان ہونے سے پہلے وقوع میں آئے ہوں،
 اب تو خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم حق کی اور بائیں حق کی پیروی کریں، پس اگر لوگوں کے دل ایسی دلیل کی جستجو
 میں ہیں جن سے وہ ہم پر پھر وسوسہ کر سکیں، اور ایسی حجت طلب کرتے ہیں، جس سے کامیابی کی امید کر سکیں، تو وہ
 ہماری ان تمام فضیلتوں پر نظر ڈالیں، جو دنیا میں عام طور پر مشہور ہو چکی ہیں، کیونکہ ہم نے خدا کی عنایت سے
 دین کے فتاویٰ کو بلند کیا ہے، اور ہر ایک حکم جاری کرنے میں اس امر کو پیش نظر رکھا ہے، اور شرع محمدی کے قوانین
 کو ملحوظان کی عظمت اور بزرگی کے عین مقتضائے انصاف پر جاری کیا ہے، ہم نے تمام رحمت کے دلوں کو
 خوش کیا ہے، اور جن سے پہلے کوئی برائی یا خطا سرزد ہوئی تھی، ان سب کو یہ کہہ کر معاف کر دیا ہے کہ خدا بھی
 تمہاری ان گلی خطاؤں کو معاف کرے، ہم نے مسلمانوں کے اوقات کی جن میں مسجدیں اور مقبرے اور مدرسے
 شامل ہیں، اصلاح کی ہے، اور تمام خیرات خالوں اور مہمان سراؤں کو جن کے نشانات مٹ گئے تھے، دوبارہ
 آباد کیا ہے، اور اوقات کی آمدنی کو ان کے قدیم دستور اور وقت کرنے والوں کے شرائط کے موافق مختاروں
 تک پہنچا دیا ہے، ہم نے حکم دیا ہے کہ ہمارے حکام حاجیوں کے معاملہ کو بہتر متماثل بنائیں، اور ان کے لئے
 سامان سفر تیار کریں، اور جن رستوں سے وہ سفر کرتے ہیں، ان کو آباد و بے خطر رکھیں، اور حاجیوں کے قافلوں
 کو بآرام تمام روانہ کریں، ہم نے تمام سوداگروں کو جو ملک میں آمد و رفت رکھتے ہیں، پوری آزادی عطا کی
 ہے کہ وہ اپنے طریقے سے جس طرح چاہیں، سفر کریں، اور فوج اور قزاقوں اور شیخوں کو جو ملک کے اطراف میں مقرر
 ہیں، سخت ممانعت کی ہے کہ وہ سوداگروں کی آمد و رفت میں کسی طرح کی مزاحمت کریں، تاکہ شہر اور ملک

آباد ہوں، تقے اور فساد فروہوں نیز تلواریں میان میں رہیں، اور تمام باشندے آرام و آسائش سے بسر کریں اور مسلمانوں کی گردنیں ذلت و خواری کے طوق سے نکل جائیں۔

”تاریخ مغلیہ کے ناظرین کو ان صداہا ظلموں اور متواتر کشت و خون کے ہنگاموں کو پڑھنے کے بعد جو غل اور تاراجیوں نے برپا کئے، اس فرمان کے مطالعہ کرنے سے بہت راحت معلوم ہوئی ہوگی، اور تعجب ہو گا کہ ایک مثل فرمانروائی زبان سے بھی اس قدر فیاضی اور انسانی ہمدردی کے خیالات ادا ہوئے۔“

”۱۶۸۵ء میں تھوڈارا احمد کے خلاف ایک بغاوت برپا ہوئی، جس کا سرخیز ازخون خاں تھا، تھوڈارا کو اس نے قتل کیا، اور خود مالک تخت و تاج بن گیا، ازخون کے عہد حکومت میں (۱۶۸۳ء تا ۱۶۹۱ء) جو چند سال تک جاری رہا، جیساٹیوں پر پھر سلطنت کی طرف سے مہربانی ہوئی اور مسلمانوں کو سختیاں اٹھانی پڑیں اور سرکاری عہدوں اور نوکریوں سے وہ بطرف کر دیئے گئے، ۱۶۹۵ء تک تھوڈارا کے جانشین اپنے قدیم مذہب شانان کے پیرو رہے، لیکن ۱۶۹۵ء میں البتہ ان کا ساتواں بادشاہ غازان جو خاندان الیخانیہ کا سب سے زیادہ باوہ اور پُر سطوت بادشاہ ہوا، مسلمان ہو گیا، اور اس نے اسلام کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا۔

مسلمان ہونے سے پہلے سلطان غازان کی تعلیم و تربیت بد مذہب پر ہوئی تھی، اور خراسان میں اس بادشاہ نے بدھوں کے لئے مندر تعمیر کر دیئے تھے، بد مذہب کے عالموں کی صحبت سے وہ بہت خوش ہوتا تھا، اور یہ لوگ جس وقت دولتِ مغلیہ کو عروج ہوا تھا، ایران میں کثرت سے چلے آئے تھے، سلطان غازان کو مختلف مذہبوں کی تحقیق و تفتیش کا بڑا شوق تھا، اور ہر مذہب کے عالموں کو وہ مذہبی مباحثہ کرتا تھا، غازان کا وزیر اور اس کے عہد کا مورخ حکیم رشید الدین تھا، جس کا یہ خیال غالباً صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غازان سچی نیت اور عقیدہ سے مسلمان ہوا، اور اپنے تمام زمانہ بادشاہی میں وہ اسلام کا پابان رہا۔“

۱۵ وصاف ۲۳۳، ۲۳۴ ۱۶ دعوتِ اسلام ۲۵۱، ۲۵۲ ۱۷ وے گبن ج ۳ ۲۶۵، ۲۶۶ ۱۸ دہوس تو م ۱۴۸

۱۹ ایضاً ۳۶۵ ۲۰ دعوتِ اسلام ۲۵۳

مورخ ابن کثیر نے بھی خازان کے اسلام لانے کا ذکر ۶۹۴ھ کے واقعات میں بڑی مسرت کے ساتھ کیا ہے اور ان کے اور دوسرے موصنین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سہرا نیک دل سلمان ترک امیر توزون کے سر ہے جن کی تلقین اور سعی سے تاتاری سلطان نے اسلام قبول کیا، ابن کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:-

”اس سال چنگیز خاں کا پڑپوتا قازان بن ارغون بن ایغابن تولی بن چنگیز خاں تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور امیر توزون رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف یا سلام ہوا اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا، اس روز سونا چاندی اور موٹی لوگوں کے سر پر بچھا کر دیئے گئے، اس نے اپنا نام محمود رکھا، اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی، بہت سے مندر اور گرجے گرا دیئے گئے، اور ان پر جزیہ مقرر کیا بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں اور انصاف کیا گیا، لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں اور بیگل (۹) دیکھے، اور اللہ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا“

”آرنلڈ لکھتا ہے کہ ۱۳۰۲ء میں خازان کا بھائی سلطان بن محمد خدا بندہ کے نام سے تخت ایران پر بیٹھا، اس سلطان کی ماں عیسائی تھی، اوپن میں اس کی تعلیم و تربیت بھی عیسوی طریقہ سے ہوئی تھی، اور نکولس کے نام سے اس نے اصطبارغ پایا تھا، لیکن ماں کے مرنے پر وہ اپنی بیوی کے کہنے سے مسلمان ہو گیا، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ نکولس خاں یعنی سلطان خدا بندہ کے مسلمان ہونے سے منلوں میں بڑا اثر پیدا ہوا، غرض اس زمانہ سے قلمرو ایغانیہ میں اسلام سب مذہبوں پر غالب آ گیا“

اس خاندان کی تیسری شاخ میں جو بلاد متوسطہ پر قابض تھی، اور جس کا بانی چغتائی بن چنگیز خاں تھا، اشاعت اسلام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:-

”بلاد متوسطہ میں جو چغتائی ابن چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حصہ میں آئے تھے، دعوت اسلام کے حالات

لے آرنلڈ اور دوسرے موصنین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۲۵۰ البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۱۳ ص ۳۴

۲۵۳ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۵۴ ۵۵ دعوت اسلام ۲۵۴

کا پتہ کم چلتا ہے، اس سلسلے میں پہلا بادشاہ جس کو نور اسلام کی برکت ملی، وہ براق خاں تھا جو چغتائی خاں کا پرپوتا تھا، اور جس نے تخت نشین ہونے کے دو برس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین (۱۳۶۶ء-۱۳۷۱ء) اپنا نام رکھا، لیکن یہاں شروع زمانہ میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی، چونکہ براق خاں کے مرنے کے بعد جو محل مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا، اور چودھویں صدی عیسوی سے پہلے اس حالت کی اصلاح نہ ہو سکی، البتہ طر مشرین خاں جس نے ۱۳۶۲ء سے ۱۳۶۵ء تک سلطنت کی، جس وقت مسلمان ہوا، تو چغتائی مغلوں نے بالعموم اسلام اختیار کر لیا، اور جب ایک فوج انھوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا تو وہ مضبوط دل سے اس مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور مذہبوں پر غالب آنا جو حریت مقابل تھے، یقینی امر نہ تھا، کیونکہ طر مشرین کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیئے، اور جب تک کا شغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم وضعف سے خود مختار ہو گئی تھی، اسلام کی حمایت کو نہ اٹھا، اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی، سلطان کا شغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خاں (۱۳۶۳ء-۱۳۹۸ء) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کا شغر میں آئے، اور انھوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا، شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گزربوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکلیں کسوا کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے، شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں، اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی مانعت ہے، بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے، یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا، اور

حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علم دے لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے، اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں کہ شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تعلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا، اب ہموں کی طرح نرم ہو گیا، شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں کا اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہو گیا، لیکن اس نے کہا کہ اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا، تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک بنوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا چنتائیہ سلطنت اب حصہ ہو کر چھوٹی چھوٹی علمداریوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور برسوں کے بعد تعلق تیمور اس قابل ہو گا کہ ان سب علمداریوں کو شامل کر کے پھر قلم و چنتائیہ کی مثل ایک سلطنت قائم کرنے، اس عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن کو چلے گئے، اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا وقت قریب آیا، تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تعلق تیمور ایک ن بڑا بادشاہ ہو گا، تم اس وقت اس کے پاس جانا، اور میرا سلام پہنچا کر بے خوف و خطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا، چند سال کے بعد تعلق نے باپ کا تخت حاصل کر لیا تو ایک ن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہنچا کہ باپ کی وصیت کو پوری کرے، لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں نہ بھیج دیا، آخر کار اس نے مجبور ہو کر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصبح تعلق کے خیمہ کے قریب دان کی شمع کی تعلق کی جیب بند خراب ہوئی تو غصہ ہوا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تعلق کو سنایا، تعلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا، اس کے بعد اس نے اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی، اور اس کے زمانہ میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہو گیا، جو چنتائی ابن جینگیز خاں کی اولاد کے تسلط میں رہتے تھے۔

بعض ترکی مورخین کی تاریخوں میں یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ تعلق تیمور نے اپنے شکار کرتے

کی طرف اشارہ کر کے کمال حقارت سے شیخ جمال الدین سے پوچھا کہ یہ بہتر ہے کہ تم بہتر ہو؟ شیخ نے بڑے

اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ کتنا غفلت تیمور کے دل میں یہ بات چھب گئی اور اس نے اس کی تفصیل دریافت کی اور پوچھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی اس پر غفلت تیمور نے اس سے خواہش کی کہ اس کی تخت نشینی کے بعد وہ اس کو

اپنی زیارت سے مشرف کریں اور پھر وہ واقعہ پیش آیا، جو اور پر مذکور ہوا، بہر حال اتنا محقق ہے کہ غفلت تیمور کے اسلام لانے اور بالواسطہ کا شغور اور سلطنت چغتائیہ میں اسلام کی اشاعت کا ظاہری سبب شیخ جمال الدین ہیں جن کے دل سے نکلے ہوئے ایک فقرہ نے اور ان کی قوت ایمانی اور اخلاص و دردنے وہ کام

کیا، جو ہزاروں تقریریں اور لاکھوں شمشیریں نہیں کر سکتیں جَزَاءُ اللّٰهِ عَنِ الْاِسْلَامِ وَنَبِيِّهِ خَيْرُ الْجَزَاءِ

چنگیز خاں کی چوتھی شاخ کے متعلق (جس کا بانی اوگتائی خاں تھا، اور جس میں منگو خاں و قوبلائی خاں

جیسے نامور فرمانروا گذرے ہیں اور جو تاریخی سلطنتِ عظمیٰ کے مشرقی حصہ پر قابض تھی) آرلڈ لکھتا ہے۔

تمام سلطنت مغلیہ میں ہر جگہ ایسے مسلمان موجود تھے جو منکرین کو خفیہ طور پر مسلمان کر لیتے تھے، اوگتائی خاں

(۱۲۲۹ء - ۱۲۹۱ء) کے عہد میں حاکم ایران کرگز نامی کا حال لکھا ہے کہ وہ اول بدھ مذہب کا پیرو تھا، پھر

اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، تیمور خاں کے زمانہ میں (۱۳۲۹ء - ۱۳۷۱ء) خانِ اندلانے جو قوبلائی خاں

کا پوتا تھا، اور چین میں صوبہ کانسوہ کا حاکم تھا، اسلام قبول کیا، اور تانگو تین اس نے بہت لوگوں کو مسلمان

کیا، بلکہ جو فوج اس کے تحت میں تھی اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہو گئے، تیمور خاں نے اندلانے کو اپنے

دربار میں بلایا اور کوشش کی کہ اندلانے کو اسلام چھوڑ کر بدھ مذہب قبول کرے لیکن اس نے انکار کیا

اور قید میں بھیج دیا گیا، تھوڑے عرصہ کے بعد اندلانے قید سے رہا کر دیا گیا، کیونکہ تانگو تین کی رعایا

جس کو اپنے حاکم کے ساتھ بہت الفت تھی، بغاوت پر آمادہ ہو چلی تھی۔

غرض اس طرح پوری تاتاری قوم جس نے پورے عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا تھا، اور جس کے سامنے کوئی اسلامی طاقت ٹھہر نہیں سکتی تھی، چند برس کے عرصہ میں اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی، اور اسلام نے دوبارہ اس کا ثبوت دیا کہ اس کو اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دام محبت میں اسیر کرنے کی عجیب و غریب قدرت حاصل ہے، تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے، بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، بڑے بڑے عالم اور فقیہ اور بڑے بڑے باخدا درویش پیدا ہوئے، اور انھوں نے بہت سے نازک موقعوں پر اسلام کی پاسبانی کا فرض بھی انجام دیا۔

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے
پاساں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے



مولانا جلال الدین رومیؒ

علم کلام و عقلیت کا بحران

ساتویں صدی میں سارا عالم اسلام علم کلام کے مسائل و مباحث سے گونج رہا تھا، جو شخص علم کلام کی اصطلاحات اور معتزلہ و اشاعہ پھر اشاعہ و حنابلہ کے مختلف فیہ مسائل سے واقف نہیں ہوتا تھا، وہ پڑھا لکھا انسان نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی صدی کی ابتدا میں (ستھ میں) امام رازی نے انتقال کیا تھا، جنہوں نے علم کلام کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا تھا کہ اس کی صدائے بازگشت کے علاوہ کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تھی، عالم اسلام کے علمی و فکری حلقے استدلال و قیاس کے خوگر تھے، ہستی کا وجود، کسی چیز کی حقیقت، دین کا کوئی عقیدہ اس وقت تک قابل تسلیم نہیں سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ اس کو عقلی دلائل، منطقی ترتیب اور فلسفیانہ مقدمات سے ثابت نہ کر دیا جاتا۔

متکلمین اشاعہ نے عام زندگی میں اگرچہ معتزلہ اور فلاسفہ پر فتح حاصل کر لی تھی، اور ان کے علم کلام کے مقابلہ میں اعتزال و فلسفہ کی آواز پست ہو چکی تھی، لیکن اعتزال کی روح اور عقلیت خود اپنے فاتحین کو مفتوح بنا چکی تھی، اشاعہ کے علم کلام میں معتزلہ کی عقلیت پرستی کی روح سرایت کر گئی تھی، انہوں نے بھی عقل کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ وہ ذات و صفات کے نازک اور مارے عقل

(نہ کہ محال عقل) مسائل و تفصیلات میں آزادانہ بحث کر سکے، انہوں نے بھی ظواہر و محسوسات کو بڑی حد تک

فیصلہ کن سمجھ لیا تھا، انھوں نے بھی دینی مسائل کے اثبات اور حقائق اشیاء کے وجود کی بنیاد استدلال و قیاس پر رکھی تھی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ تمام عالم اسلام پر ایک لفظی و استدلالی ذوق غالب تھا، علم کلام نقل و نقل ہو کر رہ گیا تھا، جس میں عرصہ سے کوئی جدت پیدا نہیں کی جاسکتی تھی، اس کے حلقہ میں مدتہائے دراز سے امام ابو الحسن اشعری یا حجت الاسلام غزالی صاحب تہذیب و تدبیر و طبائع پیدا نہیں ہوئے تھے، قیاس و استدلال کے غلو نے دماغوں کو خواہ کتنی جولانی بخشی ہو، دلوں کی حرارت اور یقین کی روشنی کو نقصان پہنچایا تھا، تکلیفیں اپنی قوت استدلال اور مقدمات و نتائج کی آراستگی سے مضمین کی زبانوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ قلوب کو سکینت و ایمان و اہل شک و ارتباب کو یقین و اذعان عطا کرنے میں ناکام رہے تھے، ان کے اس طریق بحث و استدلال نے دماغوں اور دلوں میں بیسیوں گرمیوں ڈال دی تھیں، جن کو علم کلام سلجھانے سے قاصر تھا، وہ جہاں ”جو علم و یقین کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے، علم کلام کی مسلسل بے اعتنائیوں بلکہ تحقیر کی وجہ سے بالکل معطل ہوتا جا رہا تھا، ظاہری حواس خمسہ کے علاوہ کسی اور باطنی حاسہ کا وجود تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا، اس لئے بہت سے وہ مسائل و حقائق جو حاسہ باطنی کے بغیر محسوس و معلوم نہیں کئے جاسکتے تھے، محل اعتراض بنے ہوئے تھے، اوزان کے انکار و نفی کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا تھا، غرض سارا عالم ایک کلامی بحران میں مبتلا تھا، اور سب پر ایک ”عقلی ظاہریت“ چھائی ہوئی تھی، امت کی قوت عمل او اس سے بڑھ کر حرارت عشق“ جو اس امت کا سرمایہ اس کی طاقت کا سرچشمہ اور نبوت کا فیضان ہے، سرد ہوتی جا رہی تھی، دل سوز سے خالی، اور ”حرارت عشق“ سے عاری ہوتے جا رہے تھے، فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو ایک مدرسہ میں تبدیل کر دیا تھا، جس میں قیل و قال تو بہت تھی، مگر زندگی، اور محبت، معرفت، اور نگاہِ نایاب تھی، اہل قلوب کے روحانی جزیروں میں البتہ عشق کا سرور اور یقین کا نور پایا جاتا تھا، ورنہ عالم کا عالم الفاظ کے طلسم کا گرفتار اور ظواہر و محسوسات کا پرستار تھا۔

صاحبِ دل متکلم کی ضرورت

ایسی حالت میں عالمِ اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقت ور شخصیت کی ضرورت تھی، جو دلِ درندہ اور فکرِ ارجند دونوں سے فیضیاب ہو، جس کے لئے عقلیات کا سمندر پیایاب ہو چکا ہو، اور الفاظ و ظواہر کا طلسم ٹوٹ چکا ہو، جو اپنی گرمی عشق اور سوزِ دروں سے اس یخ بستہ عالمِ اسلام میں زندگی کی نئی حرارت پیدا کر دے اور عقل کے اس بنگار خانہ میں عشق کا صورت پھونک دے، جو ایک ایسے نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھے جو دماغوں سے زور آزمائی اور مخالغین کی زبان بند کی کے بجائے دماغ کی شکن دور کر دے، اور دل کی گرافہ کھولے، اور ان کو سکینت و ایمان اور یقین و اطمینان سے بھر دے، یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ (م ۷۴۰ھ) کی تھی، جن کی ثنوی علمِ کلام کی بے اعتدالیوں اور عقل کی ہوس پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلانِ جنگ ہے، اور ایک ایسے نئے علمِ کلام کی بنیاد جس کی بدلتے ہوئے عالمِ اسلام کو سخت ضرورت تھی۔

مختصر حالات

مولف ”مرآۃ الثنوی“ نے اپنی (غیر مطبوعہ) تصنیف ”صاحبِ الثنوی“ میں مولانا کے حالات نہایت تفصیل و تحقیق سے لکھے ہیں، یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ قاضی تلمذ حسین گورکھپوری مرحوم اس دورِ آخر میں ثنوی اور صاحبِ ثنوی کے بہت بڑے شیدائے اور محقق عالم تھے، ان کی کتاب ”مرآۃ الثنوی“ سے متعلق لڑ پچس میں اپنا جواب نہیں رکھتی، ”مرآۃ الثنوی“ کے علاوہ (جو طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہے) ان کی دو اور مختصراً تصانیف ہیں، جو ابھی تک طبع نہیں ہوئیں۔ (۱) صاحبِ الثنوی (۲) نقدِ الثنوی۔ ان دو کتابوں کی اشاعت ”ادبیاتِ رومی“ میں ایک گراں قدر اضافہ اور ایک بڑی خدمت ہوگی، صاحبِ الثنوی دارِ المصنفین میں زیرِ طبع ہے، راقمِ سطور کو ان کے صاحبزادہ نوکل حسین کی عنایت سے اس پیش بہا کتاب سے استفادہ و اقتباس کا موقع ملا، جزاء الشکر۔

خاندان اور والدین

محمد نام، لقب جلال الدین، شہرت مولانا روم یا مولانا رومی کے لقب سے ہے، آپ کا نسب باپ کی جانب سے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مل جاتا ہے، اور ماں کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے۔
مولانا کے آباؤں کے کرام بلخ واقع خراسان کے رہنے والے تھے، مولانا کی وہیں پیدائش ہوئی مولانا کے پدری و مادرى سلسلہ میں اجلہ علماء اور سلاطین وقت ہیں، مولانا کی دادی ملکہ جہان شاہان خوارزم کے خاندان سے تھیں۔

مولانا کے والد کا نام محمد اور لقب بہار الدین ولد تھا، ان کی ولادت غالباً ۵۴۳ھ میں ہوئی حضرت بہار الدین ولد نو عمر ہی میں تمام علوم میں کامل و ماہر ہو گئے تھے، آپ کے علم و فضل کی کیفیت یہ بھی کہ اقصائے خراسان میں مشکل فتاویٰ آپ ہی کے پاس آتے تھے، مجلس کا طریق بادشاہوں کا ساتھ اس سلطان العلماء خطاب بھی تھا معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا، ظہر کے بعد اپنے خاص اصحاب کے حلقہ میں حقائق و معارف بیان فرماتے، دو شنبہ اور جمعہ کو عام وعظ کہتے، ہیبت نمایاں رہتی، اور ہمیشہ متفکر معلوم ہوتے۔

مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

آپ کے صاحبزادہ مولانا جلال الدین رومی ۶ ربیع الاول ۵۵۶ھ کو پیدا ہوئے، سلطان العلماء کے مریدان خاص میں ایک بلند پایہ بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی تھے، سلطان العلماء نے آپ ہی کو مولانا کا اتالیق مقرر فرمایا، اور ۴۵ سال کی عمر تک مولانا آپ ہی کے زیر تربیت رہے، اور اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد آپ ہی کے زیر ہدایت منازل سلوک طے کئے۔

والد کی بلخ سے ہجرت

مولانا کے والد ماجد کا اثر جب زیادہ بڑھا، اور آپ کی دعوت و نصیحت کو حد سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا، اور مریدوں کی تعداد بے شمار ہو گئی تو بعض علماء عصر کو رشک ہونے لگا، حضرت سلطان العلماء اپنے وعظ میں مذہب حکمائے یونان کی مذمت فرمایا کرتے کہ کچھ لوگوں نے کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے، اور فلسفیوں کے ارکار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنا لیا ہے، یہ لوگ کیوں کر نجات کی امید کر سکتے ہیں اس پر بلا مذمت سے علماء ظاہر کے دلوں میں آپ کی طرف سے کدورت بٹھ گئی، مگر چونکہ خوارزم شاہ آپ کا نہایت معتقد تھا، ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا، اتفاق کہ ایک روز سلطان آپ کی زیارت کو آیا تو دیکھا کہ مجمع نہایت کثیر ہے، ایک عالم سے جو رکاب شاہی میں تھے، مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا کثیر مجمع ہے، فاضل مذکور کو موقع ملا، اور کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہوا اور تدارک مشکل ہو جائے، یہ بات خوارزم شاہ کے دل میں بٹھ گئی، اس نے پوچھا کہ کیا تدبیر کرنا چاہیے، فاضل مذکور نے

لے عام طور پر تذکرہ میں ہے کہ یہ مکالمہ امام فخر الدین رازی سے ہوا، جو سلطان کے ساتھ تھے، مصنف صاحب المثنوی کی تحقیق ہے کہ یہ ایک تاریخی غلطی ہے، جو منقول چلی آرہی ہے، اس لئے کہ حضرت بہاء الدین ولد نے بلخ کو ۶۹۰ھ یا ۶۹۱ھ میں ترک کیا ہے، امام رازی نے ۶۶۰ھ میں اپنے وطن ہرات میں انتقال کیا، جہاں انھوں نے اپنے انتقال سے کئی سال پیشتر سے مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ مولانا روم کے فاضل سوانح نگار بدیع الزماں فروز انفرج کی تحقیق کتاب زندگانی و مولانا جلال الدین محمد ابھی ایران سے شائع ہو کر آئی ہے، اسی بھی یہ تحقیق ہے کہ یہ روایت تاریخی حقیقت سے ناقابل اعتبار ہے، اور ان کی بنیاد بھی یہی ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت بقول اکثر ۶۶۰ھ کا واقعہ ہے، اور امام فخر الدین رازی ۶۶۰ھ میں ہرات میں انتقال کر چکے تھے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۳۵۔

قاضی تلمذ حسین مرحوم فرماتے ہیں، ممکن ہے یہ عالم سید بہاء الدین رازی ہوں، جو خوارزم شاہ کے مقربین میں تھے، اور

یہ صلاح دی کہ خزانہ اور قلعوں کی کنجیاں مولانا کے پاس بھیج کر یہ کہلانا چاہئے کہ جمعیت و کثرت تو سب کچھ جناب کو حاصل ہے ہی میرے پاس امور سلطنت میں سے صرف کنجیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی حاضر ہیں۔ اس پیغام کو سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ سلطان اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فکا کا یہ تمام خزانہ و دھنیں ملک و لشکر بادشاہوں کے لائق ہے، ہم درویشوں کو اس سے کیا سروکار؟ میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں کہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ یہاں با استقلال سلطنت کرے، جمعو کو وعظ کہہ کر چلا جاؤں گا۔ ابانی بلخ کو جب یہ حال معلوم ہوا، شہر میں ایک تہلکہ عظیم برپا ہو گیا، خوارزم شاہ سخت متوہم ہوا، قاصد بھیجے، اور رات کو خود مع وزیر کے آیا کہ ارادہ سفر سے باز رہئے، مگر آپ نے قبول نہ کیا، آخر یہ استدعا کی کہ آپ اس طرح روانہ ہوں کہ لوگوں کو خبر نہ ہو، ورنہ سخت فتنہ برپا ہو جائے گا مولانا نے اس کو منظور فرمایا، جمعو کو وعظ کیا، اور شنبہ کو بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہو گئے، اس وعظ میں خوارزم شاہ کو متنبہ کر دیا کہ میرے بعد لشکر تاتار آ رہا ہے۔

سلطان العلماء بلخ سے اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ جس شہر کے قریب پہنچتے تھے، وہاں کے عمائد و علماء شہر سے باہر نکل کر استقبال کرتے اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر میں لاتے تھے۔ بغداد کو مکرمہ، دمشق اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے آپ ملاطیہ پہنچے، آقشہر میں آپ نے چار سال قیام فرمایا، اور درس و تدریس میں مشغول رہے آقشہر سے لارندہ تشریف لائے، جو توابع قونیہ سے تھا۔

مولانا قونیہ میں

علاء الدین کی قیادت سلطان روم کی خواہش و درخواست پر آپ ۶۶۶ھ میں قونیہ تشریف لے گئے،

لے بدیع الزماں فردوزی کا ترجمان یہ ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت کا اصل سبب تاتاریوں کا عزم خراسان ایران تھا، اس اطلاع سے بڑے بڑے

خاندان شرفاء و علماء ترک وطن کر رہے تھے اور محفوظ مقامات کی طرف رخت سفر باندھ رہے تھے، ملاحظہ ہو۔ ۵۱ (ہندوی)

سلطان نے خود استقبال کیا، محل کے قریب گھوڑے سے اتر پڑا، اور بڑی فروتنی کا اظہار کیا، آپ نے مدرسہ قونیہ میں قیام فرمایا، سلطان مع اکثر امراء کے مرید ہو گیا۔

حضرت بہاء الدین ولد نے قونیہ میں دو برس قیام کے بعد ۶۲۸ھ میں انتقال فرمایا۔

اس تمام مدت میں مولانا ہمیشہ اپنے والد کے ہمراہ رہے اور علوم ظاہری و باطنی آپ سے حاصل کرتے رہے، ۲۲ برس کے سن میں آپ شہر (قونیہ) میں وارد ہوئے، جو آئندہ آپ کا مسکن و دفن بننے والا تھا۔

قونیہ میں سلطان کے اتالیق امیر بدر الدین گہر تاش نے آپ کے بحر علی اور خداداد ذہانت سے متاثر ہو کر آپ کے لئے مدرسہ خداداد کا تعمیر کیا، اور اس کے لئے بہت بڑا وقف کیا۔

سلطان علاء الدین کی قیاد آپ کی بڑی تعظیم کرتا تھا، اور آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، سلطان نے جب قونیہ کا قلعہ تیار کیا تو ایک روز آپ سے سیر کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ دفع سیل و منغ خیل کے لئے اچھا ہے، مگر مظلوموں کی تیر دعا کا کیا علاج آپ نے سوچا ہے، جو ہزاروں لاکھوں بروجوں سے گذر جاتی، اور عالم کو خراب کر دیتی ہے، عدل و انصاف کا قلعہ بنائیے کہ اس میں دنیا کا امن اور عافیت کی خیر ہے۔ سلطان پر اس نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔

مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد سلطان وقت اور علماء و اکابر کے اتفاق رائے سے آپ مولانا کے جانشین ہوئے اور آپ نے سلسلہ درس و تدریس اور تلقین و ارشاد کو بدستور جاری رکھا، امید برہان الدین محقق ترمذی جو آپ کے اتالیق رہ چکے تھے، اور ترمذ کو چلے گئے تھے، مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد قونیہ تشریف لائے، مولانا آپ کے مرید ہو گئے، اور اپنے والد ماجد کے بعد مراتب سلوک آپ ہی سے طے کئے، ۹ برس مولانا کی آپ سے صحبت رہی، ۶۳۴ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔

آپ کے تعلیمی سفر اور مشاغل

۶۳۳ھ میں مولانا نے مزید تکمیل علوم و اكتساب فیض کے لئے شام کا سفر کیا، اور صلب میں وارد ہوئے۔

سلطان صلاح الدین کے فرزند الملک مظاہر نے قاضی بہاء الدین ابن خنداد کی تحریک سے جو اہل علم و ادب میں سے تھے، ۵۹۱ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کئے تھے جس کی وجہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوم بن گیا تھا۔

حلب میں مولانا مدرسہ صلاحیہ میں قیام پذیر ہوئے اور کمال الدین ابن العویم سے استفادہ کیا مولانا یہاں اگرچہ تحصیل علم میں مشغول تھے، مگر آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ بقول سپہ سالار جو مشکل مسائل کسی سے حل نہ ہوتے تھے، وہ آپ ہی حل کرتے تھے اور ایسے وجوہ بیان کرتے تھے، جو کسی کتاب میں درج نہ ہوتے۔

حلب سے مولانا دمشق تشریف لے گئے، یہاں آپ نے مدرسہ قدسیہ میں قیام فرمایا، دمشق اس وقت مجمع علماء تھا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ دمشق میں شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی، شیخ ابو صدر الدین کرمانی، شیخ صدر الدین قنوی سے مولانا کی صحبت رہا کرتی، اور باہم دگر خفائق و معارف بیان ہوتے تھے۔

۶۳۴ھ یا ۶۳۵ھ میں آپ نے دمشق سے واپس آ کر قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا، سید برہان الدین کے انتقال (۶۳۷ھ) کے بعد ۵ سال تک آپ علماء ظاہر کے لباس میں رہے، اور علمی و تدریسی مشاغل میں ہمت نہ ہنکے، ۶۳۸ھ میں شیخ محی الدین ابن عربی نے انتقال کیا، جو بزم علم آپ کے گرد جمع تھے اس کے اکثر افراد قونیہ میں آ گئے، جن میں شیخ صدر الدین بھی تھے، مشرق کی طرف سے جو علماء و فضلاء وہاں کی تباہیوں سے پریشان ہو کر دردم کارخ کرتے تھے، وہ بھی اکثر قونیہ کو اپنا ملجا و ماویٰ بناتے، اس طرح قونیہ اس زمانہ میں مدینۃ العلماء بن گیا، اور ان علماء میں مولانا کی حیثیت سب سے بلند تھی، اس زمانہ میں مولانا کے وہی اشتغال تھے، جو علماء ظاہر کے ہوتے ہیں، یعنی درس و تدریس، وعظ و تذکیر اور فتاویٰ نویسی، مولانا بہت زیادہ وقت مشغول تدریس میں صرف کرتے، خود آپ کے مدرسہ میں چار سو سے زیادہ طلبہ تھے۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا کا دوسرا مشغول یا فرض وعظ کہنا تھا، فتویٰ نویسی کا مشغول بھی مستقل

تھا، بیت المال سے مولانا کے لئے ایک دینار مقرر تھا، اسے اسی فتویٰ نویسی کا معاوضہ تصور فرماتے تھے اور اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ جب فقر کا رنگ غالب ہوا، اور مجلس میں مستغرق رہنے لگے، اس وقت بھی حکم تھا کہ جس وقت کوئی فتویٰ آئے فوراً خبر کی جائے، قلم و دوات ہمہ وقت ساتھ رہتا تھا۔

انقلاب حال

یہ حالت ۱۸۶۲ء تک قائم رہی، اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا، اور مولوی جلال الدین قزوینی کو مشہور روزگار مولائے روم بنا دیا، یہ واقعہ مولانا کی شمس تبریز سے ملاقات اور ان کی ذات سے شیفنگی و فنایت تھی۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریزی نہ شد

شمس تبریز

(محمد بن علی بن ملک داد) شمس تبریز کا نسب اور وطن کیا تھا؟ آپ کے مخالفین نے جہاں اور الزامات آپ پر لگائے تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ کا نسب نامعلوم ہے۔

نے درو اصل و نسب پیدا است می نہ دانیم ہم کہ اوز کجا است

آپ بچپن سے اعلیٰ استعداد اور جذبہ عشق و محبت کے حامل تھے، مناقب العارفین میں خود آپ ہی کی زبانی منقول ہے کہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں

لے بعض تاریخوں میں ہے کہ آپ حسن بن صباح اسماعیلی کے جانشین و رفیق و طریق کیا بزرگ امید کا نسل سے تھے، ان کے والد

جلال الدین جن جب منصب امامت پر فائز ہوئے تو انھوں نے اپنے بزرگوں کا طریقہ ترک کر کے صحیح اسلامی عقائد اختیار کئے، اور نو مسلم

کے لقب سے مشہور ہوئے لیکن یہ روایات مشتبہ اور قابل بحث ہیں، ملاحظہ ہو زندگانی مولانا جلال الدین محمد ص ۵۲۵ (ہدوی)

تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی، علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابو بکر سلہ بان کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیخ زین الدین نجاشی کے مرید تھے، بعض روایتوں میں دوسرے نام لئے گئے ہیں، ممکن ہے آپ نے سب سے اکتساب فیض کیا ہو۔

جب آپ کو اس طرح سیری نہ ہوئی تو آپ اطراف عالم میں مردان خدا کی تلاش میں پھرنے لگے، یہ سفر اس طرح کرتے تھے کہ خود آپ کی ولایت و کمال سے لوگ آگاہ نہیں ہوتے تھے، ندریاہ پہنتے، اور جہاں جاتے سرانے میں قیام کرتے، دروازہ میں قیمتی قفل لگا دیتے کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے، مگر اندر سوائے بوریہ کے کچھ نہ ہوتا، اکثر اسفار کی وجہ سے لوگ آپ کو شمس پرندہ کہنے لگے تھے، تبریز، بغداد، اردن، الروم، قیصریہ و دمشق کا سفر فرمایا، معاش کا یہ طریقہ تھا کہ ازار بند بن لیا کرتے، اور اسی کو بیچ کر کام چلاتے تھے، غذا کی کیفیت یہ تھی کہ دمشق میں ایک برس رہے، ہفتہ میں ایک پیالہ سری کا شوربا اور وہ بھی بے روغن پی لیا کرتے، کسی کو اپنی صحبت کا تحمل نہیں پاتے تھے، اکثر یہ دعا فرماتے کہ خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا تحمل ہو۔

مولانا کی ملاقات اور تغیر عظیم

آپ کے شیخ نے آپ سے فرمایا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے، اسے روشن کر آؤ، دو شنبہ ۲۶ جمادی الاخریٰ ۶۴۲ھ کو قونیہ پہنچے، اور شکر فروشوں کے محلہ میں قیام فرمایا، ایک روز دیکھا کہ مولانا سوا چلے آ رہے ہیں، اور لوگ گرد و پیش استفادہ کر رہے ہیں، شمس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضات و علوم کی غرض کیا ہے؟ مولانا نے کہا آداب و شریعت کا جاننا، شمس نے کہا نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسائی ہو جائے اور حکیم سنانی کا یہ شعر پڑھا۔

لے بدیع الزماں فروزا نفر نے بجائے زین الدین نجاشی کے کن الدین نجاشی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ نجاس، زنجان کے توالج میں سے ہے، صلاہ، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کو اس روایت کی صحت میں کلام ہے، (ندوی)

علم کر تو ترانہ بستاند جہل ازاں علم بہ بود بسیار
مولانا اس سے متغیر و متحیر ہوئے، اور تیر نشانہ پر بیٹھا۔

مولانا حضرت شمس کو ہمراہ لے کر اپنے مقام پر آئے، اور بقول افلاکی چالیس روز تک حضرت شمس کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے جس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا، اسے سالانہ لکھا ہے کہ چھ ماہ تک صلاح الدین زکوب کے حجرہ میں دونوں بزرگ عزت نشین رہے، سوائے شیخ صلاح الدین کے کسی کی مجال نہ تھی کہ حجرہ میں داخل ہو سکے۔

شمس کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقائق و اذواق کی نئی دنیا عطا کی وہ خود فرماتے ہیں:۔
شمس تبریزی بارہ حقیقت بنمود ماز فیض قدم اوست کہ ایماں دایم

ابھی تک مولانا استاد دوراں تھے، اور خود صاحب سجادہ تھے، اور علماء و طلبہ و صوفیہ مستفید طالب اب مولانا مستفید طالب تھے، اور شمس تبریز صاحب فیض و ارشاد، مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد فرماتے ہیں:۔

شیخ استاذ گشت نو آموز درس خواندی بخدش ہر روز
گرچہ در علم فقہ کامل بود علم نو بود کو بوسے بہ نمود
خود مولانا اپنی زبان سے فرماتے ہیں:۔

زاہد بودم تر نہ گویم کردی سرفتنہ بزم و بادہ جویم کردی
سجادہ نشین باوقار سے بودم بازیچہ کو دکان کویم کردی

نتیجہ یہ ہوا کہ شمس کی ملاقات کے بعد مولانا نے درس و تدریس، و وعظ گوئی وغیرہ سب یک قلم

لے صاحب المثنوی کی مختلف روایات میں سے اس روایت کو انتخاب کیا گیا ہے، یہ روایت تذکرہ دولت شاہ کی ہے، ص ۱۹۶، ۱۹۷

فروز افر نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو نقل کر کے ان سے بے اطمینانی کا اظہار کیا، اور شمس سے مولانا کے تاثر و فتنگی کا سبب کسی

امکان نہ اتھ اور تصریح و قرار نہیں دیا بلکہ مردان خدا کی تلاش عشق و اہل عشق سے مولانا کی مناسبت فطری کو قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو زندگانی جلال الدین محمد غزالی (ہندی)

تڑک کر دی، خود فرماتے ہیں :-

عطار دوار دفر پارہ بودم زدشت اوزمانے می شستم
چو دیدم نوح پیشانی ساقی شدم مست و قلم ہارا شکستم

شورش عام

مولانا جب اس طرح ہربات میں حضرت شمس کی پیروی کرنے لگے، اور تمام تعلقات منقطع ہونے لگے، تو یہ امر مولانا کے شاگردوں اور مریدوں پر سخت شاق گذرا، ایک شورش کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، ایک برہمی کے ساتھ گونہ حیرت بھی شامل تھی، شمس کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے، مریدوں کا خیال تھا کہ ہم نے عمریں مولانا کی خدمت میں گذاریں، مولانا کی کرامتوں کو دیکھا، تمام اطراف و اکناف میں آپ کی شہرت کا باعث ہوئے، اب ایک بے نام و نسب شخص آیا، اور مولانا کو سب سے الگ کر لیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس و تدریس و غظ سب بند ہو گئے، ضروری کوئی ساحت یا مکار شخص ہے، ورنہ اس کی کیا ہستی ہے کہ ایسے پہاڑ کو تنکے کی طرح بہا لے جائے۔

غرض سب کے سب شمس کے دشمن ہو گئے، مولانا کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، اِدھر اُدھر ٹل جاتے تو برا بھلا کہتے، اور رات دن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے کہ کسی طرح حضرت شمس کو وہاں سے نکالیں کہ پھر حسب سابق مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہو سکیں۔

شمس کی غیبت

حضرت شمس الدین ان لوگوں کی گستاخیوں کا تحمل کرتے رہے، اور سمجھتے رہے کہ مولانا کی وفور عقیدت

کی وجہ سے یہ لوگ اس طرح آزرده ہیں، مگر جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب انجام اس کا

فتنہ و فساد پر ہوگا، تو آپ ایک نیا خاموشی کے ساتھ قونیہ سے نکل گئے، افلاکی نے اس غیبت اول کی تاریخ روز پنجشنبہ یکم شوال ۶۵۳ھ دی ہے اس طرح بار اول قونیہ میں آپ کا قیام سوا برس رہا۔

شمس کی جدائی مولانا پر سخت شاق گذری، مریدوں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے برعکس واقع ہوا اس کے بجائے کہ شمس کے چلے جانے کے بعد مولانا ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، جو کچھ توجہ تھی، وہ بھی جاتی رہی، اور ان ناقصوں کی وجہ سے اصحاب صدق و وفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہو گئے۔

مولانا کی بقراری اور شمس کی واپسی

بقول سپہ سالار انقطاع کلی کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی کہ دمشق سے شمس الدین کا خطاچانک مولانا کے نام آیا، اس خط کے پانے کے بعد مولانا کی کچھ حالت بدلی، اور شمس کے شوق و عشق میں سماع کی جانب متوجہ ہوئے، اور جن لوگوں نے حضرت شمس کے خلاف حرکات میں شرکت نہیں کی تھی، ان پر حسب سابق عنایت فرمانے لگے، اس عرصہ میں مولانا نے حضرت شمس کی خدمت میں چار منظوم خطوط لکھے جن میں اپنی کیفیت اور اشتیاق ملاقات کی بیباکی کا ذکر کیا ہے، پہلے نامہ شوق میں فرماتے ہیں ۷

ایہا النور فی الفواد تعال غایۃ الوجد والمراد تعال

ایہا السابق الذی سبقت منک مصدوقۃ الوداد تعال

چوں بیائی زہے کشاد و مراد چوں نیائی زہے کساد تعال

انت کا شمس اذمنت و نأت یا قریباً علی البعاد تعال

اس اثنا میں شورش بہت کچھ فرو ہو گئی، اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب لوگوں نے شمس کی مخالفت

ترک کر دی ہے، مولانا نے شمس کو واپس بلانے کی تدبیر کی، صاحبزادہ سلطان ولد سے فرمایا کہ تم میری طرف سے

اس شاہ مقبول کی طرف جاؤ، اور یہ لے جا کر ان کے قدموں پر نثار کرو، اور میری جانب سے کہو کہ جن

مریدوں نے گستاخی کی تھی، وہ سب صدق دل سے توہ کرتے، اور التجا کرتے ہیں کہ جو خطا ہوئی درگزر فرمائیں، اور اس جانب قدم رنجہ فرمائیں، ان کے ہاتھ جو نیاز نامہ بھیجا اس پر اس مفارقت سے اپنی حالت بیان کئے ہیں۔

کہ ازاں دم کہ تو سفر کر دی	از حلاوت جدا شدیم چوموم
ہمہ شب چو شمع ے سوزیم	ز آتش جفت وز انگیں محروم
در فراق جمال تو مارا	جسم ویران و جان ازویوں بوم
ہاں غناں را بدیں طرف برتاب	زفت کن پیل عیش را خرطوم
بے حضورت سماع نیست حلال	ہیچو شیطان طرب شدہ مہروم
یک غزل بے تو ہیچ گفتہ نشد	تار سید آں مشرف مفہوم
پس بدوق سماع نامہ تو	غزل پنج و شش بشد منظوم
شام از تو چو صبح روشن باد	اے بتو فخر شام وارمن و روم

سلطان ولد حضرت شمس کو عزت و احترام شاہانہ کے ساتھ قونیہ لائے۔

شمس کی دوبارہ غیبت

حضرت شمس کے قونیہ پہنچنے پر مولانا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جن لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں، سب نے آ کر معافی مانگی، ایک مدت تک یہ صحبت بے کدورت اسی طرح برقرار رہی اس اثنا میں شمس کے ساتھ مولانا کا اخلاص و اتحاد پہلے سے زیادہ بڑھتا گیا، مگر اس دورِ خرمی کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ پھر آرزوگی کے اسباب پیدا ہو گئے، حضرت شمس کا قیام مولانا کے تاجخانہ کے قریب ہی دالان صفہ میں ایک طرف تھا، شمس وہاں اپنی اہلیہ کے ساتھ جن سے قونیہ میں عقد ہوا تھا، مقیم تھے، مولانا کے

منجھلے صاحبزادہ (چلی علی الدین) جب مولانا کے گھر جاتے تو اسی طرف سے ہو کر گذرتے، مولانا شمس الدین

کو یہ بات ناگوار ہوتی، کئی مرتبہ مشفقانہ طور پر سمجھایا، علاء الدین کو یہ بات شاق گزری، ان کے دل میں کچھ اس بات سے بھی کدورت تھی کہ حضرت شمس الدین سلطان ولد پر زیادہ نظر عنایت رکھتے ہیں اس کا چرچا لوگوں سے بھی کیا، جو لوگ اس قسم کے موقع کے منتظر تھے، انھوں نے اور بھی حاشیے چڑھائے، اور کہنے لگے کہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک بیگانہ نے آکر مولانا کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے، اور فرزند کو گھر میں آنے نہیں دیتا۔

حضرت شمس الدین نے محض لطف و حلم کی وجہ سے مولانا سے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، مگر جب معاملہ حد سے گزر گیا تو سلطان ولد سے برسیل حکایت یہ فرمایا کہ ان لوگوں کے حرکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ میں اس طرح غائب ہوں گا کہ پھر کسی کو پتہ نہ چلے گا، مولانا کی بعض غزلوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا ابھی بالکلیہ اس سے بے خبر نہ تھے، بلکہ ان کو اس کا اندیشہ تھا، اور انھوں نے اشعار میں اس سے باز رہنے کی منت سماجت کی ہے۔

بہر حال لوگوں میں حضرت شمس الدین کے خلاف خیالات پھر جوش زن ہو گئے تھے، اور آپ خود ہی آزدہ خاطر ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دفعۃً غائب ہو گئے۔

ناگہان گم شد از میان ہمہ تار و دزدل اندبان ہمہ

مولانا کی بتیابی

مولانا جب صبح کو مدرسہ تشریف لائے، اور شمس کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے، اور سلطان ولد

لے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ تو نبی میں کچھ لوگوں نے حضرت شمس کو قتل کر دیا، اور مولانا نے فرمایا "يَفْعَلُ اللهُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ"

لیکن فروز النفر نے غیبت کی اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ سلطان ولد سب سے قریب تر اور حالات سے باخبر تھے، ان کی روایت اس باب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے اس لئے شمس کے قتل کی روایت قابل اعتبار نہیں، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر شمس

قتل کر دیئے گئے ہوتے، اور مولانا کو اس واقعہ کا علم ہوتا، تو ان کی تلاش میں یہ سرگردانی نہ ہوتی (زندگانی ص ۸۴-۸۵) (ہندوی)

کے خلوت خانہ پر جا کر آواز دی، ”بہاء الدین چہ خفتہ؟“ برخیز و طلب شیخت کن کہ باز شام جان را از فواج
لطف او خالی می یابیم۔“

دو تین روز ہر طرف جستجو کرتے رہے، مگر کہیں حضرت شمس کا پتہ نہ چلا، اس مرتبہ شمس کی غیبت سے
مولانا کا حال پہلے سے بھی زیادہ متغیر ہو گیا۔

شیخ گشت از فراق او مجنون بے سرو پا ز عشق او چو ذوالنون
ہو لوگ حضرت شمس کی آزدگی کا باعث ہوئے تھے، مولانا نے ان سب کو قطعاً اپنی صحبت سے خارج کر دیا،
لیکن سابق کے برخلاف اس مرتبہ اپنے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا، یہ ۱۲۵۹ھ کا واقعہ ہے۔
حضرت شمس کے غائب ہو جانے کے بعد مولانا نے دو روز ہر طرف آپ کی تلاش کی، مگر جب کسی طرح آپ کا
کچھ پتہ نہ چلا، تو مولانا کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، طریقی سماع تو آپ پہلے ہی اختیار کر چکے تھے اب یہ
حالت ہوئی کہ ایک دم سماع کے بغیر نہیں گزرتا تھا، مدرسہ میں ٹھہلا کرتے تھے، اور آشکار و نہان شور و فریاد
کرتے تھے، تمام شہر میں غلغلہ مچ گیا، اسی زمانہ میں مولانا نے حضرت شمس کے فراق میں بہت کثرت سے اور
نہایت ہی دل دوز غزلیں کہیں، آپ کی درد انگیز فراقیہ غزلیں زیادہ تر اسی زمانہ کی ہیں۔

اس تمام جان گدازی و بے قراری کے باوجود مولانا کے دل سے یہ خیال محو نہ ہو سکا کہ رومیوں کی
خانہ جنگی، مصریوں کی ترک تازی، اور زنا تار یوں کی تاراجی کے باعث سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے، معلوم
نہیں، اس عالم آشوب میں حضرت شمس پر کیا گزری؟!

شمس الدین کے غائب ہو جانے کے بعد آپ کے اشتیاق میں مولانا کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص
جھوٹوں بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولانا لباس تک اتار کر اس کی نذر کر دیتے
شکرانہ دیتے، اور بہت کچھ اظہار شکر کرتے۔

سفر شام اور سکونِ خاطر

اسی ہوش و خروش کے عالم میں مولانا نے سفر کا ارادہ کیا، اور شام کی طرف روانہ ہو گئے، آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے، اسی طرح دمشق پہنچے، اور وہاں بھی لوگوں کے دلوں میں آتشِ عشق بھڑکادی، تمام لوگ حیران تھے کہ ایسا عالم و فاضل شخص کیوں اس طرح دیوانہ ہو رہا ہے، شمس تبریزی کیا چیز ہیں جو کہ ایسا فرد فریدان کے پیچھے یوں مارا مارا پھر رہا ہے، یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب دمشق میں شمس کا کچھ پتہ نہ چلا، اس وقت مولانا نے فرمایا کہ میں اور شمس دونہیں ہیں، وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں، ذرہ کی ہستی آفتاب ہی سے ہے، اور قطرہ کی تری دریا ہی سے ہے، پس فرق کیا ہوا، چند روز بعد آپ نے شام سے روم کی جانب مراجعت فرمائی۔

چند برس قونیہ میں قیام فرمایا، مگر پھر عشق نے جوش کیا، اور کچھ لوگوں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور آخر پھر... قونیہ تشریف فرما ہوئے، اور اس مرتبہ یہ خیال لے کر آئے کہ میں خود عین شمس ہوں، شمس کی جستجو کیا تھی، درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا، اس مرتبہ قونیہ اس خیال کے ساتھ واپس آئے کہ شمس میں جو کچھ تھا، وہ خود مجھ میں موجود ہے۔

اس مرتبہ دمشق سے واپس آنے کے بعد مولانا حضرت شمس کے ملنے سے بالکل مایوس ہو گئے تھے، مگر جس کیفیت کو آپ شمس میں ملاحظہ فرماتے تھے، اسے اب خود اپنے میں ملاحظہ فرمانے لگے، سلطانِ ولد کے الفاظ ہیں کہ اگرچہ مولانا قدس سرہ شمس الدین تبریزی و اعظم اللہ ذکرہ بصورتِ درویشِ نیافت یعنی در خود بیافت زیراں حال کہ شمس الدین را بودِ حضرِ تش را ہماں حاصل شد۔

شیخ صلاح الدین زرکوب

دمشق سے دوسری مرتبہ واپس آنے کے بعد مولانا کچھ دنوں ساکن رہے، اس کے بعد آپ نے شیخ

صلاح الدین کو اپنا ہمزاد و خلیفہ بنایا، ۶۶۴ھ میں آپ نے ان کو اپنا مجلس خاص بنایا، اور حضرت شمس الدین کے بجائے ان کو اپنا معین و دمساز قرار دیا۔

شہ صلاح الدین زبجد شمس دین گشت اور اندرین درزش معین
حال و قالش از وجودش می فروزد سربائے نادر ازوے می شنود

شیخ صلاح الدین قونیہ کے قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، غریب الدین کی اولاد تھے، جو ابھی گریہ کیا کرتے تھے، خود شیخ صلاح الدین نے مذکورہ کا پیشہ اختیار کیا، ابتدائے حال سے امانت و دیانت میں مشہور تھے، سید برہان الدین جب قونیہ آئے تو آپ ان کے مرید ہو گئے، اور ان کی نظروں میں اخلاص خاص پیدا کیا، سید کے انتقال کے بعد مولانا سے تجدید بیعت کی، انتقال سے دس برس قبل مولانا سے آپ کو وہ قرب حاصل ہوا، اس دس سالہ مدت میں آپ مولانا کے خلیفہ خاص رہے، شیخ نے یکم محرم ۶۵۷ھ میں انتقال فرمایا۔

لوگوں میں اس قرب اخلاص سے پھر شورش پیدا ہوئی، اب لوگوں کو شکوہ تھا، کہ ان سے تو شمس تبریزی ہی بہتر تھے، وہ بہر حال صاحب علم تھے، یہ صاحب توہمیں کے رہنے والے ہیں، سب جانتے ہیں کہ ایک عامی آدمی ہیں، عمر بھر ورق کوٹتے رہے، اب مولانا کے رفیق بنے ہیں، حیرت ہے کہ مولانا اس رتبہ اور پایہ کے باوجود ایسے شخص کی تعظیم و تکریم میں یہ مبالغہ کرتے ہیں، شیخ نے سنا تو فرمایا کہ لوگوں کو ملال اس کا ہے کہ مولانا نے مجھے سب میں مخصوص کر لیا، مگر اصل بات کو نہیں سمجھتے کہ مولانا خود اپنے پر عاشق ہیں، میں تو محض ایک حیلہ ہوں۔

لے فروزا نقر لکھتا ہے: "مولانا از دیار شمس نو می گذشت بہامی دل و ہنگی بہمت رفته در صلاح آورد اور شیخ و خلیفہ و سرشکری جنود اللہ منصوب فرمود و یاران را باطاعت سے مامور ساخت" ص ۹۳ (ندوی) ۵ بدیع الزمان فروزا نقر زندگانی، مولانا جلال الدین میں لکھتا ہے: "مولانا بکوری چشم منکران حود ویدہ بر صلاح الدین گماشت وہاں عشق و دل باختگی کہ با شمس داشت با دے نیا و نہا و از انجا کہ صلاح الدین مرفے و رام و نرم و جذب و ارشادش بنوع دیگر بود شورش و انقلاب مولانا آرام نگر ویدہ و از بے قراری بقرار باز آمد و برائے شکستن شمار بجران شمس از پیمانہ وجود و طلب ہائے سبکی نوشتہ" ص ۳۰-۳۱

دش برس کی خدمت و صحبت کے بعد شیخ ناگہاں بیمار ہوئے اور کلم محرم کو نہایت طمانیت قلب کے ساتھ اس دار غرور سے دار سرور کی طرف سفر کیا۔

چلی حسام الدین

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے چلی حسام الدین ابن اخئی ترک کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا چلی حسام الدین مولانا کے ممتاز مریدوں میں سے تھے اور مولانا کے انتقال کے بعد ابریں تک مولانا کی خلافت کے فرائض انجام دیئے، آپ اصلاً ترک اور وطناً ارومی تھے، اور روم کے مشہور اور ذی اثر خاندان اخئی سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی آپ کو ارادت تھی اور ان لوگوں کے فیض سے بھی آپ بیش از بیش متمتع ہوئے تھے۔

حضرت حسام الدین چلی نے اپنے تمام ملازموں اور غلاموں کو حکم دے دیا کہ اپنے طور پر کام کریں، آہستہ آہستہ اپنا کل ملوکہ مولانا کی خدمت میں صرف کر دیا، آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کر دیا، مولانا کا پاس ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ مولانا کے وضو خانہ میں کبھی وضو نہ کرتے، سخت سے سخت سردی ہوتی، برف پڑتی ہوتی، مگر گھر جا کر وضو کر کے آتے، دوسری طرف مولانا بھی آپ سے اس طرح پیش آتے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مرید ہیں۔

لیچلی ترک زبان میں سیدی کا ہم معنی ہے، ۷۷۲ھ فرزند ان کی تاریخ ولادت ۷۷۲ھ لکھی ہے ۷۷۲ھ مولانا کو جو کچھ فتوحات ہوئیں سب چلی کے پاس بھیج دیتے، صاحبزادہ سلطان ولد نے ایک تہذیب کا کتبہ لکھا کہ والٹر باشہر تاشہر کہ اگر صد ہزار کال زاہد را حالت بخصہ واقع شود وہم ہلاکت باشد و مارا گیتانان باشند ان را ہم بھضرت چلی فرستیم مولانا کو ان کے بغیر انبساط و شفیقتگی نہیں ہوتی تھی جس مجلس میں چلی نہ ہوتے مولانا کی طبیعت میں جوش و گرمی نہ پیدا ہوتی اور اسرار و معرفت کی باتیں نہ کرتے جن لوگوں کو یہ حقیقت معلوم تھی وہ مجلس میں سے

زیادہ اس کا اہتمام کرتے کہ حضرت چلی موجود ہوں تاکہ دریاے فیض جاری ہو (ملاحظہ ہو زندگانی ص ۱۰۵)۔ ندوی

ثنوی کی تحریک

ثنوی شریف کی تصنیف اسی زمانہ کا کارنامہ ہے، اس میں حضرت حسام الدین کی تحریک کو بہت بڑا دخل ہے، بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا، "ثنوی شریف کا وجود میں آنا آپ ہی کی وجہ سے ہوا"۔

رفقا کے انتخاب کا سبب

مولانا کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی، شمس الدین کے بعد صلاح الدین اور صلاح الدین کے

لے فروزا نے لکھا ہے کہ ثنوی کی تالیف چلی حسام الدین کی فرمائش و طلب ہوئی، انھوں نے لکھا ہے کہ چلی دیکھتے تھے کہ مولانا کے اجماعی مقبولین شیخ مطاوع سنا کی تصنیفات و کلام کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں، مولانا کی غزلیات کا اگرچہ بڑا ذخیرہ ہے، مگر اس میں خفائی تصوف و دقائق سلوک سے زیادہ مولانا کی گرمی طبع و جوش عشق ہے، وہ موقع کے منظر تھے، ایک رات مولانا کو تنہا دیکھ کر انھوں نے عرض کیا کہ کوئی کتاب حلیہ سنا کی یا منطق الطیر کے طرز پر لکھی جائے مولانا نے سنتے ہی اپنے عمار سے ایک کاغذ نکالا، جس میں ۸ اشعار لکھے ہوئے تھے، پہلا شعر وہ تھا جس کو ثنوی کا آغاز مطلع بنا نصیب ہوا۔

بشنوا نے چوں حکایت می کند وز جدائی ہا شکایت می کند

آخری مصرعہ تھا۔ ع

پس سخن کوتاہ باید و السلام

پس یہ ثنوی کی تالیف کا آغاز تھا، مولانا برجستہ اشعار زبان مبارک سے ادا کرتے اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے، لکھ لینے کے بعد حسام الدین اس کو بلند طور پر خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے، بعض مرتبہ پوری پوری رات اسی شغل میں گزر جاتی، اور ثنوی کی تالیف شام سے صبح تک جاری رہتی، ثنوی کی جلد اول مکمل ہوئی تھی کہ حسام الدین کی اہلیہ نے انتقال کیا، اور حسام الدین کی طبیعت پر سخت اثر پڑا، اور وہ کم ہو گئے، ان کے انفعال سے مولانا کی طبیعت بھی رک گئی، اور دو سال تک ثنوی کا سلسلہ بند رہا، پھر دوبارہ حسام الدین کی تحریک اور تقاضا سے اس کا

سلسلہ شروع ہوا، اور مولانا کی وفات تک لکھی، یہ مدت ۱۵ سال کی تھی (زندگانی مولانا جلال الدین محمد ۱۱۸-۱۱۶)۔ ندوی

بعد حمام الدین آپ کے ہمراز و مسازر ہے، بلکہ سلسلہ خیال کو اور آگے بڑھایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ

سید بہاء الدین ترمذی بھی اسی زمرہ میں داخل تھے، اگرچہ دوسری حیثیت تھے، سید موصوف کے انتقال اور شمس کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولانا نے اس طرح گزارا گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی محسوس کرتے تھے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا کے باطن میں جو کمالات مخفی تھے، ان کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی، ”دیوان و ثنوی“ انہی حضرات کی تحریک باطنی کے ثوابد ظاہری ہیں، صرف حمام الدین کی عدم فرصت کی وجہ سے ثنوی شریعت کی تصنیف دو برس معلق رہی۔

مولانا نے جن اصحاب کو اپنی ہم نشینی کے لئے منتخب کیا، ان کے انتخاب کی وجہ کشف و کرامت نہیں تھی، آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبب جنسیت ہو اگر تھی ہے، خود مولانا نے سلطان لڑکے سوال پر فرمایا کہ میں مناسبت جنسیت کی وجہ سے ان کو خاص طور پر دوست رکھتا ہوں، فرمایا کہ جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے، اس کا نتیجہیشیالی نہیں ہوتا، حقیقی محبت اور مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی ایشیانی نہیں ہوتی، چنانچہ اہل غرض دوستوں کو آخرت میں یہ تمنا ہوگی کہ ”يَا لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فَلَانًا خَلِيلًا“ ”مجان متقی کی صفت یہ ہوگی“ ”الْأَخِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ“ خود فرماتے ہیں:-

موجب ایساں نہ باشد معجزات لیک جنسیت بود جذب صفات

مولانا کی وفات

سپہ سالار کا قول ہے کہ مولانا کے انتقال سے قبل قونیہ میں چالیس روز زلزلہ آتا رہا، افلاکی کا بیان ہے کہ مولانا ہنوز صاحب فراش تھے کہ سات روز برابر زلزلہ رہا، تمام لوگ عاجز آ گئے، مولانا سے طلب امداد کی، فرمایا زمین بھوکی ہو گئی ہے، بقمہ چوب چاہتی ہے، جلد کا میاب ہو جائے گی، اور یہ رحمت تم لوگوں سے

رفع ہو جائے گی اور اس زمانہ میں یہ غزل ارشاد فرمائی :-

یا ایں ہمہ ہر و مہر بانی دل می دہدت کہ خشم رانی

دیں جلا شیشہ ہائے جان را در ہم شکنی بہ کن تَرَانی

چلی حسام الدین کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ صدر الدین اکابر درویشوں کے ساتھ مولانا کی عبادت کو آئے، مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور فرمایا خدا شفاۓ عاجل عطا فرمائے، امید ہے کہ صحت کلی حاصل ہو جائے گی، مولانا نے فرمایا، اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو، عاشق و معشوق میں بال کا پیرا ہن رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور نور میں شامل ہو جائے۔

مرض ہی میں یہ غزل شروع کی، حسام الدین چلی لکھتے جاتے تھے، اور روتے جاتے تھے۔

رد سر بنہ ببالین تنہا مرا ہا کن ترک من خزلے شب گرد مبتلا کن

مایم و موج سودا شب تا بروز تنہا خواہی بیا بنجنا خواہی برو جفا کن

از من گریز تا تو ہم در بلا نیفتی بگزین رہ سلامت ترک رہ بلا کن

مایم و آب دیدہ در کنج غم خزیدہ بر آب دیدہ ماصد جائے آسیا کن

خیرہ کشی است مارا دارد و بے چو خارا بکشد کشش نہ گوید تدبیر خو بہا کن

بر شاہ خورویان واجب وفا بناشد لے زرد روئے عاشق تو صبر کن وفا کن

درد لیست غیر مردن کا نرا دو ابا نشد پس من چکو نہ گویم کان درد را دو اکن

در خواب دوش پیری در کوئے عشق دیدم بادست اشار تم کرد کہ عزم سوئے ما کن

عین انتقال کے قریب فرمایا :-

گر مومنی و شیریں ہم مونسٹ مرگت در کافری و تلخی ہم کافرست مُردن

۵ جمادی الاخریٰ ۷۶۷ھ کو بوقت غروب آفتاب تھاق و معارف بیان فرماتے ہوئے انتقال فرمایا۔

فرمایا، انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۶۸ برس تین ماہ کی تھی۔

جنازہ کو جب باہر لائے قیامت کا ازدحام برپا ہوا، ہر قوم و ملت کے لوگ ساتھ تھے، اور سب روتے جاتے تھے، یہودی اور عیسائی تو ریت و انجیل پڑھتے جاتے تھے، مسلمان ان کو ہٹاتے، مگر وہ باز نہیں آتے تھے، فساد کا اندیشہ ہوا، جب یہ خبر پروانہ کو پہونچی، تو اس نے راہبوں اور قسوس سے پوچھا کہ تمہیں اس امر سے کیا تعلق ہے، انھوں نے کہا کہ ہم نے انبیائے سابقین کی حقیقت کو انہی کے بیان سے سمجھا، اور اب یائے اکل کی روش کو انہی کی روش سے جانا، وہ لوگ اسی طرح تابوت کے ساتھ رہے، ہجوم کی حالت یہ رہی کہ تابوت صبح سویرے مدرسہ سے روانہ ہوا تھا، اور شام کے قریب قبرستان پہونچا، آخر بوقت شب یہ آفتاب فقر و تصوف دیدہ ظاہر سے نہاں ہو گیا۔

اخلاق و خصوصیات

مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:۔

”مولانا جب تک تصوف کے دائرہ میں نہیں آئے، آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان رکھتی تھی، ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلبہ بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا، سلاطین و امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی، درس و تدریس، افتاد و افادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن وہ پچھلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی، ذرہ زیادہ ترجمت و معرفت کے نش میں سرشار رہتے“

ریاضت و مجاہدہ

ریاضت و مجاہدہ حد سے بڑھا ہوا تھا، سپہ سالار برسوں ساتھ رہے ہیں، ان کا بیان ہے کہ

اے معین الدین پروانہ حاکم قونیہ۔

میں نے کبھی ان کو شبِ خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، کچھ نا اوزن کیہ بالکل نہیں ہوتا تھا، قصداً بیٹھے نہیں تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے، ایک غزل میں فرماتے ہیں:-

چہ آساید بہر پہلو کہ خسپد کسے کز خار دارد او نہالین
سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو پر سر رکھ لیتے کہ وہ لوگ بے تکلف ہو کر سو جائیں، وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو خود اٹھ بیٹھتے، اور ذکر و شغل میں مصروف ہوتے، ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمہ نختند و من دل شدہ را خواب نبرد ہمہ شب دیدہ من بر فلک استارہ شمرد
خوابم از دیدہ چناں رفت کہ ہرگز ناید خواب من زہر فراق تو بنوشید و ببرد
روزہ اکثر رکھتے تھے، اور مسلسل کئی کئی روز کچھ نہ کھاتے تھے۔

نماز کی کیفیت

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے، اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا، نماز میں نہایت استغراق ہوتا تھا، اسے سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشا کے وقت سے نیت باندھی، اور دو رکعتوں میں صبح ہو گئی، مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے، فرماتے ہیں:-

چو نماز شام ہر کس نہد چراغ و خوانے منم و خیال یارے غم و نوحہ و فغانے
چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نماز در مسجدم بسوزد چو در در سدا اذانے
عجا نمازستان تو بگو درست ہست آں کنداندا وزمانے نہ شاندا و مکانے
عجا دور کعت ست ایں عجا چہاں آں عجا چہ سورہ خواندم، چوندا شتم زمانے
در حق چگونہ کویم ہ کہ نہ دست ماندن دل دل دوست چوں تو بردی بدے خدا مانے

بخدا خبر نہ دارم چو نمازی گزارم کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلا نے
ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں
سے تر ہو گئی، جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم کر یخ ہو گئے، لیکن وہ اسی طرح نماز میں مشغول رہے۔

زہد و قناعت

مزارع میں انتہادریہ کا زہد و قناعت تھی، تمام سلاطین و امراء نقدی اور قہر کم کے تحائف بھیجتے تھے،
لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے، جو چیز آتی، اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلی حسام الدین کے
پاس بھجوا دیتے، کبھی بھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی، اور مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد اصرار
کرتے تو کچھ رکھ لیتے، جس دن گھر میں کھانے کا سامان کچھ نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے اور فرماتے کہ آج ہمارے
گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

فیاضی و ایثار

فیاضی و ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عجایب کرتا یا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر دے دیتے،
اسی لحاظ سے کرتا عجایب کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا تھا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

بے نفسی اور فنایت

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ راہ میں جا رہے تھے، ایک تنگ گلی میں ایک کتا سر راہ سو رہا تھا، جس سے
راستہ رک گیا تھا، مولانا وہیں رک گئے، اور دیر تک کھڑے رہے، ادھر سے ایک شخص آ رہا تھا، اس نے کتے کو
بٹھا دیا، مولانا نہایت آزرده ہوئے اور فرمایا کہ ناحق اس کو تکلیف دی۔

ایک دفعہ دو شخص سر راہ لڑ رہے تھے، اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ اوجہین! تو ایک کہے گا تو دوسرے سے گا، اتفاق سے مولانا کا ادھر گزر ہوا، آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہو کہ تم مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ منو گے، دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

کسبِ حلال

معاش کا یہ طریقہ تھا کہ اوقات کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزینہ مقرر تھا، چونکہ مولانا مفت غوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے، اس لئے اس کے معاوضہ میں فتویٰ لکھا کرتے تھے، مریدوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی فتویٰ لائے تو گوئیں کسی حالت میں ہوں، ضرور ضرر کرونا کہ یہ آمدنی مجھے پر حلال ہو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدیق الدین کو ہزاروں روپیہ کا وظیفہ ہے، اور آپ کو کل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں، مولانا نے کہا کہ شیخ کے مصارف بھی بہت ہیں، اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی انہی کو ملنے چاہئیں۔

اہل دنیا سے کیسوئی

مولانا کو بالطبع امرار و سلاطین سے نفرت تھی، صرف حسنِ خلق کی وجہ سے ان سے مل لیتے تھے، ورنہ ان کی صحبتوں کو بول دور بھاگتے تھے، ایک دفعہ ایک میر نے معذرت کی کہ اشغال سے فرصت نہیں ہوتی، اس لئے کم حاضر ہو سکتا ہوں، معاف فرمائیے گا فرمایا۔

”معذرت کی ضرورت نہیں، میں آنے کی بہ نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں“

ثنوی معنوی اور اس کا علمی و اصلاحی مقام و پیغام

ثنوی معنوی

مولانا کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پرجوش طبیعت پائی تھی، عشق ان کی فطرت

میں کوٹ کوٹ کر بکھرتھا، ظاہری علم اور عقلیات کے توفل نے اس آگ کو دبا رکھا تھا، شمس تبریز کی آتشین صحبت نے ان کی فطرت کو چھیڑ دیا، اور تربیت و ماحول نے اس پر جو پڑے ڈال دیئے تھے، وہ دفعۃً اٹھ گئے، اور وہ سراپا سوز و ساز بن گئے۔

شعلہا آخر زہر مویم دید از گاندیشہ ام آتش چکیدہ
اس مقام پر پہنچ کر عارف کے ہر بن مو سے صدا آتی ہے کہ۔

درہیان یارب ندیم من کجاست نخل سینا یم کلیم من کجاست یہ
یہی وجہ تھی کہ ہمد و ہمز کے بغیر ان کے لئے جینا محال تھا، شمس تبریز کے بعد جب تک ان کو صلاح الدین زرکوب اور صلاح الدین زرکوب کے بعد جب تک ان کو حسام الدین چلی نہیں مل گئے، ان کی بے قرار طبیعت کو سکون نہیں ہوا۔ ع

شمع راتنہا طپیدن سہل نیست

یہی آتش سوزاں تھی جو ان کو کشاں کشاں سماع کی طرف لے جاتی تھی، اور وہ اس سے قوت اور غذا حاصل کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

پس غذائے عاشقاں آمد سماع کہ ازو باشد خیال اجتماع
قوتے گیرد خیالات ضمیر بلکہ صورت گردد از بانگ صفیر
آتش عشق از نوا ہا گرد تیز آنچنانکہ آتش آن جوز ریز

اسی سوز نے ان کے ساز کو چھیڑا اور خاموش رہنا ان کے لئے ناممکن کر دیا اس لئے ان کے بقول ہ

بوش لطق ازل نشان دوستیت بستگی نطق، از بے الفتی است
دل کہ دلبر دید کے ماند ترش بلبیل گل دیدہ کے ماند خموش

اس ساز سے جو نغمے نکلے ان کے مجموعے کا نام مثنوی ہے، یہ ان کے خیالات و حالات و واردات و تاثرات اور مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہے، اس میں صاحب کلام کا سوز و درد، جوش و مستی، اور ایمان یقین بھرا ہوا ہے، اور یہی اس کی عالمگیر مقبولیت اور بے نظیر تاثیر کی اصل وجہ ہے۔ ع۔
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید

مولانا کا علمی نشو و نما تمام تراشہ عروہ کے علمی ماحول میں ہوا تھا، وہ خود ایک کامیاب مدرس اور معقول عالم تھے، توفیق الہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہنچایا، اور قال سے حال، خبر سے نظر، الفاظ سے معانی، اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی طلسم سے ترقی کر کے حقیقت و مغز تک پہنچے تو ان کو فلسفہ و علم کلام کی کمزوریوں اور استدلال و قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا، اور فلاسفہ و متکلمین اور اہل استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی، تو انھوں نے بڑی قوت اور وضاحت کے ساتھ علم کلام پر تنقید کی، وہ چونکہ اس کو چپ کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں، اس لئے وہ کچھ کہتے ہیں، وہ ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے، اور اس کی واقعیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس عصر کے فلسفہ و عقلیات کا سب سے زیادہ زور جو اس ظاہری پر تھا، ان حواس خمسہ کو علم اور حصول یقین کا سب سے زیادہ مستند اور قابل وثوق ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اور جو چیز ان کی گرفت میں نہ آسکے، اور ان کے ذریعہ اس کی تصدیق نہ ہو سکے، اس کی نفی اور اس کے انکار کی طرف رجحان روز بروز ترقی کر رہا تھا، معتزلہ اس "حسیت" کے سب سے بڑے نقیب تھے، اس حواس پرستی نے ایمان بالغیب کو بہت نقصان پہنچایا تھا، اور شریعت اور وحی کے پیش کئے ہوئے حقائق کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا کر دی

تھی، مولانا اس حواس پرستی اور اس کے پرہوش و کیلوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

چشمِ حس را هست مذہب اعتزال	دیدہ عقل است سستی در وصال
سخرہ حس انداہل اعتزال	خویش راستی نمایند از ضلال
ہر کہ در حس ماند او معترزی است	گر چہ گوید ستیم از خامی است
ہر کہ بیرون شد ز حس سنی و لیست	اہل بنیش اہل عقل خویش بیست

انھوں نے جا بجا ثابت کیا ہے کہ ان حواس ظاہری کے علاوہ انسان کو کچھ حواس باطنی عطا ہوئے

ہیں، یہ حواس باطنی حواس ظاہری کے مقابل میں کہیں زیادہ وسیع اور وسیع ہیں، فرماتے ہیں:-

پنج حصے ہست جزایں پنج حس	آں پوزر سرخ و ایں حسہا چو مس
اندراں بازار کاہل محشر اند	حس مس را چوں حس زر کے خرد
حس ابدان قوت ظلمت می خورد	حس جان از آفتابے می چرند

ان کے نزدیک کسی چیز کے انکار کے لئے یہ ثبوت بالکل کافی نہیں کہ وہ دیکھنے میں نہیں آتی، یا حواس اس کی تصدیق نہیں کرتے، ان کے نزدیک باطن ظاہر کے پیچھے نہیں اور دوا میں فائدہ کی طرح اس میں پنہاں ہے، منکرین باطن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

حجت منکر ہی آمد کہ من	غیر ازیں ظاہر نمی بینم وطن
ہیچ نندیشد کہ ہر جا ظاہر است	آں ز حکمت ہائے پنہاں فجرست
فائدہ ہر ظاہرے خود با طہیت	ہیچ نفع اندر دوا ہا مضمر لیست

ان کا کہنا ہے کہ منکرین اپنی اس ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کی عادت کی وجہ سے ان حقائق باطنی

کی دید سے محجوب اور اصل غایت و مقصد سے محروم ہیں:-

چونکہ ظاہر ہاگر فتنہ احمقوں اُن دقائق شد ازیشان بس نہاں
 لاجرم محبوب گشتند از غرض کہ دقیق فوت شد در مفترض^۱
 ہوا اس سے آگے بڑھ کر وہ عقل پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ عالم غیب کے حقائق اور انبیاء کے علوم و معارف
 کے بارے میں عقل بھی کوتاہ اور نارسا ہے اس کے پاس قیاس کی کوئی بنیاد نہیں اور وہ اس عالم کا کوئی
 تجربہ نہیں رکھتی، دریاے شور کا رہنے والا آب شیریں کا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟

اے کہ اندر چشمہ شور است جات تو چہ دانی شط و جیون و فرات^۲
 وہ اس عقل کو جو محسوسات اور مقدمات کی پابند ہو عقل جزوی کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کے
 نزدیک ادہام و شکوک اس کا ثمرہ عالم ظلمات اس کا وطن ہے، وہ عقل کے لئے باعث بدنامی اور انسان
 کے لئے سبب ناکامی ہے، اس عقل جزوی سے دیوانگی ابھی!

عقل جزوی آفتش وہم ست وطن زانکہ در ظلمات شد اورا وطن^۳
 عقل جزوی عقل را بدنام کرد کام دنیا مرد را بے کام کرد^۴
 زین خرد جاہل ہی باید شدن دست در دیوانگی باید زد^۵
 وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود اس عقل دور اندیش کا تجربہ کیا ہے، اور اس نتیجہ تک پہنچا ہوں۔
 آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازین دیوانہ سازم خویش^۶
 پھر وہ ایک سیدھی اور عام فہم بات کہتے ہیں کہ اگر عقل دینی حقائق و معارف کے ادراک کے لئے
 کافی ہوتی تو اہل منطق و استدلال اور ائمہ کلام سب سے بڑے عارف اور دین کے محرم اسرار ہوتے۔
 اندرین بحث از خرد رہیں بدے فخر ازین را ز دار دین بدے^۷

ان کے نزدیک انسانوں کے ساختہ پر دانستہ علوم، علم حقیقی کے لئے حجاب اور سالک کے لئے

انتشار و اضطراب کا موجب ہیں اس لئے یقین و معرفت کے لئے ان میں اضافہ و ترقی کے بجائے کمی اور ان سے گلو خلاصی کی ضرورت ہے، فرماتے ہیں:-

گر تو خواہی کت شقاوت کم شود جہد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتی کہ طبع آید و ز خیال حکمتی بے فیض نور ذوالجلال
حکمتی دنیا فزاید ظن و شک حکمتی دینی برد فوق فلک

ان کے خیال میں استدلال مقدمات کی ترتیب اور نتیجہ کا استخراج ایک مصنوعی طریقہ ہے اور اس بہت محدود اور ناقص نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں اس سے دینی حقائق کا ثابت کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے لکڑی کے مصنوعی پاؤں کے ذریعہ آزادانہ چلنا پھرنا اور سفر طے کرنا، ان کی تمثیل ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ:-

پائے استدلالیان چوبیس بود پائے چوبیس سخت بے تنکیں بود

ان کے نزدیک علم کلام اور حکماء بحث و استدلال سے یقین کی کیفیت اور صلاوت ایمانی حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ منطک جو تقلید متقدمین کے دلائل و براہین کو نقل کر دیتا ہے اور آموختہ سنا دیتا ہے، خود بے روح، اور ذوق و کیفیات یقین سے محروم ہے۔

آں مقلد صد دلیل و صد بیان بر زبان آرد ندارد هیچ جان
چونکہ گویندہ ندارد جان و فر گفت اورا کے بود برگ و ثمر

وہ اس عقل جزوی کے بجائے جو محسوسات و معلومات اور تجربات کی پابند اور دنیا کے اندر محدود ہے، اس عقل ایمانی کے قائل ہیں، جو خود عقل کے لئے رہنما اور اس کے لئے چراغ راہ ہے اور جو اس سے وہ نسبت رکھتی ہے، جو عقل جزوی جسم کے ساتھ، اور جس کے بغیر عقل عقل کہلانے کی مستحق نہیں، اس لئے اس کو عقل عقل

کہہ سکتے ہیں، عقل عقل ان لوگوں کا حصہ ہے، جو نور ایمان اور دولت یقین سے بہرہ ور ہیں۔

بند معقولات آمد فلسفی شہسوار عقل عقل آمد صفی
عقل جزوی سے انسان کے دفتر کے دفتر سیاہ ہیں، عقل عقل سے عالم مطلع انوار ہے۔
عقل دفتر ہاگند یکسر سیاہ عقل عقل آفاق دارد پُر زماہ
از سیاہی و سپیدی فارغ است نور ماہش بردل و جان باغ است
عقل ایمانی شہر کے لئے پاسان کا حکم رکھتی ہے عقل جزوی کا تقاضا خوف و ہراس اور دنیا کے
اندیشے ہیں، عقل ایمانی کا تقاضا اطمینان و سکون اور خواہشات نفس سے حفاظت ہے۔

عقل ایمانی چو شمشاد عادل است پاسان و حاکم شہر دل است
عقل در تن حاکم ایمان بود کہ ز ہمیش نفس در زندان بود
ان کے نزدیک جس طرح حواس عقل کے تابع اور محکوم ہیں، اسی طرح عقل پر روح کو تفوق اور حکومت
حاصل ہے، روح ایک اشارہ میں عقل کی سیکڑوں گرہیں کھول دیتی ہے، اور چٹکیوں میں اس کی مشکل آسان کر دیتی ہے۔

حس اسیر عقل باشد اے فلاں عقل اسیر روح باشد ہم بدان
دست بستہ عقل را جان باز کرد کار ہائے بستہ را ہم ساز کرد
فلسفی ادنی معقولات اور ابتدائی معلومات کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی عقل نے
ابھی دروازہ سے باہر قدم ہی نہیں نکالا ہے۔

فلسفی گوید ز معقولات دون عقل از دہلیز می ناید برون
فلسفی خود اپنی عقل و فکر کا مارا ہوا ہے، وہ ایسا بد قسمت مسافر ہے کہ اس کی پشت منزل کی طرف
اور رخ صحرا کی طرف ہے، اس لئے وہ جس قدر تیز قدم بڑھاتا ہے، منزل بقصد سے دور ہو جاتا ہے۔

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت کو بد و کوراسوے گنج است پشت
 کو بد و چنداں کہ افزوں می دود از مراد دل جدا ترمی شود
 فلسفی دنیا کے علوم سے باخبر، بڑا وسیع النظر، صد ہا چیزوں سے آشنا، مگر اپنے سے نا آشنا ہے،
 حالانکہ سب سے بڑا علم خود شناسی ہے۔

صد ہزاراں فضل دارد از علوم جان خود را می نداند این ظلوم
 داند او خاصیت ہر جوہرے در بیان جوہر خود چون خرے
 قیمت ہر کالہ می دانی کہ چسیت قیمت خود را ندانی ز احقیست
 جان جملہ علیہا این ست این کہ بدانی من کیم در یوم دین
 وہ اپنے زمانہ کے عالم و مکلم کو حکمت یونانی سے حکمت ایمانی کی طرف ہجرت کی دعوت دیتے ہیں،
 جو حقیقی علم اور حکمت ہے۔

چند چند از حکمت یونانیان حکمت ایمانیان را ہم بخوان
 وہ کہتے ہیں کہ تزکیہ نفس سے صحیح معرفت نفس حاصل ہوگی، لوح دل حقیقی صاف ہوگی، حکمت
 ایمانی کے نقوش اتنے ہی روشن اور اجاگر ہوں گے، اس وقت بغیر کتاب و استاد کے انبیاء علیہم السلام
 کے علوم و معارف وارد ہوں گے، اور حکمت کے دہانے کھل جائیں گے۔

نولش را صافی کن ز اوصاف خود تا بہ بینی ذات پاک و صاف خود
 بینی اندر دل علوم انبیاء، بے کتاب و بے معید و اوستا
 دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

آئینہ دل چون شود صافی و پاک نقشہا بینی برون از آب و خاک

روزِ دل گر کشادست و صفا می رسد بے واسطہ نورِ خدا

دعوتِ عشق

ساتویں صدی میں علمِ کلام اور عقلیت کی جو سرد ہوا عالمِ اسلام میں مشرق سے مغرب تک چلی تھی، اس سے دل کی انگلیٹھیاں سرد ہو گئی تھیں، اگر کہیں عشق کی چگاریاں تھیں تو راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ورنہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک افسردہ دلی بلکہ مردہ دلی چھائی ہوئی تھی، اور کہنے والا دیر سے کہہ رہا تھا کہ۔

بھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلمان نہیں خاک کا ڈھیر ہے
اس سرد اور خواب آور فضا میں مولانا نے "عشق" کی صدا بلند کی، اور اس زور سے بلند کی کہ ایک بار عالمِ اسلام کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔

مولانا نے کھل کر عشق کی دعوت دی اور محبت کی کرامت اور عشق کی کرشمہ سازیاں بیان کیں۔

از محبت تلپنا شیریں شود	وز محبت مسہا رزیں شود
از محبت درد ہا صافی شود	وز محبت درد ہا شافی شود
از محبت سجن گلشن می شود	بے محبت روضہ گلخن می شود
از محبت سنگ روغن می شود	بے محبت موم آہن می شود
از محبت سقم صحت می شود	وز محبت قہر رحمت می شود
از محبت مردہ زندہ می شود	وز محبت شاہ بندہ می شود

وہ عشق کی طاقت و نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جسم خاک از عشق بر افلاک شد کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جان طور آمد عاشقا طور مست و خرم موسیٰ صغارا^۱

وہ فرماتے ہیں، عشق نہایت غیور خود دار ہے، وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا، جس نے ایک بار اس کا مزہ چکھ لیا، اس نے پھر کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی^۲
وہ دو عالم سے بیگانہ اور دنیا کا سب سے بڑا مست و دیوانہ ہے۔

باد و عالم عشق را بیگانگی اندر و ہفتاد دو دیوانگی^۳
وہ شاہوں کا شاہ اور مظلوبوں کا مطلوب ہے، بادشاہوں کے تخت و تاج اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔

سخت پنہاں است و پیدائش جان سلطانان جاں در حسرتش
غیر ہفتاد دو ملت کیش او تخت شاہان تخته بندے پیش او^۴
اس فقر جسور اور عشق غیور کا جب وہ تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو خود ان پر جوش و سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور وہ بخود ہو کر کہنے لگتے ہیں۔

ملک دنیا تن پرستان راحلال اغلام ملک عشق بے زوال^۵
وہ کہتے ہیں کہ عشق کی ہی وہ بیماری ہے جس سے بیمار کبھی شفا نہیں چاہتا، بلکہ اس میں اضافہ و ترقی ہی کی دعا کرتا ہے۔

جملہ رنج و راز شفا جو بند و این رنج افزون جوید و درد و چنین
خوبتر زین سم ندیدم شر بتے زین مرض خوشتر نباشد صحتے^۶
لیکن وہ ایسی بیماری ہے کہ پھر کوئی بیماری نہیں ہوتی۔

اں کلامت می رہاند از کلام وان سقامت می جهاندا ز سقام^۱
 بیماری بھی ایسی بیماری ہے کہ ہزار صحتیں اس پر قربان، اس کی کلفت ایسی کلفت ہے کہ ہزاروں
 راحتیں اس پر نثار۔

پس مقام عشق جانِ صحت است رنجہائش حسرت ہر راحت است^۲
 یہ عشق پاک باز اگر گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے کہ طاعتیں اس کے سامنے بیچ ہیں، اس سے ایک گھڑی
 میں جو ترقی حاصل ہوتی ہے، وہ ساہا سال کی ریاضت سے میسر نہیں۔

زین گنہ بہتر نباشد طاعتے ساہا نسبت بدین دم ساعنے^۳
 راہ عشق میں جو فون بہے وہ کسی پانی سے کم پاک نہیں، شہید عشق کو ہمارے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔
 خون شہیدان را ز آب ولی تراست ابن خطا از صد صواب اولی تراست^۴
 عاشق وہ جگر سوختہ و دل باختہ ہیں کہ ان پر عام انسانوں کے قوانین جاری نہیں کئے جاسکتے جو
 گاؤں سرا سر ویران ہو گیا ہو اس پر خراج کیسا؟

عاشقان را ہر نفس سوزید نیست بردہ ویران را خراج و عشر نیست^۵
 عشق آدم کی میراث اور زیر کی وچالاک کی شیطان کا سرمایہ ہے۔

داند آں کو نیک بخت و محرم است زیر کی را بلعیش و عشق از آدم است^۶
 زیر کی وچالاک میں اپنے دست و بازو (عقل و خرد) پر اعتماد ہوتا ہے عشق میں کسی کے دامن سے
 وابستگی ہوتی ہے اور سپردگی، زیر کی وچالاک، ثناوری، (پیر کی) کافن ہے، ”عشق“ کشتی نوح، زیر کی و
 چالاک کو اس طوفان میں بچتے اور ساحل تک پہنچتے اور صاحب عشق کو غرق ہوتے کب دیکھا گیا ہے؟
 زیر کی سباجی آمد در بحار کم زہد، غرق است او پایان کار

عشق چوں کشتی شود بہر خواص کم بود آفت، بود اغلب خلاص^۱
 عقل کی ہوشمندی عشق کی حیرانی پر قربان کر دینے کے قابل ہے، وہ ہوشمندی محض ظن و قیاس
 ہے، اور یہ حیرانی شاہدہ و عرفان۔

زیر کی بفروش و حیرانی بجز زیر کی ظنیست، حیرانی نظر^۲
 مولانا عشق کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب بننا تو ہر ایک کے بس ہیں نہیں، لیکن عاشق
 بننا ممکن ہے، اگر خدا نے تم کو محبوب نہیں بنایا ہے تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو۔

تو کہ یوسف نیستی، یعقوب باش ہچو او باگریہ و آشوب باش
 تو کہ شیریں نیستی فرہاد باش چوں نہی لیل تو محنوں گرد فاش^۳
 وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عاشق بننے میں جو مزہ ہے، اور ترقی ہے، وہ محبوب
 بننے میں کہاں؟ اگر محبوبان عالم کو اس دولت سرمد کا پتہ چل جائے، محبوبوں کی صف سے نکل کر عشق^۴
 کی صف میں شامل ہو جائیں۔

ترک کن معشوقی و کن عاشقی اے گمان بردہ کہ خوب و فائق^۵
 لیکن "عشق" کی یہ دولت بیدار کسی مردہ و ناپائدار محبوب کے لائق نہیں، عشق خود زندہ ہے،
 اسے ایک زندہ و پائندہ محبوب چاہئے۔

عشق بر مردہ نباشد پائدار عشق را بر حے جان افزایہ دار^۶
 اسی زندہ و پائندہ حی و قیوم محبوب سے عشق جاوداں کی تشفی و استواری ہے، اسی سے اس کی
 تازگی اور آبیاری ہے۔

عشق زندہ در رواں و در لہر ہر دے باشد ز غنچہ تازہ تر

عشق آن زندہ گزین کو باقیست در شراب جانفرا بیت ساقیست
 عشق آن بگزین کہ جملہ انبیاء یافتند از عشق او کار دکیست
 حسن کی اس بارگاہ عالی میں عشق کو اپنی نارسائی کا شکوہ نہیں ہونا چاہئے کہ حسن ازل سدا
 عشق نواز اور دوست طلب ہے۔

تو لگو مارا بیدار نہ باز نیست باکریاں کار ہا دشوار نیست
 یہ عشق دیکھنے میں ایک بیماری ہے، جو دل کی شکستگی سے پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری بڑی جان لیوا
 ہے، لیکن آدمی اگر اس کو برداشت کر لے جائے تو اس کا نتیجہ معرفت حقیقی اور حیات ابدی ہے۔

عاشقی پیدا است از رازی دل نیست بیماری چوں بیماری دل
 علت عاشق ز علتہا جداست عشق اضطراب اسرار خداست
 یہ بیماری سب بیماریوں کی دو اور قسم کے نفسانی و اخلاقی امراض کے لئے شفا ہے، جن روحانی
 امراض کے علاج سے طبیب مایوس اور معالج مصلح دست بردار ہو چکے ہوں، اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی
 ہو، عشق ایک نگاہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، برسوں کا مرض جب عشق کے ہاتھوں اپنے روحانی امراض
 کہنہ سے شفا پاتا ہے، تو سرور و بینوادی کے عالم میں پکارا ٹھکتا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علتہا اے ما
 اے دوائے نخت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس ما
 عشق ایک شعلہ ہے جو خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتا ہے، اور محبوب کے سوا کسی کا روادار
 نہیں، وہ بڑا موصد، بڑا غیور ہے۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لاد رقتِ غیرِ حق براند در نگر زان پس کہ بعد از لاپرواہی ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت شاد باش اے شوقِ شکر ت سوزِ رفت

عشقِ الہی ایک بحرِ ناپیدِ کنار ہے، اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں، زمانہ کی وسعت بھی اس کے لئے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستانِ سرائی کے لئے کوتاہ ہے، یہ اُس حسنِ ازلی کا قصہ ہے، جس کا نہ اول ہے نہ آخر، اس لئے یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعترافِ عجز ہی مناسب ہے۔

شرحِ عشقِ ارمینِ گویمِ بردوام صد قیامت بگذرد و انِ ناتمام
زانکہ تاریخِ قیامت را خداست حد کجا آنجا کہ وصفِ اینِ خداست

جہانِ دل

لیکن عینِ شوقِ جس کی دعوت مولانا اس جوش و خروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی، اور بیداری اور دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں، ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی دل کی طاقتوں اور وسعتوں سے غفلت اور ناواقفیت بڑھتی جا رہی تھی، اور دماغ کی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھتا جا رہا تھا، دماغ روشن اور دل سرد ہوتے جا رہے تھے، معدہ زندگی میں مرکزی مقام حاصل کرتا جا رہا تھا، مولانا نے دل کی عظمت و وسعت کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے عجائبات و فتوحات بیان کئے، اور یاد دلایا کہ انسان اپنے اس جسمِ خاکی میں کیسا سدِ بہارِ باغ رکھتا ہے، اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے جس میں ملک کے ملک گم ہو جائیں، جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں۔

ایمن آباد است دلِ لے مردان حصنِ محکم موضعِ امن و امان
گلشنِ خرمِ بکامِ دوستان چشمہا و گلستانِ درگلستان

انہوں نے بتلایا کہ دنیا کے باغات چند دنوں کے مہان، لیکن نخل دل سدا جوان اور باغ دل بہار
بے خزاں ہے، جسم کا باغ برسوں میں لگتا ہے، اور دم میں اجر جاتا ہے، دلوں کے باغ لگنے میں دیر نہیں
لگتی، مگر اس کی رعنائی اور تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔

گلشنے کز نقل رویدیکم است گلشنے کز عقل روید خرم است
گلشنے کز تن دم گرد تباه گلشنے کز دل دم دوا فرحتا ہے

وہ تلقین کرتے ہیں کہ جسم کو جوان بنانے کی سعی لا حاصل اور سکندر کی طرح ”چشمہ حیوان“ کی ناکام
تلاش کے بجائے عشق کے آب حیات کا ایک جرعه نوش جان اور دل کی زندگی کا سامان کرنے کی ضرورت
ہے تاکہ صحیح معنی میں زندہ دلی اور نشاطِ روح حاصل ہو اور ہر دور زندگی میں اتوانائی و رعنائی محسوس ہو۔

دل بجز تادائما باشی جوان از تجلی چہرہ ات چوں از عوان
طالب دل شو کہ تا باشی چو مل تا شوی شادان و خندان ہمچو گل

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو، اول وہ نہیں ہے، جو سینہ میں دھڑکتا ہے اور خواہشاتِ نفس
اور بواہوسی کی آماجگاہ ہے، جو محبت کی لذت سے نا آشنا افسین کی دولت سے محروم ذوق و شوق سے خالی
ہے جس کی کلی بھی کھلتی نہیں، اور جس کی قسمت کبھی چمکتی نہیں، یہ دل دل نہیں، پتھر کی ایک سیل ہے۔

تنگ و تاریک است چون جان بہو مینو از ذوق سلطان و دود
نے دراں دل تاب نور آفتاب نے کشاد عرصہ نے فتح باب ہے

یہ دل اپنی ساخت اور اپنی صورت شکل، جسامت کے لحاظ سے ویسا ہی ایک دل ہے، جیسے اہل
دل کا بیدار و بیتاب، لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو سوائے لفظی اشتراک و جسمانی مشابہت کے
دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، وہ بھی پانی ہے، جو چشمہ صافی میں رواں ہے، اور وہ بھی پانی ہے، جو کسی دلدل

یا نیچر کے اندر ہے، لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے جس سے پیاس بھی بجھائی جاسکتی ہے، اور ہاتھ بھی صاف ہو سکتے ہیں،
دوسرا پانی میں مٹی کا اتنا جز ہے کہ اس پانی کا کام لینا مشکل ہے، یہی فرق دل اور دل میں ہے ایک دل مادہ پرست
اور دوسرا دل ایک بے حس و مردہ دل انسان کا ہے ایک دل انبیاء و اولیاء کا ہے جس کی بلند نگاہ سائنس
بھی پست اور جس کی وسعت آگے رائے عالم کی وسعت گرد ہے اس لئے سوچ سمجھ کر کہو کہ ہمارے پہلو میں بھی دل ہے

تو یہی گوئی مراد دل نیز ہست دل فراز عرش اشد نہ بہست
در گل تیرہ یقین ہم آب ہست یک ازاں آبت نیاید آب دست
زانکہ گر آب است مغلوب گل است پس دل خود را گویاں ہم دل است
آں دے کر آسمان ہار نر است آں دل ابدال یا یغیر است

لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہر حال دل ہے، اور خدا کے یہاں کوئی دل مردود نہیں، وہ ہر دل
کا خریدار ہے، اس لئے کہ خریداری سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہیں۔

کا کہ کہ بیچ خلقش ننگرید از خلافت آں کریم آں را خرید
بیچ قلبے پیش او مردود نیست زانکہ قصدش از خریدن نمود

پھر وہ فرماتے ہیں کہ معدہ کے قفس زریں کو چھوڑ کر دل کی آزادستی کی سیر کرو، اور خدا کی قدرت
کا تماشا دیکھو، تمہارے اور خالق کے درمیان بڑا حجاب یہی معدہ اور شکم پرستی ہے، تم اس حجاب سے
بیکے کرتم کو اس بارگاہ عالی سے سلام پہونچے۔

معدہ را بگذر سوئے دل خرام تاکہ بے پردہ ز حق آید سلام

مقام انسانیت

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پیہم مظالم مسلسل جنگوں کے نتیجے میں عام انسانوں میں

زندگی سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس کہتری پیدا ہو گیا تھا، اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا تھا، عجمی تصوف نے فنائیت، انکار ذات اور خود شکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت کی تھی کہ خود نگری اور خود شناسی جس پر حرکت، جدوجہد اور شکست و قوت ہے، ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی، انسانوں کے سامنے ملکوئی صفات کے حصول، اور لوازم بشریت سے اسلخ، تجرد و تفرید کی تبلیغ، اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی، اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا تھا، عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہو گیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات اور شعر و شاعری میں تحقیر انسانیت کی روح سرایت کر گئی تھی، اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارہ میں بے اعتمادی، ناامیدی، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی، اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا، وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور ترقیات سے غافل تھا، مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہو گئی، اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا، مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعر و شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا ”أَحْسَنَ تَقْوِيمٍ“ کے خطاب سے یاد فرمایا ہے، یہ لباس موزوں خاص طور پر اسی کے لئے تعلق کیا گیا ہے، اور اس کی قیامت پر راست آتا ہے۔

کہ گرامی گوہر است اے دوست جان

”أَحْسَنَ التَّقْوِيمِ“ از عرش فزوں

”أَحْسَنَ التَّقْوِيمِ“ در ذاتین، بخواں

”أَحْسَنَ التَّقْوِيمِ“ از فکر ت برون

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے سوا اور کس کے سر پر کرامت کا تاج رکھا گیا ہے اور کَرَّمَنا اور

أَعْطَيْنَاكَ کے خطاب سے مشرف کیا گیا ہے؟!

ہیچ کرَّمَنا شنید ایں آسان کہ شنید ایں آدمی پُرغمان
تاج کرَّمَناست برفرقِ سرت طوقِ اَعْطَيْنَاکِ آویزِ برت

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصہ کائنات اور مجموعہ اوصافِ عالم ہے انسان کیا ہے ایک کوزہ

میں دریا بند ہے اور ایک مختصر سے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے۔

آفتابِ دریکے ذرہ نہاں ناگہاں آں ذرہ بکشايد دہان
ذرہ ذرہ گردِ افلاک و زمین پیش آں خورشیدِ یوں جہتِ ازمین
بحرِ علی در نمی پنہاں شدہ در سہ گز تنِ عالمی پنہاں شدہ

انسان آفرینشِ عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسود ہے اسی سے اس عالم کا رنگ و بو

اور زندگی کی آبرو ہے اس کی طاعت تمام موجودات پر فرض ہے۔

ہر شرابِ بندہ آں قد و قد جملہ مستانِ را بود بر تو حسد
ہیچ محتاجِ مے گلگون نے ترک کن گلگونہ تو گلگون نے
جو ہر است انسان و چرخِ اور اعرض جملہ فرع و سایہ اند تو غرض
علم جوئی از کتبِ ہائے فوس ذوقِ ہوش تو ز حلوائے سبوس
خدمتِ بر جملہ ہستی مقرر جو ہرے چون عجزِ دارِ دبا عرض

یہی نہیں بلکہ انسان منظرِ صفاتِ الہی ہے وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا

عکس نظر آتا ہے۔

آدم اصطراب اوصاف علوست وصف آدم منظر آیات اوست

ہر چہ دروے می نماید عکس اوست ہیچو عکس ماہ اندر آب جوست

خلق را چوں آب دان صا و زلال و ندر و تابان صفات ذوا بجلال

علم شان و عدل شان و لطف شان چوں ستارہ چرخ در آب رواں

اس سبک فرمانے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تعریف اور اس کی قدر و قیمت کا بیان

اب بھی مکمل نہیں اور سچ پوچھئے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر گویم قیمت آں ممتنع من بسوزم، ہم بسوزد مستمع

اس رفعت و بلندی کے بعد خدا کے سوا انسان کا کون خریدار ہو سکتا ہے اور کون اس کی قیمت

لگا سکتا ہے، حیف ہے کہ انسان خود اپنی قیمت نہ جانے اور ہر قیمت پر ہر ایک کے ہاتھ بک جانے کے لئے

تیار ہو، وہ بڑی دل سوزی سے فرماتے ہیں۔

اے غلامت عقل و تدبیرات و ہوش تو چرائی خویش را از ازاں فروش

پھر فرماتے ہیں کہ انسان کا سودا ہو چکا ہے، اللہ اس کا خریدار ہے اور وہی انسان کا سچا قدر دان ہے

مشری ماست اللہ اشتری از غم ہر مشتری ہین بر تر آ

مشری جو کہ بویان تو است عالم آغاز و پایان تو است

لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے جو جوہر انسانیت سے آراستہ اور حقیقت انسانیت سے

آشنا ہیں ان انسان نام آدمیوں کا ذکر نہیں جو انسانیت کا خول اور صورت ہی صورت ہیں جو اپنے نفس کے

مائل ہوئے اور خواہشات نفس کے قلیل ہیں، یہ آدمی نہیں ہیں آدمی کی بے جان تصویریں ہیں۔

ایں نہ مردانند اینہا صورت اند مردہ نان اند و کشتہ شہوت اند

ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی حقیقی انسان کیاب اور عنقا صفت تھا، عام طور سے وہی انسان ملتے تھے، جو چوپایوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے، مولانا ان بہائم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اُگت گئے تھے، اور ان کو "انسان" کی تلاش تھی، اپنی تلاش تھی، اپنی تلاش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمہ کی شکل میں بیان فرماتے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہی گشت گردِ شہر کز دام و دود و ملوم و انسائلم آرزوست
زیں ہمرانِ سُست عنانِ دلم گرفت شیر خدا و رستم و ستائلم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما گفت آن کہ یافت می نشود آئلم آرزوست

دعوتِ عمل

مولانا کا تصوف اور ان کی تلقینِ تعطل، بے عملی اور رہبانیت کی مبلغ نہیں، وہ عمل، جدوجہد، کسب اور اجتماعی زندگی کے داعی اور مبلغ ہیں، رہبانیت اور ترکِ دنیا کو اسلام کی روح کے منافی اور تعلیماتِ نبوت کا مخالف سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اگر اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو مجتہد و جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کیوں ہوتی، فرماتے ہیں۔

مرغ گفتش خواجہ در خلوتِ مایست دین احمد را ترتیب نیک نیست
از ترتیبِ نبی فرمود آں رسولؐ بدعتے چوں در گرفتے لے فضول
جمہ شرط است و جماعت در نماز امر معروف و نہی منکر احترام
در میانِ امت مرحوم باش سنتِ احمد مہل محکوم باش

ان کے زمانہ میں توکل تعطل محض کا مرادوت بن کر رہ گیا تھا، کسی قسم کی احتیاط و انتظام توکل

کے منافی سمجھا جاتا تھا، اور بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، مولانا نے توکل کا شرعی مفہوم بیان کیا، اور کسب کی ترغیب دی، اور اس کی فضیلت بیان کی "اعقلھا و توکل علی اللہ" کا مضمون حدیث بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

گفت پیغمبر با و از بلند با توکل زانویں اختر بہ بند
رمر الکاسب حبیب اللہ شنو از توکل در کسب کاہل مشو
رُو توکل کن تو با کسب لے عمو جہد می کن کسب می کن موبو
جہد کن جدے نماتا و ارہی در تو از جہدش بمانی اہلبی

انھوں نے کمزور جانوروں کی زبان سے توکل و تعطل کے وہ تمام دلائل نقل کر دیے ہیں جو عام طور پر ضعیف الہمت اشخاص پیش کیا کرتے ہیں، یہ دلائل بڑے معقول اور روزنی معلوم ہوتے ہیں، پھر ان تفصیل سے جواب دیا ہے، شیر کا جواب مولانا کے اصلی خیالات کا آئینہ ہے۔

شیر کی زبان سے وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو جو اعضا و جوارح اور جو صلاحیتیں اور طاقتیں دی گئی ہیں، ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کوشش اور جدوجہد مطلوب ہے، اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھل ڈرائے دے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے وہ زمین کھودے، یا چٹان توٹے اس کے لئے زبان سے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں، اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے تو اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور جسمانی قوت سے کام لیں، اور اپنے ارادہ و اختیار کو عمل میں لائیں، اس بنا پر سعی و عمل اور کسب و جہد عین خدا کی مرضی اور فطرت کا اشارہ ہے، تعطل اور ترک عمل منشاء الہی کے خلاف اور کفران نعمت ہے، صحیح توکل یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے اور نتیجہ کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیا جائے، کیونکہ کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے، فرماتے ہیں:-

گفت شیر آری دے رب العباد نزد بانے پیش پائے ما نہاد
 پایہ پایہ رفت باید سوئے بام ہست جبری بودن اینجامع خام
 پائے داری چوں کنی خود را تو ننگ دست داری چوں کنی نہاں تو چنگ
 خواہ چوں بیلے دست بندہ داد بے زبان معلوم شد اور ا مراد
 چوں اشارتہاں را بر جان نہی در وفائے آن اشارت جان دہی
 پس اشارت ہاں اسرار ت دہد بار بردار دوز تو کارت دہد
 سعی شکر نعمت قدرت بود جبر تو انکار آن نعمت بود
 شکر نعمت نعمت افزون کند کفر نعمت از کفت بیرون کند
 ہاں محسب اے جبری بے اعتبار جز بریر آن درخت میوہ دار
 تا کہ شاخ افشاں کند ہر خط باد بر سر خفتہ بریز و نقل و زاد
 گر تو کل می کنی دو کار کن کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

پھر شیر کی زبان سے وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جہد و جہاد اسی عمل سنت انبیاء اور طریق اولیاء ہے، پھر وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مال و اولاد دنیا نہیں ہے جس کی شریعت میں مذمت ہے اور جو خدا کی رحمت سے دور ہے وہ غفلت کی زندگی ہے، وہ فرماتے ہیں:-

شیر گفت آئے ولیکن ہمہ بسیں جہد ہائے انبیاء و مرسلین
 حق تعالیٰ جہد شان را راست کرد انچہ دیدند از جفا و گرم و سرد
 جہد می کن تا توانی اے کیا در طریق انبیاء و اولیاء
 چسیت دنیا از خدا غافل بدن نے قماش و فقرہ فرزند وزن

مال را گر بہر دین باشی محمول نعم مال صالح گفت آل رسول
جہد حق است و دوا حق است در منکر اندر نفی جہدش جہد کرد

وہ صرف اپنے زمانہ کے عوام ہی پر تنقید نہیں کرتے، اور صرف ان غلطیوں ہی پر نہیں ٹوکتے جن کا تعلق علمی اور دینی حلقوں سے ہے، بلکہ وہ پوری جرأت کے ساتھ اس طبقہ کی بھی تنقید کرتے ہیں جن کے ہاتھ میں زمام حکومت تھی، وہ بر ملا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اور بازیچہ اطفال بن گئی ہے، مطلق العنان شخصی سلطنت کے زمانہ میں یہ تنقید بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے، مگر مولانا کی حق گو زبان خاموش نہیں رہتی، وہ فرماتے ہیں:-

حکم چوں بردست زنداں افتاد لاجرم ذوالنون بزندان اُفتاد

چوں قلم دردست غدارے بود لاجرم منصور بردارے بود

چوں سفیہاں را بود کار و کیا لازم آمد یقتلوا الانبیاء

حکومت کے غلط ہاتھوں میں ہونے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے اپنے زمانہ کی شکایت فرماتے ہیں:-

حکم چوں دردست گمراہے بود جاہ پندارید و در جاہے فتاد

احقان سردر شد سست و زبیم عاقلان سراکشیدہ در گلیم

عقائد و علم کلام

مولانا نے عقلیات و حیات پر صرف تنقید اور اپنے زمانہ کے علم کلام کی بے اعتدالی، ظاہر پرستی اور لفظی معرکہ آرائی پر گرفت ہی نہیں کی، اور صرف باطنی احساسات و وجدان اور روح سے کام لینے اور عشق کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کلامی مسائل و مشکلات کو اپنے مخصوص انداز سے حل کرنے

اور اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرنے اور بدل نشیں کرنے کی کوشش بھی کی ہے، گویا مولانا کی دعوت اور ان کا فلسفہ صرف سلبی اور ناقہ اندہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایجابی اور علمانہ بھی ہے، جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو شل ہو کر رہ گئے ہیں، اور جن گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑ گئی ہیں، مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی، اور وہ بدیہی حقائق اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں اور واقعات ہیں، مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضامندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، اور مخاطب کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اس کے دل میں تھی، اور مولانا نے اس کی ترجمانی کی ہے، اس طرز کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ مثنوی سے دینی اصول و عقائد اور حکمانہ مسائل و مباحث کے بارہ میں ایسا اذعان، شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے، جو علم کلام کے پورے کتب خانہ سے نہیں پیدا ہوتا اس کے ساتھ ساتھ ایک ذوق و سرور بھی پیدا ہوتا ہے، جو ایک صاحب یقین اور صاحب عشق ہی کے کلام سے پیدا ہو سکتا ہے۔

مولانا اگرچہ اشعری مکتب خیال کے ایک کہنہ مشق استاد اور متبحر عالم ہیں، مگر وہ اپنے ذاتی تجربہ اور موہبت ربانی سے عقائد و کلام میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک نئے علم کلام کے بانی ہیں ان کی روش عام متکلمین اور علمائے عقائد سے بالکل علیحدہ ہے، اور نسبتاً قرآن مجید کے طرز استدلال اور فطرت سلیم سے زیادہ قریب ہے۔

وجود باری

وجود باری کا مسئلہ علم کلام اور تمام مذاہب کا معرکہ الآراء اور بنیادی مسئلہ ہے، قدیم علم کلام نے

اس کے جو دلائل دیئے ہیں، وہ محض منطقی ہیں، ان سے اذعان اور یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، زیادہ سے

زیادہ آدمی لاجواب ہو کر رہ جاتا ہے، قرآن مجید کا طرز یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں انسان کی فطرتِ سلیم کو اکساتا ہے، اور اس پر اظہارِ اعتماد کر کے اس کے سولے ہوئے احساس کو بیدار کر دیتا ہے، وہ پیغمبر کی زبان سے بے ساختہ کہلواتا ہے۔

إِنِّي إِلَهِ شَلَفَ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ بھلا اللہ کے بارہ میں بھی شک ہو سکتا ہے جو آسمان

(ابراہیم - ۱۰) زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اس بیباختگی اور استعجاب سے انسان کی فطرت چونک پڑتی ہے، اور وہ اپنا صحیح کام کرنے لگتی ہے، پھر زمین و آسمان کی پیدائش سے پیدا کرنے والے مصنوعات سے صالح اور آثار سے موثر کی طرف دفعۃً رہبری ہو جاتی ہے، سارے قرآن مجید میں یہی طرز استدلال ملے گا کہ اللہ کی نشانیاں دیکھو، اور مخلوقات سے خالق، اور مصنوعات سے صالح تک پہنچو، قرآن کے نزدیک خدا کی معرفت کا یہی یقینی، مختصر اور بے خطر راستہ ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ
حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۖ وَأَوَّلُهُمْ يُكَفِّرُ
بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

اب ہم دکھلائیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں
اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے
ان پر کہ یہ ٹھیک ہے، کیا تیرا رب تھوڑا ہے ہر چیز

(ہم السجدہ ۵۳) پر گواہ ہونے کے لئے۔

مولانا نے بھی ثنوی میں یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے، وہ جا بجا کائنات سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن کرنے والا ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا، مگر جو کچھ ہو رہا ہے، یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس پردہ کے پیچھے کوئی کرنے والا ہے، لیکن فعل ظاہر اور فاعل مخفی ہے۔

دست پہنان و قلم بین خط گزار
اسپ در جولان و ناپید اسوار

تیر پیدا میں ونا پیدا کسان جاتہا پیدا و پنہاں جان جان^۱
لیکن حرکت خود محرک کے وجود کی دلیل ہے، اگر کہیں ہو اکی سننا ہٹ ہے تو سمجھ لو کہ ہوا کا چلانے
والا بھی ہے۔

باد اور دیدی کہ می جنبہ بدان باد جنبہ نیست اینجا باداران
پس یقین در عقل ہر دانندہ ہست اس کہ با جنبیدہ جنبانندہ ہست^۲
اگر تھیں موثر نظر نہیں آتا تو آثار تو نظر آتے ہیں ان آثار سے سمجھ لو کہ موثر ضرور ہے جسم میں حرکت و
زندگی روح سے ہے، روح اگرچہ نظر نہیں آتی، مگر جسم کی حرکت اس کا ثبوت ہے۔

گر تو اور امی نہ بینی در نظر فہم کن آن را با ظہار اثر
تن بجان جنبہ نمی بینی تو جان یک از جنبیدن تن جان بدان^۳
موثر کے لئے اس کے آثار اور صانع کے لئے اس کے مصنوعات سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟
آفتاب کے وجود کے لئے اس کی روشنی سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہے؟

خود نباشد آفتابے را دلیل جز کہ نور آفتاب مستطیل^۴

پھر کائنات صرف موجود ہی نہیں ہے، بلکہ منظم، باقاعدہ اور مرتب ہے، ہر چیز اپنے چوکھٹے میں جڑی
ہوئی ہے، سیاروں کی گردش کا ایک نظام ہے آفتاب و ماہتاب کے لئے بھی اصول و ضوابط ہیں،
ابرو باد بھی پیل بے زنجیر نہیں کہ جدھر کو چاہیں، اُدھر کو چل دیں، ان کے لئے بھی تازیانہ مقرر ہے، اگر ذرا
سرتابی کریں، فوراً گوشمالی کی جائے، یہ نظام و ترتیب صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کے
اوپر کائنات کا خالق اور مدبر ہے، اور وہ حکیم و علیم بھی ہے، اور کائنات اس کے اختیار و انتظام سے
کسی وقت خارج نہیں۔

گر نمی بینی تو تدبیر تدبیر در عناصر، گردش و جوشش نگر
آفتاب و ماه دو گاه و خراس گرد می کردند و می دارند پاس
اختران ہم خانہ خانہ می روند مرکب ہر نفس و سعدے می شوند
ابرار ہم تازیانہ آتشیں می زند کہ ہاں چنین رونے چنین
برفلان وادی بار ایں سو بار گوشمالش می دہد کہ گوش دار

پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کو خالق کائنات نے اپنے فائدہ کے لئے نہیں پیدا کیا، بلکہ انسان کے فائدہ اور اس کی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے، اس طرح وہ خلق عالم کی مصلحت کو جس میں فلاسفہ و متکلمین سرگرداں ہیں، بڑے دل نشین پیرایہ میں بیان کرتے ہیں، اس میں بھی ان کا البیلاپن اور سرور ممتی موجود ہے۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است قصد من از خلق احسان بودہ است
آفریدم تا ز من سودے کنند تا ز شہدم دست آوے کنند
نے برائے آں کہ من سودے کنم در برہنہ من قباے برکنم
من نہ کردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگاں جو دے کنم

نبوت اور انبیاء

انبیاء علیہم السلام کا تعارف وہ خود ان کی زبان سے کرتے ہیں، اور بتلاتے ہیں کہ وہ طیبیان الہی اور معالجین قلوب ہیں، طیب نبض سے دل تک پہنچتے ہیں، انبیاء براہ راست دل تک پہنچ جاتے ہیں، طیبیوں نے صحت جسمانی کے بقا، اور انبیاء، دلوں کی شفا اور اخلاق و اعمال کی اصلاح اور اعتدال پر توجہ دی ہے۔

ماطیبیانیم شاگردان حق بحر قلزم دید ما را فانطلق

آن طبیبان طبیعت دیگر اند کہ بدل از نبضه بنگرند
 مابدل بیواسطه خوش بنگریم کہ فراست مابہ اعلیٰ منظریم
 آن طبیبان غذا نیند و شمار جان حیوانی بدیشاں استوار
 آن طبیبان فعالیت و مقال ملہم ما پر تو نور جلال
 کایں چنین فعلے تر انافع بود واں چناں فعلے زردہ قاطع شود
 ایں چنین قولے ترا پیش آورد واں چناں قولے ترا پیش آورد
 آن چناں و ایں چناں ازینکہ بد پیش تو بنیم و بنایم جد
 آن طبیبان را بود بوسے دلیل ویں دلیل ما بود وحی جلیصل

دلائل نبوت میں بھی وہ عقلی دلائل و مقدمات سے استدلال کرنے کے بجائے عموماً ذاتی اور وجدانی دلائل سے استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی ہر ادائیگی ہے کہ وہ پیغمبر ہے، وہ سرتاپا اعجاز ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لئے (بشرطیکہ ان میں عناد اور تکبر نہ ہو) وہ خود اپنی نبوت کا دلیل ہوتا ہے، یہی وہ چیز ہے کہ عبداللہ بن سلامؓ نے جمال جہان آرا پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ فرمایا تھا۔

وَ اَحَلَّ هَذَا لِيْسَ بَعْضُ كَذَابٍ بخدایہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔

درد دل ہر کس کہ دانش را مرہ است رود آواز پیغمبر معجزہ است

وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اور امت کے ضمیر میں ایک ایسی مناسبت ہوتی ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے، امت کا ضمیر اس پر آمنا و صدقاً ہی پکارتا ہے، امت کا ضمیر پیغمبر کی ہر صدا پر وجد کرتا ہے اس لئے کہ وہ صدایسی و لکش، ایسی محصوم اور دنیا میں ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ اس میں اور کسی صدا اور دعوت میں کوئی مناسبت اور کسی اشتباہ کا موقع نہیں، فرماتے ہیں۔

چوں پیمبر از بروں بانگے زند جان امت در دروں سجدہ کند
زانکہ جنس بانگ او اندر جہان از کسے نشیندہ باشد گوش جان
آن غریب از ذوق آواز غریب از زبان حق شنود آتی قریبے

وہ کہتے ہیں کہ سننے والوں کو پیغمبر کی صداقت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ان کا کہنا دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی اور نظام عالم اسی پر قائم ہے، پیاسے کو (بشرطیکہ سچی پیاس ہو) پانی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ پانی کا ثبوت نہیں مانگتا، بچہ کو ماں دودھ پلانا چاہتی ہے تو وہ دلیل کا انتظار نہیں کرتا طلب اور محبت اعتماد اور پیش قدمی کے لئے کافی ہے۔

نشہ را چوں بگوئی تو شتاب در قدح آب است بستان زود آب
ہیچ گوید نشہ کیوں دعویٰ است رد از برم اے مدعی! مہجور شو
یا بطل شیر مادر بانگ زد کہ بیان مادر مہاں لے ولد
طفل گوید مادر ارجحت بیار تاکہ با شیرت بگیرم من قرار

ان کے نزدیک معجزہ موجب ایمان نہیں ہے، یعنی ضروری نہیں کہ معجزہ دیکھنے والا ایمان لے ہی آئے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ معجزہ دیکھ کر ایمان لانے والوں کے نام سیرت میں مشکل سے ملیں گے، مشاہیر صحابہ وہی ہیں جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ایمان لائے تھے اور اصل ایمان ان ہی کا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ معجزات تو مغلوب اور لا جواب کرنے کے لئے ہیں اور جو مغلوب ولا جواب ہوتا ہے، وہ مشکل سے یارِ غار اور جان نثار بنتا ہے، اصل کشمکش اور تسخیر کی چیز جنسیت اور مناسبت ہے۔

موجب ایمان نباشد معجزات بولے جنسیت کند جذب صفات

معجزات از ہر قہر دشمن است بوئے جنسیت سوسے دل بردن است
قہر گرد، دشمن، انا دوست نے دوست کے گرد بہتہ گردنے

انبیاء کے تذکرہ میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے غیور اور خوددار ہوتے ہیں، ان سے استفادہ کے لئے ادب اور نیاز مندی شرط ہے، وہ سلطان مزاج ہیں، ان کا منصب یہ ہے کہ وہ فرمائیں اور دوسرے سنیں، معارضہ اور مجادلہ محرومی کا باعث اور حجاب اکبر ہے۔

گر ہزاراں طالب اندو یک ملول از رسالت بازمی ماند رسول
ایں رسولان ضمیر را ز گو مستمع خواہند اسرافیل خو
نخوتے دازند و کبرے چون شہان چاکری خواہند از اہل جہان
تا ادبہا شان بجاگ نادری از رسالت شان چگونہ بر خوری

فرماتے ہیں کہ اور ایسا کیوں نہ ہو یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کہاں سے آئے ہیں، اور کس کا پیام لائے ہیں۔
ہر ادب شان کے ہی آید پسند کا مددیشان ز ایوان بلند

معاد

مولانا کے نزدیک موت حقیقی زندگی کا پیش خیمہ اور انسان کی ترقی کا زینہ ہے، آبادی ویرانی کے بغیر ممکن نہیں، خزانہ جب ہی دستیاب ہوتا ہے، جب زمین کھودی جاتی ہے، جب بنے ہوئے مکان کو ویران کیا جا رہا ہو تو سمجھ لو کہ دوبارہ آباد کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

شاہ جان جسم را ویران کند بعد ویرانیش آبادان کند
کرد ویران خانہ بہر گنج وزر وز ہمان گنجش کند معمور تر

اس جسم خاکی کی شکست ایک بڑی تعمیر کی علامت ہے، کلی کے چٹکنے سے سمجھ لینا چاہئے کہ پھل آنے والے ہیں۔

چون شگوفہ ریخت میوہ سر کند چونکہ تن بشکست جان سر بر کند
وہ جو اذمطلق، وہ فیاض برحق، جان جیسی دولت دے کر کیسے بالکل چھین لے گا، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ وہ زار و نزار جان لے کر زندگی جاوداں عطا فرمانا چاہتا ہے، وہ اس خاکدان سے نکال کر وہ نعمتیں عطا فرمانا چاہتا ہے، جو وہم و خیال میں بھی نہیں: مَا لَآعِیْنَ لَأْتُ وَلَا اِذْنَ سَمِعْتُ، وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبٍ بِشَرٍّ

آں کسے اکثر کہ جنیں شاہے کشد سوئے تخت و بہترین جاہے کشد
نیم جان بستاند و صد جان دہد انچہ درد ہمت نیاید آن دہد
ترقی کے مدارج عالیہ کے لئے فنا اور نیستی ضروری ہے، کبھی کسی نے اگلی تختی دھوئے اور پرانے نقش مٹائے بغیر تختی لکھی ہے؟ کبھی مٹی نکالے بغیر زمین کے اندر سے پانی نکلا ہے؟ لکھنے کے لئے آدمی سادہ کاغذ اور بونے کے لئے آدمی خالی زمین ڈھونڈتا ہے۔

روح را اول بشوید بے وقوف آنگہ بروے نوید او حروف
وقتِ شستنِ لوح را بایدِ شناخت کہ مر آن را دفترے خواہندِ خست
چون اساسِ خانہٗ تو افکند اولین بنیاد را بر می کنند
گل بر آرد اول از قعرِ زمین تا بآخر بر کشی ما، معینؑ
کاغذے جوید کہ آن بوفتہ نیست تم کار دمو ضعی کہ کشتہ نیست
نیستی ہی نیستی کا استحقاق پیدا کرتی ہے، اور خالق کی رحمت کو جوش میں لاتا ہے، نعم

ہمیشہ فقیروں ہی پر سخاوت کرتے ہیں۔

ہستی اندر نیستی بنو اں نمود مالداران بر فقیر آرد بود
تم خود اپنی حالت پر غور کرو، تم برابر ارتقا کے منازل طے کرتے آئے ہو، اور ٹوٹ پھوٹ، کا
سلسلہ برابر جاری رہا ہے، تم نے ایک جامہ ہستی اتارا، دوسرا پہنا، ایک فنا سے تم نے بقا حاصل
کیا، اگر تم پہلی حالت پر رہتے، تو تم کو یہ ترقی و کمال کہاں سے حاصل ہوتا، اور تم آب و گل میں مقید رہتے،
اب آخری ترقی سے کیوں گھبراتے ہو، اور تمہارا طائر روح قفسِ غصہ سے نکلے ہوئے کیوں ڈرتا ہے۔

تو از ان روزے کہ در ہست آمدی آتش یا خاک یا بادے بُدی
گر بدان حالت ترا بودے بقا کہ رسیدے مر ترا پس ارتقا
از مبدل ہستی، اول نمائند ہستی دیگر بجائے اُوفتائند
ایں بقا ہا از فنا یا فستی از فنایش رو چہ ابر تافتی
ایں فنا ہا چہ زیان بودت کہ تا بر بقا چسبیدہ اے بے تو اے

اس لئے دراصل موت، موت نہیں زندگی کی تنہید ہے، اور مرنے کا دن مومن کے لئے شامِ غم
نہیں صبحِ عید ہے۔

آزمودم مرگِ من در زندگی است چون رہم زین زندگی یا بندگیست
عارفوں کی موت کو عامیوں کی موت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، ان کو اس جہانِ فانی سے
چھوٹنے کا غم نہیں ہوتا، موت ان کے لئے مژدہِ جانفزا، اور موت کا جھونکا ان کے حق میں بادِ بہاری
بن کر آتا ہے، قومِ عاد پر جو ہوا چلائی گئی تھی، وہ حضرت ہودؑ اور ان کے ساتھیوں کے لئے نسیم بن گئی تھی۔
ہودؑ گر دموناں خطے کشید نرم می شد باد کا نجامی رسید

ہمچنین باد اجل باعارفان نرم و خوش ہنچو نسیم بوستان

جبر و اختیار

جبر و اختیار کی بحث علم کلام کی مشکل ترین بحثوں میں سے ہے، ایک فرقہ اختیار کا منکر اور جبر محض کا قائل ہے، اور عقائد و فرق کی تاریخ میں جبریہ کے لقب سے مشہور ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبور محض ہو، تو وہ خدا کی طرف سے امر و نہی کا مخاطب کیوں بنتا، اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے، کیا کسی نے کسی پیچھے کو بھی حکم دیتے سنا ہے۔

جبر لیس گوید کہ امر و نہی راست اختیارے نیست، دین جملہ خطا است
جملہ قرآن امر و نہی است و عید امر کردن سنگ مرمر را کہ دید

فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور وہ روزمرہ کی زندگی میں اس عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے، کسی پرچھت کی لکڑی گر جاتی ہے تو اس کو چھت پر غصہ نہیں آتا، سیلاب سامان بہا لے جاتا ہے، تو کسی کو اس پر غصہ اتارتے نہیں دیکھا گیا، ہوا کسی کی پگڑی اڑا لے جاتی ہے، تو کوئی ہوا سے نہیں لڑتا، سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور و بے قصور ہیں، البتہ انسان کے ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں، گویا صرف وہی صاحب اختیار ہے۔

گر ز سقف خانہ چوبے بشکند بر تو افتد سخت مجروحیت کند
بیچ خشم آیدت بر چوب سقف بیچ اندر کین او باشی تو وقت
کہ چرا بر من زد و دستم شکست با چرا بر من فتاد و در دست
واں کہ قصد عورت تو می کند صد ہزاراں خشم از تو سرزند

در بیاید سیل رخت تو برد
ہیچ با سیل آورد گیتی خود
گر بیاید باد و دستارت رلود
کے ترا بادا، دل خستے نمود
خشم در تو شد بیان اختیار
تا نہ گوئی جبریانہ اعتذار

وہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرماتے ہیں کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلہ سے فطری طور پر واقف ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ آلات و جمادات کا کچھ تصور نہیں کتے کو بھی اگر پتھر مارا جائے تو وہ پتھر پر نہیں پکیتا، بلکہ انسان کے پیچھے دوڑتا ہے، شتر بان اونٹ کو مارتا ہے تو اونٹ کو لکڑی پر غصہ نہیں آتا، شتر بان سے انتقام لینا چاہتا ہے، جب حیوان تک اس حقیقت سے واقف ہیں تو انسان کو جبری بننے سے شرم آنی چاہئے۔

ہمچنین گر برسگے سنگے زنی
بر تو آرد رود گرد و منثنی
گر شتر بان شترے رامی زند
اں شتر قصد زندہ می کند
خشم اشتر نیست با آن چوپا و
پس ز مختاری، شتر بردہ است بو
عقل حیوانی چو دانست اختیار
ایں گواے عقل انسان شرم دار
روشن است ایں لیکل ز طعم سحر
اں خوردند چشم بر بند ز نور
چونکہ کلی میل آن نان خورد نیست
رو بہ تاریکی کند کہ روز نیست

علت و معلول

اسباب و علل کے بارہ میں اسلامی فرقوں میں بڑی افراط و تفریط تھی، حکماء کے نزدیک کائنات میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے، اور طول کبھی علت، مسبب کبھی سبب متخلف نہیں ہو سکتا، معتزلہ بھی اس رائے سے بڑی حد تک متاثر ہیں، ان کا بھی رجحان یہی ہے کہ جو چیز جس کی علت مان لی گئی، جس شے کا

جو خاصہ اور اثر تسلیم کر لیا گیا، اس میں تغیر و انقلاب کا بہت کم امکان ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بڑی مشکل سے خرق عادت کا وجود تسلیم کرتے ہیں، اور کسی شئی کے اپنے خاصہ کے خلاف وقوع پذیر ہونے اور کسی حادثہ کے بغیر سبب کے وجود میں آنے کو بہت بعید سمجھتے ہیں، اشاعرہ دوسرے سرے پر ہیں، ان کے نزدیک کوئی چیز کسی چیز کی علت نہیں، نہ کسی شئی میں کوئی خاصہ اور تاثر ہے، اس بے اعتدالی اور انتہا پسندی سے بھی نقصان پہنچا، اور ہر شخص کو ہر بات کہنے اور اسباب کے انکار و ترک کا بہانہ مل گیا، اور اس سے ایک بے نظمی اور تعطل پیدا ہوا۔

مولانا کا مسلک ان دونوں سروں کے درمیان ہے، وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسباب کی ایک حقیقت ہے، اور علل و معلومات، اسباب و مسببات کا ایک سلسلہ ہے جس کا انکار نہ ممکن ہے، نہ معقول، عام سنتہ الشریعہ ہے کہ مسببات اسباب کے تابع ہوں، اور اشیاء سے ان کے خواص برآمد ہوں، البتہ خرق عادت ممکن ہے، اور کبھی کبھی اس کا وقوع ہوتا ہے، فرماتے ہیں:-

بیشتر احوال بر سنت رود گاہ قدرت خارق سنت شود
سنت و عادت نہادہ بامزہ باز کردہ خرق عادت معجزہ
بے سبب گر عزت باموصول نیست قدرت از عزل سبب معزول نیست
عام لوگ نہی اسباب کو دیکھتے ہیں، اور معذور ہیں کہ ان کو کچھ اور نظر نہیں آتا:-
حاصل آنکہ در سبب پیچیدہ یک معذوری ہمیں را دیدہ ^{علم}

فرماتے ہیں کہ بیشک قطع اسباب مناسب نہیں، اسباب کی ایک حقیقت ہے، لیکن سبب الاسباب اس سے بھی بالاتر حقیقت ہے، وہ سبب الاسباب رب الاسباب اور قادر مطلق ہے، اس طرح اسباب پرستی نہ کرنے لگو، کیا قدر مطلق کو بالکل معزول و معطل سمجھنے لگو۔

اے گرفتارِ سبب بروں میرے یک عزلِ آن سبب ظنِ میرے
ہرچہ خواہد آن سبب آورد قدرتِ مطلق سببہا بردارد

یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اسباب صرف وہی نہیں ہیں جو ہمارے علم اور مشاہدہ میں ہیں، بلکہ ان اسبابِ ظاہری سے اوپر کچھ اسباب اور ہیں، جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں، یہ اسباب باطنی ان اسبابِ ظاہری کے لئے اس طرح سے سبب اور محرک ہیں جس طرح یہ اسبابِ ظاہری مسببات و نتائج کے لئے سببِ حقیقی اسبابِ ظاہری کو کبھی متحرک و عامل کر دیتا ہے، اور کبھی بیکار و معطل کر کے رکھ دیتا ہے، سببِ اعلیٰ اور اصل سبب ارادۃ الہی اور امر الہی ہے۔

سنگ بر آہن زنی آتش جہد ہم با مرحق قدم بیروں نہد
سنگ و آہن خود سبب آمد و یک تو بالا تر نگر اے مردِ نیک
کایں سبب را آن سببِ آردیش بے سبب کے شد سبب ہرگز بخویش
ایں سبب را آن سببِ عامل کند باز گاہے بے پردِ عاقل کند

ہم جس طرح ان اسبابِ ظاہری کو جانتے پہچانتے ہیں، انبیائے کرام ان اسبابِ حقیقی کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

واں سبب ہا کا بنیاد را رہبر است آن سببہا زین سببہا برتر است
ایں سبب را محرم آمد عقل ما واں سببہا را مستحرم انبیاء

وہ اسبابِ حقیقی اسبابِ ظاہری کے حاکم اور اُن پر غالب ہیں۔

ہست بر اسباب اسبابِ دگر در سببِ منکر و راں انگن نظر

یہ اسبابِ ظاہری اسبابِ حقیقی کے سامنے بہت حقیر و ضعیف ہیں، معاملہ حقیقی اسبابِ ہی سے وابستہ ہے

ایں سبب ہچو مرئیں است و علیل
ایں سبب ہچو چراغ است و قلیل
شب چراغت را قلیلے تو بتاب
پاک دان زینہا چراغ آفتاب

انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں چونکہ ساری دنیا اسباب ظاہری میں الجھی ہوتی ہے، اور اسباب پرستی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے، خالق اسباب اور اس کی قدرت مطلقہ بالکل نگاہوں سے اوجھل اور ماحضوں سے محو ہو چکی ہوتی ہے، اور عالم کا عالم شرک اور ظواہر و مظاہر پرستی میں گرفتار ہوتا ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام اسباب پر ضرب لگاتے ہیں، اور اسباب کے بجائے مسبب اور قادر مطلق کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہاتھوں سے سلسلہ اسباب کے بالکل خلاف واقعات ظاہر کر کے اور معجزات دکھا کر اسباب کی بے حقیقتی اور کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند
مہجراتِ خولیش بر کیوان زدند
بے سبب بر بحر را بشکا فتند
بے زراعت چاش گندم یافتند
ریگیا ہم آرد شد از سعی شان
پشیم برابر شیم آمد کشکشان
جملہ قرآن است در قطع سبب
عز درویش و ہلاک بولہب

لیکن اللہ تعالیٰ کی عمومی عادت اور سنت جاریہ اسباب سے مسببات کا وجود ہے، اور اس سے بندوں کو سعی و تعلیم مقصود ہے۔

لیک غلب بر سبب را ند نفاذ
تا بد اند طایبے جستن مراد

اسی انداز پر مولانا ان تمام کلامی مسائل اور مذہب کے اصول و عقائد کی تشریح اور تلقین کرتے چلے جاتے ہیں، جن کو متکلمین و اشاعرہ کے مناظرانہ طرز استدلال اور فلاسفہ کی طلسم آرائی نے چیتان او نہایت خشک اور محدود موضوع بحث بنا دیا تھا، مولانا نے ان مباحث و حقائق کو علم کلام اور فلسفہ

کے تنگ کوچے سے نکال کر عام فہم اور عقل سلیم کے وسیع آفاق میں لے جا کر بحث کی، اور دل نشین مثالوں، عام فہم نکتوں اور سادہ و موثر طرز بیان سے ان کو روزمرہ کی حقیقت اور زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

ثنوی کا اثر

ثنوی نے عالم اسلام کے افکار و ادبیات پر بڑا گہرا اور دیر پا اثر ڈالا اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں ملیں گی، جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقے کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے، چھ صدیوں سے مسلسل دنیاۓ اسلام کے عقلی، علمی، ادبی حلقے، اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں، اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے، اس سے ہر دور میں شاعروں کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا، اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتی رہی، معلمین و متعلمین کو اپنے زمانہ کے سوالات و شبہات کو حل کرنے کے لئے اس سے نئے نئے دلائل، دل نشین مثالیں، دلائل و حجتیں، اور جواب کی نئی نئی راہیں ملتی رہیں، اور وہ اس کے سہارے اپنے زمانہ کی بے چین طبیعتوں اور ذہین نوجوانوں کو مطمئن کرتے رہے، اہل سلوک و معرفت کو اس سے عارفانہ مضامین، دقیق و عمیق علوم اور سب سے بڑھ کر محبت کا پیغام اور سوز و گداز اور جذب و مستی کا سامان ملتا رہا، اور وہ ان کی خلوتوں اور انجمنوں کو صدیوں تڑپاتی، اور گرماتی رہی، اس لئے ہر دور کے اہل محبت اور اہل معرفت نے اس کو شمع محفل اور تہجانِ دل بنا کر رکھا۔

اس کے مضامین کی ستر تنقید سے بالاتر اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے مبرا انہیں بہت سے قاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہونہی نے اس سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھایا ہے، وحدت وجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لئے دلائل و شواہد مل جاتے ہیں، وہ بہر حال ایک

انسان کا کلام ہے، جو محصور نہ تھا، اور جس کے مضامین میں اس کے قلبی واردات اور خارجی تاثرات کو بھی دخل ہے، اس سب کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا علمی کارنامہ اور اسلام کی عقلی برتری اور اس کی غیر فانی زندگی کا ثبوت ہے، اس نے عالم اسلام کے فکری تعطل، علمی و ادبی جہود، اور تقلیدی ادب و علم کلام پر کاری ضرب لگائی، اور اسلام کے کاروان فکر کو جو ساتویں صدی میں آمادہ قیام اور مائل بہ آرام تھا، دوبارہ متحرک و سرگرم سفر کر دیا۔

اس کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر دوبارہ اہمیت و حیثیت کا حملہ ہوا، اور یورپ کے نئے فلسفہ اور سائنس نے قلوب میں شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی، اور ایمانیات و غیبات کی طرف سے ایک عام بے اعتمادی پیدا ہونے لگی، اس کا رجحان بڑھنے لگا کہ ہر وہ چیز جو مشاہدہ و تجربہ کے ماتحت نہ آ سکے، اور جو اس ظاہری اس کی گرفت نہ کر سکیں، وہ موجود نہیں، عقائد کی قدیم کتابوں اور قدیم طرز استدلال و علم کلام نے اس کا مقابلہ کرنے سے معذوری ظاہر کی تو مثنوی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا (جو یورپ کی مادی و سیاسی فتوحات سے کم خطرناک نہ تھا) کامیاب مقابلہ کیا، اور دلوں میں دوبارہ دینی و غیبی حقائق کی وقعت، علوم انبیاء کی عظمت، عالم غیب کی وسعت، اور قلب و روح، ایمان و وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کر دیا، اور فلسفہ و مادیت کے صدام باز خم خوردہ نوجوانوں اور فاضلوں کو جو ایجاد و ازداد کے دروازہ پر کھڑے تھے، یا ایمان و اسلام کی سرحد عبور کر چکے تھے، دوبارہ ایمان و یقین کی دولت عطا کی، ہندوستان میں ان اہل علم کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو مثنوی کی بدولت دوبارہ دولت اسلام نصیب ہوئی، اور وہ اس کے فیض سے مسلمان اور صاحب ایمان ہیں، بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان فکری اور فکری (ڈاکٹر سر محمد اقبال)

نے شیخ رومی کے فیض و ارشاد اور اپنے تلمذ و استر شاد کا جا بجا اعتراف کیا ہے اور اس کا بڑا اظہار کیا ہے کہ ثنوی نے ان کو ایک نئی روح اور ایک نیا جذبہ عطا کیا ایک جگہ فرماتے ہیں:-

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروان عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب خیمہ را از کہکشان ساز و طناب
نور قرآن در میان سینہ اش جام جم شرمندہ از آئینہ اش
از نئے آں نے نواز پاک زاد باز شورے در نہاد من قنادر
دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

رومی آن عشق و محبت را دلیل تشنہ کا مان را کلامش سلسبیل

لیکن اس کے ساتھ وہ شکایت اور احتجاج کرتے ہیں کہ ایک طبقہ نے اپنی نظر اس کے الفاظ اور ظاہری مطالب میں محدود رکھی اور اس کو جاں گدازی اور دل سوزی کے بجائے رقص و وجد کا ذریعہ بنایا۔

شرح او کردند اور اکس ندید معنی او چوں غزال از ما رسید
رقص تن از حرف او آموختند چشم را از رقص جان برد و خفتند

لیکن یہ نقص ہمارا ہے، ثنوی کا نہیں، ثنوی اس دور انقلاب میں بھی رفیقِ راہ بن سکتا ہے اس مادہ پرست دور کی سب سے زیادہ نایاب جنس سوز و گداز اور محبتِ پاک باز ہے:-

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیا کہ نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن پر کار و سخن ساز ہے مننا کہ نہیں ہے

یہ دولتِ بیدار ثنوی سے حاصل کی جاسکتی ہے، عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو وصیت کرتے ہوئے

فرماتے ہیں:-

پیر رومی را رفیقِ راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغرور اندازِ پوست پائے او محکم فتد در کئے دوست



INDEX

اَشَارِيہُ

(انڈکس: "نارتخ دعوتِ عربیت" حصہ اول)

مرتب

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

۹۹	ابراہیم بن مصعب	سیدنا نبینا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰، ۲۰، ۱۸
۹۵	ابراہیم بن مہدی	۹۷، ۵۵، ۴۶، ۵۴، ۴۵، ۴۴، ۴۰، ۳۹، ۳۷، ۳۱
۹۲	ابراہیم الحری	۱۸۱، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸
۹۹، ۹۷، ۱۸۵	ابن ابی داؤد	۲۶۶، ۲۶۱، ۲۳۸، ۲۲۳، ۲۱۹، ۲۱۷، ۲۱۱، ۱۸۵
۳۱۶-۳۱۳، ۲۵۸، ۲۵۶، ۷۱، ۵۲	ابن اثیر	۳۸۸، ۳۸۳، ۳۳۶، ۳۲۴، ۲۷۶، ۲۶۷
۷۴	ابن اسحاق	(الف)
۶۳	ابن الاثعث	سیدنا حضرت آدم علیہ السلام ۳۷، ۲۱، ۱۳
۳۳۰	ابن بطوطہ	سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام ۱۳۶، ۱۲۶
۲۲۷، ۲۰۱، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۴۵، ۱۱۹، ۵۱	(شیخ الاسلام) ابن تیمیہ	(حضرت) ابوبکر صدیقؓ ۳۳۸، ۱۰۱
۷۴	ابن جریر کئی	(ام المؤمنین حضرت) ام سلمہؓ ۵۵
۱۲۸، ۱۸۸، ۶۰، ۵۲، ۵۱، ۳۳	(عبدالرحمن) ابن ابی حزمی	(حضرت) ام عاصمہؓ ۳۴
۲۴۰، ۲۳۳، ۲۲۵-۲۷، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۰، ۱۸۳، ۱۴۷		(حضرت) ابن عباسؓ ۹۷
۲۵۷، ۲۵۰، ۲۴۷		(حضرت) ابوالیوب انصاریؓ ۲۶۱
۷۵	ابن حیوان	(حضرت) ابوموسیٰ اشعریؓ ۱۰۵
۷۱، ۶۹	ابن خلدون	ابراہیم بن ادہیم ۲۴۷
۲۲۴، ۱۷۷، ۱۱۶، ۱۱۱، ۱۰۶، ۷۱، ۶۷، ۳۳	ابن خلکان	ابراہیم بن عبداللہ ۶۸

ابن دقین العید

۲۸۷

ابن المرجم الظالم

۲۱۶

ابن الراوندی

۱۱۳

ابن السیب

۸۸

ابن رجب

۲۰۱-۳۰۱۹۸

ابن المقنع

۲۲۹

ابن رشد

۱۲۵

ابن ناصر (محدث)

۲۲۵

ابن البکی

۳۰۲، ۲۹۹، ۲۹۷، ۲۹۵، ۲۸۸

ابن بخار

۲۲۷، ۲۲۴، ۲۰۰

ابن سعد

۶۳، ۵۲

ابو اسحاق اسفرائینی

۱۱۶، ۱۰۸

ابن السمعانی

۲۰۲

ابو اسحاق شیرازی

۱۹۵، ۱۱۶

ابن سینا

۲۸۵

ابوبکر ابن العربی

۱۸۹

ابن شهاب زهری

۷۲

ابوبکر اسماعیلی

۱۱۲

ابن عبدالحکم

۴۵

ابوبکر باقلانی

۱۸۵، ۱۸۴، ۱۱۶، ۱۰۸

ابن عساکر دمشقی

۱۸۹، ۱۰۵

ابوبکر بن حزم

۴۰، ۱۳۹، ۳۶

ابن الحلقی (مؤیدالدین ابوطالب محمد)

۳۱۸، ۳۰۹، ۳۰۸

ابوبکر بن عیاش

۸۷

ابن الفارسی

۲۲۷

ابوبکر بن صیرفی

۱۱۲

ابن قدامه

۱۹۸، ۸۲

ابوبکر خلیل

۸۲

ابن قره ارسلان

۲۷۸

ابوبکر سلم باغ

۳۴۴

ابن قیم

۲۸۵

ابوبکر فریابی

۷۹، ۶۵

ابن کثیر

۳۰۷، ۳۰۵، ۲۱۵، ۲۰۷، ۲۰۶، ۱۹۷، ۱۸۸

ابوبکر محمد بن الطیب

۲۸۱

ابن ماجه

۸۰

ابو جعفر

۲۷۳

ابو حازم

۲۴۸

۱۰۰	ابوالعباس رقی	۷۵	ابوالحاکم رازی
۹۷	ابوعبد الرحمن شافعی	۱۳۱، ۱۱۹، ۱۱۱-۱۶، ۱۰۳-۹	(امام) ابوالحسن اشعری
۱۰۷	ابوعبد الشریف خفیف	۳۳۶، ۱۸۵، ۱۸۴	
۱۹۹	ابوعبد الشریف یوسف البرزالی	۱۰۸	ابوالحسن بابلی
۴۸، ۴۷، ۴۵	ابوالعرفان ندوی	۱۸۹	ابوالحسن بصری
۲۰۱، ۱۰۵	ابوعلی جبائی	۱۰۵	ابوالحسن ابجدائی
۱۹۱	ابوعلی فارمدی	۳۱۰	ابوالحسن خربرجی
۵۶	ابوعمر بن اعلیٰ	۲۹۹	ابوالحسن شاذلی
۳۱	ابوالفرج اصبهانی	۱۶، ۱۰	ابوالحسن علی ندوی
۱۹۵	ابوالقاسم ہروی	۱۱۴	ابوالحسین ہروی
۲۸۷	ابومحمد القاسم ابن عساکر	۱۵۵، ۱۵۴، ۸۲، ۸۱، ۶۸	(امام) ابوالخفیف
۲۳۰، ۷۷۹	ابوسلم خراسانی	۵۷	ابو حیان التوحیدی
۲۲۷	ابوالمنظف	۱۹۸	ابوالنخیر حماد
۱۳۰، ۱۱۷، ۱۱۷، ۱۱۷، ۱۳۰	(امام اکبرین) ابوالعالی عبدالملک جوینی	۸۰	(امام) ابوداؤد سجستانی
۲۲۴، ۱۸۹، ۱۴۷		۱۹۷، ۱۹۵	ابوزکریا تبریزی
۱۱۵، ۱۱۴	ابومنصور ماتریدی	۲۴۹	ابوسعید جبائی
۲۲۴	ابوالنجیب ہروردی	۱۹۸	ابوسعید مخزومی (مبارک بن علی)
۱۳۰	ابونصر اسماعیلی	۲۰۳	ابوسلیمان خطابی
۱۶۴	ابونصرتار	۱۳۴	ابوطالب کی

۲۱ اریٹ ڈی بنسن (ERUSET DE BUNSEN)

۷۶ اسپرنگر

۲۱ اشیفن

۹۵،۹۴،۹۲ اسحاق بن ابراہیم

۱۰۵ اسماعیل اشعری

۴۹ اسماعیل بن عبداللہ

۸۲ اشہب بن عبدالعزیز

۲۴ ایشوراٹوپا

۱۴۲ افلاطون

۳۵۵،۳۴۵ افلاکی

۳۹۸،۳۶۹،۳۶۱ علامہ (اقبال)

۲۸ اکبر

۱۱۶ اپ ارسلان — سلجوق

۳۰۶ امیرالشرابی

۳۱۹ امین

۳۱۳ انیل جت

۳۴۲ اوصد الدین کرمانی

۳۳۳ اوگتائی خان

۳۲۴ ایل خان

۱۲۱ ابونصر فارابی

۲۴۷،۷۲،۴۰ ابونعیم اصبہانی

۱۹۷،۱۹۵ ابوالوفا ابن العقیل

۲۱۶ ابوالوفا یحییٰ بن سعید

۸۷،۸۲،۳۷ (امام) ابویوسف

۳۲۸ اتابک بہار الدین

۱۰۱ احمد بن ابراہیم دورق

۷۹ احمد بن جعفر

۸۶-۹۳، ۸۴، ۸۲، ۸۱، ۷۲ (امام) احمد بن حنبلؒ

۲۴۷، ۲۳۳، ۲۰۲، ۱۹۸، ۱۵۴، ۱۱۰، ۱۰۳، ۹۵-۱۰۱

۱۱۴ احمد بن علی فقہ

۱۸۸، ۱۸۷ احمد بن نظام الملک

۱۳۰ احمد الراذکانی

۱۹۰ احمد الغزالی

۳۲ اخطل

۱۲۵ (سیدنا) ادریس (باطنی امام)

۱۴۵، ۱۴۲، ۱۲۱، ۱۲۰ ارسطو

۳۲۹، ۳۲۴ ارغوخاں

۳۳۳، ۳۳۲، ۳۳۰، ۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۳ آرزلڈ

ایوب نجم الدین

۲۶۱

بلاذری

۴۹

(ب)

باب (بانی مذہب بانی)

۱۲۷

بودھ

۲۳-۲۵

باقا خان

۳۲۶

بوعلی ابن سینا

۱۲۱

یازید بسطامی

۲۴۱، ۱۳۴

بویطی (شافعی)

۸۲

(قاضی القضاة) بن جاور

۲۹۸

(قاضی) بہار الدین ابن شداد ۶۴-۲۶۶، ۲۶۶، ۲۶۷

(امام) بخاری

۱۰۱، ۹۴، ۷۹، ۷۸، ۷۵

۳۴۲، ۲۷۷-۸۱، ۲۷۴، ۲۷۳

بدالدین گوہر تاش

۳۴۱

(سید) بہار الدین ترندی

۳۵۵

بدیع الزماں فوزا نفر

۳۴۵، ۳۴۴، ۳۴۳، ۳۳۹

(شیخ) بہار الدین ذکریا ملتانی

۲۲۴

براق خان

۳۵۲-۵۴، ۳۴۹، ۳۳۱

(سید) بہار الدین رازی

۳۳۹

برک خان

۳۲۶، ۳۴۵

(سلطان) بہار الدین ولد ۳۴۹، ۳۴۵، ۳۴۱، ۳۳۹

(سید) برہان الدین

۳۵۲

۳۵۹، ۳۵۵، ۳۵۴، ۳۵۰

برہان الدین محقق ترندی

۳۴۱، ۳۳۸

(پ)

بزراری

۶۸

پاپائے روم

۳۱۱، ۲۷۰

بتانی

۳۱۴، ۵۷، ۵۶

پطرس (راہب)

۲۵۲

بشر بن حارث

۱۶۵، ۱۶۴

(ت) (ث)

بشر حانی

۲۴۷، ۲۴۱، ۲۳۱، ۱۷۲

تاتاری خاں

۳۲۵

بقراط

۱۴۲

تاج الدین بکی

۳۱۸

بلال بن ابی بردہ

۱۱۴

(قاضی القضاة) تاج الدین

۲۹۸

۳۳۱-۳۳	جمال الدین	۸۰	(امام) ترمذی
۲۸۸	جمال الدین حاجب	۱۳۱	ترکان خاتون
۱۷	جنید بغدادی	۳۳۱-۳۳	تغلق تیمور خاں
۱۳۴	جنید شبلی	۲۷۷	تقی الدین
۲۴	جو اہر لال نہرو	۳۲۹، ۳۲۶	نگو دار خاں
۳۲۵	جو جی خاں	۳۳۷	تلمذ حسین گورکھ پوری
۲۲	جے بیسولنگر (J. BASSMULLINGER)	۲۶۸	تکلیو
	(ج)	۲۹۸	(الملك المظلم) توران شاہ
۲۶۵	چائیلون	۳۳۰	(امیر) توڑون (نوروز بیگ)
۳۳۰-۳۲	چغتائی خاں	۳۳۷	توکل حسین
۳۶۱، ۳۵۹، ۳۵۶، ۳۵۵، ۳۵۳، ۳۱۹	چلی حسام الدین	۵۷	ثابت بن قرہ
۳۴۸	چلی علار الدین		(ج)
۳۲۲، ۳۲۰، ۳۲۳-۲۶، ۳۱۷، ۳۱۶، ۳۱۳، ۳۱۲	چنگیز خاں	۷۰	باحظا
	(ح)	۱۲۶	جبرئیل
۱۹۷	(حضرت) حسنؑ	۸۸	جویر بن عبد الحمید (محدث)
۶۸، ۳۳	(حضرت) حسینؑ	۹۵	جبر بن ولید
۲۱۳	(حضرت) حوّا	۳۴۳	جلال الدین حسن
۱۳۴	حارث محاسبی	۳۳۸، ۳۳۶، ۳۳۵، ۱۷۴	(مولانا) جلال الدین رومی
۲۸۵	حاکم باشر	۳۹۹، ۳۵۷، ۳۴۳، ۳۳۹	

حبیب الرحمن خاں شروانی

۷۶

سجاد بن یوسف

۶۳، ۵۶

حوارہ

۱۹۹

حسن بصریؒ

۲۴، ۶۵-۶۷، ۶۳، ۵۵-۵۷، ۵۳، ۵۱

حسن بن سہل

۷۰

حسن بن صباح اسماعیلی

۳۴۳

حسن بن ققطبہ

۶۸

حسن المثنیٰ

۳۳

حلاج

۲۴۹

حنبل بن ہلال

۸۶

حنین (مفتی)

۳۲

حوشب

۳۱

(خ)

(حضرت) خجابت

۱۰۰

خان انندا

۳۳۳

خطیب بغدادی

۱۱۵، ۷۲

(ذ) (ذ)

دیانند سرسوتی

۲۶

(حافظ) ذہبی

۱۱۳، ۹-۱۸۹، ۸۷، ۳۳

(س)

(امام) رازی

۳۳۹، ۳۳۵

راشد

۲۰۶

ربیع (شافعی)

۸۲

ربیع بن انس

۵۶

ربیع بن صلیح

۷۴

رجاء بن حیوہ

۳۵

رچرڈ

۲۶۹

رشید الدین

۳۳۲، ۳۲۹

رکن الدین بیرس

۳۲۶، ۳۲۵

رکن الدین سنجاسی

۳۴۴

(مولانا) روم

دیکھے

جلال الدین

(سز) رہس ڈائس (RHYS DAYIS)

۲۴

ریچی نالڈوالی کرک

۲۶۶، ۲۶۵، ۲۵۴

(ن)

(حضرت) زید بن ثابتؓ

۵۵

(امام) زفر

۸۲

(امام) زہری

۸۸

زید بن علی

۶۸

۳۸۷	سيف الدين آدمي	۳۴۴	زين الدين سنجاسي
۲۱۰۲۰	سينط پال	۱۸۸، ۱۸۳، ۱۴۷	زين الدين عراقی
۲۹۹، ۲۸۸	سيوطي	(س)	
(ش)		۳۳	سالم بن عبد الله
(امام) شافعي ۱۵۵/۱۵۴، ۹۷، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۲، ۸۱		۳۰۵	سالم حسين
۳۵۷، ۱۹۱، ۱۶۷، ۱۴۷، ۱۸۲، ۷۱	شبلې نعلانی	۳۵۸، ۳۵۷، ۳۵۵، ۳۳۷، ۳۳۵، ۳۳۲	سید سالار
۲۴۸	(شيخ) شبلي	۹۵	سجاده
۲۹۴	شرف الدين عبد اللطيف	۳۴۲	سعد الدين حموي
۲۲۲	شرف الدين عيسى	۳۱۹	(شيخ) سعدی
۲۳۵	(قاضی) شریح	۷۴	سعيد بن ابی عروب مدنی
۲۴۸	(قاضی) شریک	۵۵	سعيد بن جبير
۵۵	(امام) شجبي	۳۳	سعيد بن المسيب
۱۹۸	(امام) شعرائي	۲۴۷، ۱۵۴، ۷۱	سفيان ثوري
۳۶۱، ۳۵۵، ۳۵۴، ۳۴۳-۵۲	شمس الدين تبريزي	۱۴۲	سقراط
۳۶۱، ۲۶۰، ۲۵	شکر آچاريه	۳۷۴	سکندر
۳۰۵، ۲۸۸	شهاب الدين البوشامه	۲۸۸، ۱۵۳، ۵۰-۳۴-۳۶	سليمان بن عبد الملك
۲۹۹، ۲۲۴	شهاب الدين مهروردي	۷۶	(سيد) سليمان ندوي
۲۶۹	شيردل	۲۰۷، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۶۱، ۱۶۰	(سلطان) سنجر
۲۶۱	شيركوه اسد الدين	۳۲۵	سيرداد دارا

ص ض

۳۷۰۱۲۵۱۲۳۳۸۱۲۳۷۱۱۳۸

صالح اسماعیل

۲۹۲،۲۹۱

صالح بن امام احمد

۹۳

صدر الدین

۱۸۸

صدر الدین قنوی

۳۶۱،۳۵۶،۳۴۲

صدیق حسن خان

۲۲۴،۱۸۳

صلاح الدین الیوبی

۲۳۵۷۲،۲۶۱-۶۳،۲۵۶،۲۵۲

۲۴۲،۲۷۷،۳۰۴،۲۹۸،۲۸۵-۸۷،۲۸۳،۲۸۲

صلاح الدین ذرکوب

۳۶۱،۳۵۹،۳۵۱-۵۴،۳۴۵

صفاک بن عبدالرحمن

۴۱

ط

طاہر

۳۱۹

(امام) طہادی

۱۱۵

طہرین خان

۳۳۱

طیفند

۹۵

ظ

(الملک) الظاہر بربرس

۳۲۲،۳۰۲،۲۹۸

(الملک) الظاہر لا عزادین الشر

۳۰۶،۲۸۲،۲۷۶

ع

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام

۱۲۷،۲۱

(حضرت) عمرؓ

۳۵،۳۴

(حضرت) علیؓ

۳۳۸،۲۴۸،۱۲۶،۸۵

(ام المؤمنین حضرت) عائشہؓ

۲۱۲

(حضرت) عبداللہ بن مسعودؓ

۱۶۴

عارم البونان

۹۱،۹۰

عاصم بن علی

۷۹

عاصم بن عمر

۳۴

عاصد لدین اللہ

۲۸۳

عالمگیر اعظم

۳۰۴

(شیخ) عبد الجبار

۲۲۳

(قاضی) عبد الجبار

۲۸۱

عبدالرحمن بن اسحاق

۹۷

عبدالرحمن بن قاسم

۸۲

عبدالرحمن بن ہمدی

۸۷

(شیخ) عبدالرزاق

۲۲۲

عبدالرزاق بن ہمام

۸۸

عبد العزیز

۲۲۳

۳۴۲	عثمان رومی	۲۴۸	عبدالعزیز بن سلیمان
۹۹	عجیف	۲۸۸	عبدالعظیم المنذری
۳۳	عروه بن زبیر	۱۴۷، ۱۳۱	عبدالغافر فارسی
۲۸۷، ۲۰۱	(شیخ الاسلام) عبدالدین بن عبدالسلام	۳۰۶	عبدالحی بن فافرفراش
۳۰۴، ۳۰۲، ۲۹۷-۹۹، ۲۹۲-۹۴، ۲۸۸		۲۰۳، ۲۰۱، ۱۹۹، ۱۹۷، ۱۹۶	(شیخ) عبدالقادر جیلانی
۳۲۰، ۳۱	عکرمه	۲۲۰، ۲۰۷، ۲۰۶	
۳۰۶	علامه الدین الطبری الظاهری	۱۴۷	عبدالقادر حسنی
۳۴۱، ۳۴۰	علامه الدین کیقباد	۱۹۵	عبدالقادر جرجانی
۳۳۹، ۳۱۰-۱۴۰، ۳۰۳	علامه الدین محمد خوارزم شاه	۹۳	عبدالشتر بن امام احمد
۳۴۰		۳۴	عبدالشتر بن زبیر
۳۳، ۳۲	علی بن حسین (زین العابدین)	۳۸۷	عبدالشتر بن سلام
۱۰۱	علی بن مدینی	۸۲	عبدالشتر بن عبدالحکم
۱۹۱-۹۳	علی بن یوسف ناشقین	۱۵۶، ۷۱	عبدالشتر بن مبارک
۲۶۱، ۲۵۴	عماد الدین زنگی	۸۲	عبدالشتر بن وهب
۲۷۸	عماد الدین الکاتب	۳۳	عبدالشتر المحض
۱۸۹	عمر بن ابی الحسن رواسنی	۳۲	عبدالملک بن مروان
۳۹، ۳۴-۳۶، ۳۱	(حضرت) عمر بن عبدالعزیز	۲۲۲	(شیخ) عبدالوهاب
۲۵۸، ۲۴۸، ۲۴۷، ۱۹۷، ۷۴، ۴۸-۵۳، ۴۱، ۴۰		۱۹۳	عبد المؤمن
۲۰۱	عمر کیسانی	۲۸۱	عبید
۴۰	عمره بنت عبدالرحمن		

عنایت اللہ

۳۲۳، ۳۱۲، ۳۱۰

عوام بن حوشب

۶۶

(غ)

غازان

۳۳۰

(امام ابو حامد محمد) الخزائی ۳۲، ۵۷-۱۳۷، ۱۲۹

۴۲-۱۴۰، ۱۴۱-۱۴۵، ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۵۵-۱۵۵

۱۸۴، ۱۸۳، ۱۷۷، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۱، ۱۶۰

۹۰-۱۸۶، ۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۷، ۱۹۸

۳۳۶، ۳۰۲، ۲۸۸

(سلطان) غیاث الدین

۳۳۱

(ف)

(حضرت) فاطمہ

۲۸۲، ۲۸۸

(قاضی) فاضل

۲۷۵

افغانو الدین اللہ

۲۸۳

فخر الدین عثمان

۲۹۴، ۲۹۳

فخر الملک طوسی

۱۸۷، ۱۶۱، ۱۲۸

فرزدق

۳۳

فرعون

۱۷۴

فردوز انور

دیکھئے

بدیع الزماں

(ک)

کاشلین

قیمر

۲۶۹-۷۱، ۳۵

قوبلائی خان

۳۳۳، ۳۱۷

قطب الدین شیرازی

۳۲۸

قزملی

۲۴۹

قتیبہ

۱۰۰

قادر حسینی

۳۰۵

قاسم بن محمد

۴۰، ۳۳

قائمان

۳۲۶

(ق)

فضل بن حیاض

۷۱

فریدرک

۲۶۹-۷۱

فرید الزماں

۱۸۸

فرید البجید

۲۶۲

فریری

۷۹

فریابی

دیکھئے

البرک

۲۷۲

۱۹۸۰، ۹۵، ۹۴، ۹۲، ۸۵، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰

(شمس الائمہ) کردی

۸۲

کرگز

۳۳۳

کسری

۳۵

کمال الدین ابن العظیم

۳۴۲

(گ) (ل)

گاندھی جی

۲۶

گائی

۲۶۶، ۲۶۵

گبن

۳۱۷

گودرجے

۲۶۸

گیوگ خاقان

۳۲۴

(اسٹینٹ) لین پول ۲۸۱، ۲۶۲-۶۴، ۲۵۳-۵۵

(م)

سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام

۲۳۶، ۱۲۶

(حضرت) ثنی بن حارثہ

۸۶

(حضرت) معاویہ

۲۸۲

ماہوج

۳۱۵

مارٹن لوتھر (M. LUTHER)

۲۱

(امام) مالک

۲۸۲، ۱۵۴، ۸۰-۸۲، ۶۸

مالک بن دینار

۲۳۷

محمد بہا الدین

۳۳۸

۲۶۱،۲۰۷،۷۲۰،۶	(سلطان) مسعود	۳۳۰	محمد خدا بنده (نکولس)
۷۷	مسعودی	۶۸	محمد زوال نفس الزکیه
۸۰	(امام) مسلم	۲۰۶، ۲۰۵	محمد عالم کاکوروی
۷۷	(امام) معاذ بن معاذ	۱۱۵	محمد عبده
۳۱۹، ۱۰۳، ۹۵ - ۹۹، ۹۲، ۷۹	مقتضی بالله	۱۲۷	محمد علی
۳۱۹	مقتضی	۱۳۷	محمد گازرونی
۲۴۷، ۲۳۱، ۷۲	معروف کرخی	۱۳۵، ۱۲۲	محمد لطفی جمعه
۱۲۵	معزالدین الشرفاوی	۲۵۰	محمد یوسف لونی
۷۴	معمر بنی	۱۶۸	محمد یوسف موسی
۳۵۷	معین الدین پروانه	۲۵۵	(سلطان) محمود سلجوقی
۱۳۱، ۱۱۵	مقتدی بالله	۳۴۲	محمی الدین ابن العربی
۲۰۶	المقتضی لامر الله	۲۰۰	محمی الدین ابو عبد الله بغدادی
۲۸۴، ۲۸۳، ۲۸۱	مقدسی	۱۲۷	مرزا (غلام احمد)
۲۸۳، ۲۸۲	مقریزی	۸۲	مرنی (شافعی)
۲۹۹، ۲۹۱، ۲۸۹	الملك الاشرف	۲۰۶	مسترشد
۳۰۵	الملك الافضل	۲۴۸، ۲۰۶، ۱۳۱	مستظهر بالله
۲۵۴، ۱۸۷، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۳۱، ۱۱۷، ۱۱۵	ملك شاه سلجوقی	۳۱۹، ۳۱۸، ۳۰۹، ۳۰۸، ۲۹۸	مستعصم بالله
۲۹۴، ۲۹۳، ۲۹۱	الملك الصالح نجم الدین الیوب	۳۰۸، ۲۹۸، ۲۸۳	مستنصر بالله
۲۹۸			
۲۹۰، ۲۸۸	الملك الکامل	۲۰۶	المستنجد بالله

الملك المنظر سيف الدين قطز

۳۲۱

نصیر الدین طوسی

۳۱۹، ۳۱۸

الملك المنصور

۲۹۲

نظام الملك طوسی

۱۸۴، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۸، ۱۱۴، ۱۱۶

۱۸۸

ملکہ جهان

۳۳۸

نرود

۱۲۶

مناظر حسن گیلانی

۶۸

نور الدین زنگی

۲۸۶، ۲۸۵، ۲۶۴، ۲۵۵-۶۱۰، ۲۵۲

مقتدر بالشر

۳۱۹

(امام) نووی

۲۸۸

منصور بن غالب

۴۸، ۴۶، ۴۵

و

مکتوباتان

۳۱۹، ۳۱۸

واثق

۱-۳، ۹۲

مکتوباتان

۳۳۳

وصاف

۲۲۹، ۲۲۶

(شیخ) موسی

۲۲۳، ۲۲۲

(امام) وکیح

۷۷

موسی بن الملك العادل

۳۰۵، ۲۸۹

(سلطان) ولد

دیکھے

بہار الدین

مہیر

۱۱۴

ولید

۵۰، ۳۴

موفق عبد اللطیف

۲۲۹

(شاہ) ولی الشر

۳۰۲، ۸۰، ۶۵

ن

سیدنا حضرت نوح علیہ السلام

۱۲۶

د

ناجی معروف

۳۱۰، ۳۰۷

سیدنا حضرت ہود علیہ السلام

۳۹۱

الناصر لدین الشر

۳۱۰، ۳۰۸، ۳۰۷

بارون رشید

۹۸، ۸۷، ۸۵، ۸۲، ۷۱، ۶۹

نجم الدین مختار ظاہری

۳۲۵

ہشام بن عبد الملك

۶۸، ۳۳

(امام) نسائی

۸۰

ہلاکو خان

۳۲۶، ۳۲۵، ۳۱۹، ۳۱۸، ۳۱۳

نصرۃ الدین امیر ایران

۲۶۱

ہمفری

۲۶۵

۹۰۱۸۸	یحییٰ بن معین	۱۲۷	(موسیو) ہوارث
۸۲	یحییٰ بن یحییٰ لہشی	۸۷	ہدیم بن بشر
۵۱	یزید بن عوشب	۸۷	ہدیم بن حبیل
۶۳	یز بن عبد الملک	۱۳-۳۱۰	ہیر لولیمب
۶۳	یزید بن المہلب		(۷)
۷۹	یزید بن ہارون	۲۴۴	سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام
۵۵	یسار	۳۱۵	یا جوج
۱۲۱	یعقوب کندی	۸۵	یحییٰ بن اکثم
		۵۰	یحییٰ بن سعید

اقوام و قبائل - طبقات و ملتیں

۸۶، ۶۸، ۶۷، ۳۳	اہل بیت کرام بخاندان نبوت	۸۶	ارباب کلیسا
۲۸۲		۲۱	آرتھوڈوکس سینی
۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۲، ۱۱۰، ۱۰۶، ۱۰۵، ۸۱	اہل سنت - سنی	۳۵۳	ارموی
۳۰۸، ۲۸۳، ۲۷۷، ۲۰۲، ۱۳۶، ۱۱۹		۲۸۹، ۱۸۴-۸۶، ۱۱۹، ۱۱۵-۱۷	اشعری و اشاعہ
۱۲۶	اہل ظاہر	۳۹۶، ۳۹۴، ۳۸۳، ۳۶۲، ۳۳۵	
۳۱۰، ۱۳۶	اہل عراق	۲۸۵، ۲۶۷، ۲۵۱، ۲۰۸، ۱۷۷، ۱۳۸، ۲۹۴	انبیاء و انبیاء
۶۸	اہل مدینہ	۳۹۸، ۳۹۶، ۳۹۵، ۳۸۶، ۳۶۷، ۳۶۴	
۲۸۲، ۲۷۱	اہل مصر - مصری	۱۳۳	اہل استدلال
۴۴، ۴۱	اہل مصر - مصر	۳۰۷، ۳۰۶، ۲۴۹، ۸۷	اہل بغداد



سلاطين

۳۹۳، ۳۹۲، ۳۳۵

۳۳۱، ۳۲۹، ۳۲۳-۲۶

۱۹۳

۶۳-۶۵

۱۹۳

۱۱۳

۲۸۱، ۲۰۲، ۲۰۱، ۱۱۷، ۱۱۳، ۷۲، ۲۱

۲۸۱، ۲۲

۱۲۰، ۸۴، ۲۰

مغل

لشیں

منافقین

موصدین

ہندو

یہودی

یورپین

یونانی

مسلمان ۱۱۳-۲۱، ۱۱۱-۲۱، ۱۱۹-۲۱، ۱۱۲-۲۱، ۱۱۸-۲۱، ۱۱۵-۲۱، ۱۱۴-۲۱، ۱۱۳-۲۱، ۱۱۲-۲۱، ۱۱۱-۲۱، ۱۱۰-۲۱، ۱۰۹-۲۱، ۱۰۸-۲۱، ۱۰۷-۲۱، ۱۰۶-۲۱، ۱۰۵-۲۱، ۱۰۴-۲۱، ۱۰۳-۲۱، ۱۰۲-۲۱، ۱۰۱-۲۱، ۱۰۰-۲۱، ۹۹-۲۱، ۹۸-۲۱، ۹۷-۲۱، ۹۶-۲۱، ۹۵-۲۱، ۹۴-۲۱، ۹۳-۲۱، ۹۲-۲۱، ۹۱-۲۱، ۹۰-۲۱، ۸۹-۲۱، ۸۸-۲۱، ۸۷-۲۱، ۸۶-۲۱، ۸۵-۲۱، ۸۴-۲۱، ۸۳-۲۱، ۸۲-۲۱، ۸۱-۲۱، ۸۰-۲۱، ۷۹-۲۱، ۷۸-۲۱، ۷۷-۲۱، ۷۶-۲۱، ۷۵-۲۱، ۷۴-۲۱، ۷۳-۲۱، ۷۲-۲۱، ۷۱-۲۱، ۷۰-۲۱، ۶۹-۲۱، ۶۸-۲۱، ۶۷-۲۱، ۶۶-۲۱، ۶۵-۲۱، ۶۴-۲۱، ۶۳-۲۱، ۶۲-۲۱، ۶۱-۲۱، ۶۰-۲۱، ۵۹-۲۱، ۵۸-۲۱، ۵۷-۲۱، ۵۶-۲۱، ۵۵-۲۱، ۵۴-۲۱، ۵۳-۲۱، ۵۲-۲۱، ۵۱-۲۱، ۵۰-۲۱، ۴۹-۲۱، ۴۸-۲۱، ۴۷-۲۱، ۴۶-۲۱، ۴۵-۲۱، ۴۴-۲۱، ۴۳-۲۱، ۴۲-۲۱، ۴۱-۲۱، ۴۰-۲۱، ۳۹-۲۱، ۳۸-۲۱، ۳۷-۲۱، ۳۶-۲۱، ۳۵-۲۱، ۳۴-۲۱، ۳۳-۲۱، ۳۲-۲۱، ۳۱-۲۱، ۳۰-۲۱، ۲۹-۲۱، ۲۸-۲۱، ۲۷-۲۱، ۲۶-۲۱، ۲۵-۲۱، ۲۴-۲۱، ۲۳-۲۱، ۲۲-۲۱، ۲۱-۲۱، ۲۰-۲۱، ۱۹-۲۱، ۱۸-۲۱، ۱۷-۲۱، ۱۶-۲۱، ۱۵-۲۱، ۱۴-۲۱، ۱۳-۲۱، ۱۲-۲۱، ۱۱-۲۱، ۱۰-۲۱، ۹-۲۱، ۸-۲۱، ۷-۲۱، ۶-۲۱، ۵-۲۱، ۴-۲۱، ۳-۲۱، ۲-۲۱، ۱-۲۱، ۰-۲۱

۱۲۳، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰

۱۹۶، ۱۹۴، ۱۶۵، ۱۶۲، ۱۶۰، ۱۵۷، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰

۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰

۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰

۳۵۷، ۳۳۳، ۳۳۲، ۳۳۱، ۳۳۰، ۳۲۹، ۳۲۸، ۳۲۷، ۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۴، ۳۲۳، ۳۲۲، ۳۲۱، ۳۲۰، ۳۱۹، ۳۱۸، ۳۱۷، ۳۱۶، ۳۱۵، ۳۱۴، ۳۱۳، ۳۱۲، ۳۱۱، ۳۱۰، ۳۰۹، ۳۰۸، ۳۰۷، ۳۰۶، ۳۰۵، ۳۰۴، ۳۰۳، ۳۰۲، ۳۰۱، ۳۰۰، ۲۹۹، ۲۹۸، ۲۹۷، ۲۹۶، ۲۹۵، ۲۹۴، ۲۹۳، ۲۹۲، ۲۹۱، ۲۹۰، ۲۸۹، ۲۸۸، ۲۸۷، ۲۸۶، ۲۸۵، ۲۸۴، ۲۸۳، ۲۸۲، ۲۸۱، ۲۸۰، ۲۷۹، ۲۷۸، ۲۷۷، ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۴، ۲۷۳، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۸، ۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۵، ۲۶۴، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۶۰، ۲۵۹، ۲۵۸، ۲۵۷، ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۴، ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۵۱، ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷، ۲۴۶، ۲۴۵، ۲۴۴، ۲۴۳، ۲۴۲، ۲۴۱، ۲۴۰، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵، ۲۳۴، ۲۳۳، ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۳۰، ۲۲۹، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۲۴، ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰

۱۸۳

۳۵۰

۱۸۷، ۱۸۵، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۱۵، ۱۰۳-۱۱۳، ۸۶، ۸۵

مشائخ صوفیہ

مصری

معتزلہ

کتابیات

قرآن مجید

(الف)

ابوالغازی توم

ابن تیمیہ (الوزہرا)

ابن جنبل (الوزہرا)

اپنیشدر

اتحاد السادة المتقين

اتحاد السعادة (شرح احیاء)

احیاء علوم الدین (احیاء العلوم) ۱۵۰، ۱۴۷، ۱۴۶، ۵۷

۱۸۲، ۱۷۷، ۱۶۲-۲۸، ۱۵۹، ۱۵۵-۵۷، ۱۵۱-۵۳

۲۸۸، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۳-۸۵

۳۱۸

۱۹۳

۱۱۷

۱۱۲

اجبا و آثار

اجبار بربر

اخلاق جلالی

استحسان الخوض فی الکلام

اسرار خودی

۳۶۰

اسلام آرژو کرسیجی نیچی (ISLAM OR TRUE -

CARISTIANITY)

۲۱

اشارات (ابن سینا)

۲۸۵

الأشعري أبو الحسن

۱۱۴، ۱۱۳

الاصابة في أحوال الصحابة

۷۶

الأخاني

۷۰، ۱۳۲، ۳۰

(رساله) الأقسام

۳۱-۱۳۰۷

اجام العوام عن علم الكلام

۱۸۷، ۱۸۷

الفیه

۱۸۳، ۱۳۷

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی

۶۸

انجیل

۳۵۷، ۲۱

انسائیکلو پیڈیا ریٹرانیکا

۲۵۳، ۲۵۲، ۲۴۸، ۲۲۲

انسائیکلو پیڈیا ریٹرانیکا اینڈ آنکس

۲۵

ایضاح البرهان

۱۱۳

(ب)

بال جبریل

۳۹۹، ۳۶۹

البدایہ والنہایہ ۳۹۹، ۳۸۱، ۳۰۶، ۳۰۵، ۲۰۶، ۱۹۷

۳۳۰، ۳۲۱، ۳۱۸، ۳۱۳

۱۸۹

ایرمان

بگوت گیتا

(ت)

التاج المکمل

۱۸۳

تاریخ ابن خلکان

۲۷۸، ۱۰۲، ۱۷۹، ۱۷۲، ۱۳۳

تاریخ الخلفاء السیوطی

۳۲۲، ۳۲۱

تاریخ الاخلاق

۱۶۸

تاریخ الاسلام للذہبی

۱۰۲، ۹۸-۱۰۰، ۹۳، ۹۱، ۸۷

تاریخ اصبهان

۴۰

تاریخ انخطاط و سقوط روما

۳۱۷

تاریخ بغداد

۱۰۱، ۹۵، ۷۲

تاریخ دعوت و عزیمت

۹

تاریخ صغیر

۹۴

تاریخ طبری

۹۵، ۷۰

تاریخ عهد وسطی

۳۱۷

تاریخ فلاسفۃ الاسلام

۱۳۵، ۱۳۲

تاریخ الکامل ۱۱۸۸-۱۲۵۶

۳۱۶، ۳۱۴، ۳۱۳، ۳۰۸، ۲۵۶

تاریخ کبیر

۹۴

تاویلات القرآن

۱۱۵

التبیین عن اصول الدین

۱۱۳

۱۴۶	جواهر القرآن	۱۸۹/۱۱۴/۱۱۳/۱۰۵-۸	تبيين كذب المفتري
۳۱۷، ۳۱۴، ۳۱۰-۱۲	چنگيز خان (کتاب)	۲۸۱	تبشيت النبوة
	(ح)	۷۹، ۳۳	تذكرة الحفاظ
۱۲۷	حاضر العالم الاسلامي	۳۴۵	تذکره دولت شاه
۱۴۶	حجة الحق	۲۸۸	الترغيب والترهيب
۳۰۲، ۸۰	حجة الشر البالغه	۱۴۷	تعريف الأحياء بفضائل الأحياء
۳۵۴	حدیقه سنائی	۱۲۷	تفسير مولوي محمد علي
۶۰	احسن البصري	۲۲۴	تقصا جود الاحرار
۲۹۹، ۲۹۸، ۲۸۸	حسن المحاضرة	۲۲۳	الكلمة رموز الغيب
۲۴۷، ۱۹۰-۷۸۹، ۷۲	حلیة الاولیاء	۲۵، ۲۴ (DISCOVERY OF INDIA)	تلاش ہند
۲۸۱	حماہ	۲۴۶، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۴-۲۴	تبلیس البلیس
۳۰۷، ۳۰۶	احداث الجامعہ	۲۵۰	تلقيع فہم اہل الأثر فی عیون التاریخ والیسر
	(خ)	۳۵۷	توریت
۱۱۳	خبر الواحد	۱۴۲-۴۵	تہافت الفلاسفہ
۷۷، ۷۶	خطبات مدراس		(ج) (ج)
	(ی)	۸۰	جامع ترمذی
۳۱۴، ۱۹۷، ۶۶، ۵۷، ۵۶	دائرة المعارف للبستاني	۸۲	الجامع العلوم
۳۳۲، ۳۳۰، ۳۲۹، ۳۲۳-۲۵	دعوت اسلام (آرٹیکل)	۴۰-۱۳۹۹	جاویدنامہ
۳۰۲	الدلائل المتعلقة بالملائكة والانس	۲۰۱	جلال العینین

دی گبین

۳۲۴

دیوان مولانا روم

۳۷۹، ۳۵۵

ذ

ذیل طبقات المحتالہ

۲۰۳، ۲۰۲، ۱۹۸

ذیل المرأة

۳۲۱

ر

الرد علی المنطقیین

۱۱۹

رسائل اخوان الصفا

۲۸۵، ۱۲۲

رموز الغیب

۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۶، ۲۰۵

رنات اشالث

۳۲

ز

زاویہ غزالیہ

۲۸۸

زندگانی مولانا جلال الدین

۲۱۹، ۲۵۵، ۳۲۳، ۳۳۹

۳۵۴، ۳۵۲

س

سلطان صلاح الدین (الین پول)

۲۶۲، ۲۵۴-۵۶

۲۸۱، ۲۷۳، ۲۷۰، ۲۶۵، ۲۶۳

سنن ابی داؤد

۸۰

سوانح مولانا روم

۳۶۰

سیرت عمر بن عبدالعزیز

۵۱، ۵۰، ۴۷، ۴۵، ۳۶-۴۰، ۱۳۴

سیرۃ النعمان

۸۲

ش

اشثال

۲۴۸

شجرة المعارف

۳۲۲

شذرات الذهب فی اخبار من ذهب

۸۲

شرح احیاء العلوم ویکھئے

اتحاد السادة

الشرح والتفصیل فی الرد علی اهل الاکاذک

۱۱۳

شفاء (ابن سینا)

۲۸۵

ص ص

صاحب المثنوی

۳۴۵، ۳۳۷

صحاح ستہ

۷۹

صحف مقدسہ

۲۱

صحیح بخاری

۱۸۹، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۴۰

صحیح مسلم

۱۸۹، ۱۸۰

صحیحین

۸۰

صفة الصفة

۲۴۷، ۵۱، ۳۳

صفة النفاق وضم المنافقین

۶۵

صلاح الدین الیوبی (محمد فرید)

۲۶۱

الصواعق المرسلة

٢٨٩، ٢٨٥

صيد الخاطر ٢٠٢-٢٢٢، ٢٣٢، ٢٣٣، ٢٣٩، ٢٣٣-٢٣١

٢٥٠، ٢٢٥-٢٨

مضى الاسلام

١٢٣

(ط)

طبقات ابن سعد

٦٥

طبقات ابن السكيت

٢٩٥، ٩٢

طبقات الشافعية الكبرى ٢٩٣، ٢٨٨، ١٣١، ١١٦

٣١٩، ٣٠٢، ٣٠٠، ٢٩٩، ٢٩٤، ٢٩٥

طبقات الكبرى للشعراني

٢٠٣، ٢٠٢، ١٩٩

(ع) (غ)

عاصمة نفوس المتدين وقاصمة ظهور المعتدين ١٢٥

الحصي السبوك

٣٠٦

عقائد عصبية

١١٥

علماء سلف

٤٩، ٤٦

معارف المعارف

٢٢٢

الغزالي

١٩٣، ١٨٩، ١٦٤، ١٣٤

(ف)

فتاوى شيخ الاسلام ابن تيمية

١٨٣، ١٨٢

افتح الرباني

٢١٠، ٢٠٨

افتح القسي في افتح القدي

٢٤٨

فتوح البلدان

٢٩

فتوح الغيب

٢٠٩، ٢٠٨، ٢٠٦، ٢٠٥

فخر الاسلام

٨١

فرخ انسا نيكلو بيديا ان اسلام

١٢٤

فناجح الاباحية

١٢٦

فلسفة الاخلاق وصلاتها بالفلسفة الاغريقية ١٦٨

٦٥

فوز الكبير

فصل التفرقة بين الاسلام والزندقة ١٨٦، ١٨٥

فيوض يزداني ٢١٨، ٢١٤، ٢١٥، ٢١١، ٢١٠

(ق)

قاصم الباطنية

١٢٦

قلائد البحار

٢١٦، ١٩٩-٢٠٢

قلائد العقود العتيان

٨٢

قواعد عقائد آل محمد

١٢٦

القواعد الكبرى

٣٠٢

قوت اقلوب

١٣٣

قيام الليل

٦٢

ك

كتاب الابانة عن اصول الديانة

١١٠، ١٠٩

كتاب الاجتهاد

١١٣

كتاب الأم

٨٢

كتاب ايموان

٤٠

كتاب الخراج

٨٢، ١٣٤

كتاب الخطوط والآثار

٢٨٣، ٢٨٢

كتاب الروضتين في اخبار الدولتين

٢٨٦، ٢٨٨، ٢٨٣

كتاب العبر

٢٨٨

كتاب الحمد

١١٣

كتاب الملح

١١٣

كتاب الفصول

١١٣

كتاب القياس

١١٣

كتاب الموجز

١١٣

الكشف عن اسرار الباطنية

٢٨١

الكشف ما كان عليه بنو عبید

٢٨١

كليات سعدی

٣٢٠

ل

لغة الكبد في نصيحة الولد

٢٣٣، ٢٢٦

م

المأمون

٤١

غنى معنوى

٣٦٢، ٣٦٠، ٣٥٥، ٣٥٨، ٣٣٢

٣٩٨، ٣٩٤، ٣٨٨-٨٤، ٣٦٣-٤٨

مجاز القرآن

٣٠٢

الحاسن اليوسفيه

٢٦٢

المدونه

٨٢

مرصاد العباد

٣١٦

مرآة البجنان لليافى

٢٢٣

مرآة الزمان

٣٠٥

مرآة المتنوى

٣٣٤

المستقصى

١٨٩

مستطبرى

١٥٨، ١٥٦، ١٣٣

مسلم كريد (MUSLIM CREED)

١١٣

مسند امام احمد

١٠١

المعتمد

١٨٩

المفتى

١٩٨، ١٨٢

مفصل الخلفاء

١٨٦

مقاصد الصلاة

٣٠٢

۲۸۲، ۸۰

موطا

(ن)

۱۲۸

نظام الملك طوسی

۱۶۱

نصیحة الملوك

۳۳۷

نقد المثنوی

۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹

النوادر السلطانية

۲۷۸-۸۱، ۲۷۹

(و)

۲۲۴

وفیات الاعیان

۳۳۳، ۳۳۰

وہوسن

(ح)

۳۲۴، ۳۲۳

ہوورقہ

۲۴

ہندوستانی تمدن

۳۲۶

ہیوم

(ی)

۲۳۶

یوسف زلیخا

۱۳۲، ۱۳۱

مقاصد القلاصف

۱۱۳، ۱۱۳

مقالات اسلامیین

۶۹

مقدمہ ابن خلدون

۷۹، ۷۸

مقدمہ فتح الباری

۳۲۶

مقریزی قوم

۱۶۱

مکتوبات امام غزالی

۹۲، ۸۷

مناقب ابن الجوزی

۸۱، ۶۸

مناقب ابی حنیفہ

۹۲

مناقب حافظ ذہبی

۳۳۳

مناقب العارفين

۳۸

مناقب عمر بن عبدالعزیز

۱۸۴، ۱۸۳

المنظوم فی تاریخ الملوك والامم

۲۵۷، ۲۴۹، ۱۹۷

المنقذ من الضلال

۱۳۶، ۱۳۱، ۱۳۱

۳۵۴

منطق الطیر

۱۸۴، ۱۸۲، ۱۳۷

منہاج القاصدين

۱۳۶

مواہب الباطنیہ

مقامات

۱۲۲،۷۶،۷۵

اندلس

۲۵۶،۲۵۴،۲۵۳

انطاکیه

۳۱۳

اترار

۲۵۳

انطرووس

۲۴۹

احار

۳۱۷،۲۶۹-۷۱

انگلستان

۲۶۱،۱۹۷

آذربایجان

۲۵۵

ایڈیسیا

۳۴۴،۲۷۰

اردن

۳۰۷،۲۶۱،۱۹۷،۱۲۷،۱۸۸،۱۸۰،۷۷

ایران

۲۷۱

ارسوت

۳۴۰،۳۳۹،۳۳۳،۳۳۰،۳۲۹،۳۲۶،۳۱۷،۳۱۱

۳۴۸

ارمن

۷۶،۷۳،۷۲

ایشیا

۲۷۲

ارمنیہ

۳۱۰

ایشیا کوچک

۳۱۲،۱۹۲،۱۹۱،۷۶،۷۳

اسپین

۲۷۱

ایلیہ

۲۷۰،۲۶۹

آسٹریلیا

(ب)

۱۶۱

اسفرائن

۹۶

باب البستان

۲۵۶،۱۹۲

اسکندریہ

۱۹۲

بجایہ

۱۲۸

اصغہان

۳۲۵،۳۱۴،۷۵

بخارا

۱۹۲

اغمت

۹۷

برز

۳۳۸

افغانستان

۲۷۰

برگنڈی

۲۲۱،۱۸۲،۷۶،۷۳،۷۵

افریقہ

۱۰۷۱-۵۱۸۷،۱۸۶،۷۷،۷۵،۷۷

بصرہ

۳۴۰

آقشہر



خ

خوارسان ۳۳۰، ۳۳۸، ۳۲۹، ۱۶۰، ۱۸۶، ۱۷۶، ۱۷۱، ۱۳۹

خلیج عجم

۳۱۱

خوارزم

۳۱۳

۷

دائرة شاه علم الشرع

۱۶۱۰

وشق ۳۳۰، ۲۹۱، ۹۳، ۲۸۸، ۲۸۷، ۱۳۶، ۶۷

۲۵۱، ۳۵۷، ۳۳۴، ۳۳۲، ۳۳۰

دمیاط

۳۰۶، ۲۵۶

دوبین

۲۶۱

س ن

رائے بریلی

۱۶۱۰

الرحا

۲۵۵، ۲۵۳

رجب خان

۷۹

رقت

۱۰۰، ۹۶، ۹۵، ۷۱

رطه

۲۷۶، ۲۷۰

روس

۳۱۷

روم ۳۵۳، ۳۵۱، ۳۳۸، ۳۳۴، ۳۳۲، ۳۰۵، ۹۱

۳۱۶، ۳۱۳، ۱۸۸

س

زنگان

س

۳۳۴، ۳۱۳

سرخس

۸۶

ساٹرا

۲۲۱

سمرقند

۳۱۳، ۱۱۵

سنجاس

۳۳۴

سوئین

۳۱۷

سویز

۷۶

سیرادادرا

۳۲۵

ش

شام ۲۷۱، ۲۶۱، ۲۵۸، ۲۵۲، ۵۶، ۸۷، ۱۸۰

۳۳۲، ۳۳۱، ۳۱۸، ۳۱۰، ۲۰۵، ۲۸۹، ۲۸۴، ۸۶

۳۵۱، ۳۳۸، ۳۲۵

شیراز

۱۰۷

ص

صحراء نوبه

۲۷۲

صخره

۱۳۶

صقلیه

۲۷۰، ۲۶۹

صغار

۸۸

۳۲۲، ۳۲۱	عین جالوت	۲۷۲	صور
	(ف)	۲۹۱	صیدا
۲۶۹-۷۱	فرانس		(ط)
۲۷۰	فلاندرز	۱۸۹، ۱۳۰	طابریان
۲۷۰، ۲۶۳-۶۵، ۲۵۶، ۲۵۲-۵۴	فلسطین	۲۵۶، ۲۵۴، ۲۵۳	طرابلس الشرق
	(ق)	۹۵	طرطوس
۳۲۵، ۲۸۵	قاہرہ	۷۶	طنجہ
۲۵۴	قدس	۱۸۸، ۱۸۷، ۱۶۲، ۱۳۰	طوس
۳۱۳	قراقرم	۳۱۸	طهران
۳۱۳	قزوین		(ع)
۲۷۲	قسطنطنیہ	۸۸، ۸۷، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	عالم اسلام
۲۹۰	قصیرہ	۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	قونیہ
۳۳۴	قیصریہ	۲۵۲، ۲۲۱، ۲۱۷، ۲۰۱، ۱۹۴-۹۶، ۱۸۸، ۱۳۷	عراق
	(ل) (ک)	۳۱۲، ۳۱۰، ۲۹۵، ۲۸۷، ۲۸۶، ۲۷۳، ۲۶۲، ۲۵۵	عراق
۳۳۳، ۳۳۱	کاشغر	۲۶۸، ۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۵-۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۸، ۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۵، ۲۶۴، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۶۰، ۲۵۹، ۲۵۸، ۲۵۷، ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۴، ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۵۱، ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷، ۲۴۶، ۲۴۵، ۲۴۴، ۲۴۳، ۲۴۲، ۲۴۱، ۲۴۰، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵، ۲۳۴، ۲۳۳، ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۳۰، ۲۲۹، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۲۴، ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	کاشغر
۳۳۳	کانشوا	۳۹۸، ۳۹۷	عجم
۲۷۲	کردستان	۱۹۷، ۷۵	عرب
۲۹۳	کرک	۲۷۱، ۳۴	عرب
		۲۸۱، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۷۰، ۲۶۹	عرب

۳۴۰، ۳۵۰، ۲۶۶، ۲۵۴، ۱۳۴، ۸۸، ۵۴
۲۴۳

۳۴۰
۴۶

۲۹۵
۶۸، ۵۴

۲۴۱، ۲۵۸، ۲۵۵
۳۱۴

۲۵۲
۳۴۰

۱۹۲
۱۱

(ن)

(م)

۳۰۵
۱۹۴

۳۱۴، ۱۸۴، ۱۳۹، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۶
۱۱۴، ۴۹

(۵)

۳۳۹
۳۰۵، ۲۶۶

۳۱۶، ۳۱۴
۱۹۲

۲۲۴، ۲۲۱، ۱۲۴، ۴۹، ۲۴۰، ۲۶۶، ۱۵۰، ۹
۳۱۴، ۸۶

۳۹۸، ۳۱۰، ۴۰۴، ۲۵۰
۱۱۴

(۷)

۲۴۱، ۲۴۰، ۲۵۴
۳۶۱، ۲۵۸، ۲۵۶، ۱۹۲، ۱۱۵، ۸۲، ۸۰، ۴۵

۲۲۱، ۸۸، ۴۶، ۴۴، ۳۸
۳۳۶، ۳۲۵، ۳۲۱، ۳۱۰، ۳۰۶، ۳۰۵، ۲۹۰-۹۹

۲۶۸-۴۱، ۲۶۶، ۲۶۴، ۲۵۶، ۲۵۳
۲۸۵، ۱۹۲، ۱۴۵، ۲۹

۲۶۹، ۲۵۴، ۲۵۲، ۱۹۳، ۴۶، ۴۳، ۳۸، ۲۲
۱۸۸

۳۹۸

مقام خلیل

متفرقات

قلعہ نہرودریا:

بیت المقدس مسجد اقصیٰ ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۳، ۱۳۶

۲۹۲، ۲۸۶، ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۷، ۲۶۲
۳۰۳

۲۸۸ جامع اموی

۱۳۶ جامع مسجد دمشق

۲۵۱ جامع منصور بغداد

۲۵۳ مسجد عمر

۱۲۶ باب کعبہ

۲۵۴ روضۃ الطہر

۲۰۳ مطاف

۲۲ چوچ

۲۲ کلیسا

درس گاہیں، اداۓ اور مطالب:

۲۵ الفتن کا بیج بیئی

۱۶۸ جامعۃ القاہرہ

۳۱۸ طہران یونیورسٹی

۳۴۲ مدرسہ صلاویہ - حلب

۳۴۱ مدرسہ خداوندگار

۳۲۱

۲۶۱، ۲۵۶

۲۶۱

۲۶۱، ۲۵۶

۲۵۹

۷۶

۳۱۰

۱۹۷

۲۴

۲۴

۳۱۰

۳۰۶

۳۰۶، ۲۵۵

۲۳۶

مساجد و مقدس مقامات و مسجد:

بیت اللہ شریف (کعبہ) ۳۷۷، ۲۰۳، ۱۱۲۶

قلعہ الیسیان

قلعہ بانیاں

قلعہ بعلبک

قلعہ حارم

قلعہ حصن الاکراد

بحر احمر

بحر خوارزم (آرال)

بحر قزوین

بحر الکابل

بحر ہند

خلیج عجم

دجلہ

فرات

کوہ طور

مذہب شان

۳۲۹

مذہب عیسائی - مسیحیت

۳۲۳، ۲۰-۲۳، ۱۰

(عقیدہ) وحدۃ الوجود

۲۶-۲۸

ہندومت - ہندو مذہب

۲۲-۲۵، ۱۰

مذہبی، اسلامی اور اصطلاحی الفاظ:

اجماع

۱۳۳

آخرت

۱۴۸، ۱۳۵، ۱۲۶

استلام

۴۳

اسلامی معاشرہ

۷۳، ۵۳

بحث و مناظرہ

۱۵۵، ۱۵۴

بیعت

۱۹۱، ۸۱

تذکیر

۱۵۵

تزکیہ

۱۴۷، ۱۳۶

تصوف

۲۲۴، ۱۹۱، ۱۶۳، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۳۸

تقدیر

۸۵

توحید

۱۵۵، ۲۵

جاہلیت

۴۱، ۳۲، ۳۱

جبر و اختیار

۸۵

جزیہ

۴۷، ۱۳۷

جنت

۱۲۶، ۱۲۴

جہاد

۹۱

حج و زیارت

۱۶۴، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۲۴، ۸۸، ۳۶

حدیث

۸۴، ۸۴، ۷۸-۸۱، ۷۳-۷۵، ۴۰، ۲۹

۱۸۴، ۱۸۳، ۱۷۰-۱۳۹، ۱۳۳، ۱۲۵، ۸۹

حرام

۱۵۹، ۱۲۴

حلال

۱۵۷، ۱۲۴، ۹۰

خواجه

۱۵۷، ۱۴۷، ۱۳۸

ختم نبوت

۱۲۷

خلافت

۱۵۳، ۱۳۱، ۶۷، ۵۱، ۴۰، ۳۹، ۳۵، ۲۹

۱۸۹

دجال

۱۲۷

دوزخ - جہنم

۱۲۶، ۱۲۴

رسالت

۱۲۴

رسم حلف - مخالفت

۴۱

رشوت

۱۵۷

روزہ - صیام

۱۲۶، ۱۲۴

ری

۱۵۱

رؤیت باری

۸۵

زکوٰۃ

۱۲۶، ۱۲۴، ۵۰

سبق

۱۵۱

۱۲۶، ۱۲۳، ۱۱۱، ۸۹، ۶۵

وحي

سنت ۱۰۴، ۲۱۹، ۸۹، ۹۲، ۸۹، ۳۹، ۳۱، ۲۹

۱۲۷

وضو

۳۰، ۵۱، ۲۸۵، ۲۸۳، ۲۲۲، ۲۲۲، ۲۲۲، ۲۲۲، ۲۲۲، ۱۱۱

علوم و فنون:

۱۳۳

اخلاقيات

۱۲۴

اشريعت

۱۰۸

اصول فقه

۱۵۱

فهار

۱۴۲، ۱۳۳، ۱۲۲

رياضيات

۶۹

عجبي روح

۳۹۸

رائس

۶۹

عربي روح

۲۶

سفرت

۱۲۸

عقل اول

۱۳۳

بيانيات

۱۲۷، ۱۲۴

فرض واجب

۱۴۲، ۱۴۱، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۲۸، ۱۲۲

طبيعات

۶۲

قيامت

۱۲۰

علم الاصنام

۱۵۱

سمان

۱۳۶

علم تصوف

۱۲۴

مبدأ اول

۱۲۸، ۱۲۷، ۱۱۸، ۱۱۵، ۱۱۳، ۱۰۸، ۲۹، ۲۸

علم الكلام

۸۵

مشفه

۱۸۶، ۱۸۴، ۱۶۳، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۴۵، ۱۴۱، ۱۳۳

۱۲۷

مستحب

۳۸۲، ۳۶۸، ۳۶۵، ۳۶۲، ۳۶۲، ۳۳۵، ۱۸۷
۳۹۸، ۳۹۲، ۳۸۳

۱۲۶، ۱۲۴، ۱۲۳

معاذ

۱۲۸

علم نبوت

۱۸۴، ۱۷۷، ۱۲۷، ۱۳۴

معجزة

۲۸۷

علوم شرعية

۱۵۹، ۱۲۶، ۱۳۴

طائفة

۱۸۹، ۱۳۲، ۱۲۸، ۱۲۲، ۱۱۳
۱۹۱

علوم عقلية - عقلیات

۱۲۴، ۱۲۳، ۱۱۱، ۸۹، ۵۷، ۵۴، ۵۳، ۳۹، ۳۷
۱۳۸، ۱۲۷، ۱۲۶

نبوت

۱۹۰، ۱۸۹، ۱۲۸

علوم نقلية

۱۲۷

نزول مسيح

۱۵۵، ۷۴، ۷۳، ۲۹

فقه

۶۳-۶۶

نفاق

حکومت امویہ۔ خلافت امویہ ۶۶۱ء تا ۷۵۰ء

فقہ اسلامی

۸۲

خلافت راشدہ ۳۵ء تا ۶۳ء

فقہ شافعی

۱۶۷ء تا ۱۸۲ء

خلافت عباسیہ سلطنت عباسیہ ۱۸۸ء تا ۶۵۶ء
۳۱۹ء تا ۳۱۸ء

فقہ مالکی

۸۲

نولوزی سلطنت ۳۰۸ء

فلسفہ ۱۲۶۱ء تا ۱۲۵۱ء، ۱۲۳۱ء تا ۱۲۱۱ء، ۱۲۰۱ء تا ۱۱۸۱ء

دولت ایلمانیہ ۳۲۶ء

۳۹۷ء تا ۳۳۵ء، ۱۸۲ء تا ۱۵۶ء، ۱۴۴۲ء تا ۱۴۶۱ء، ۱۴۱۱ء تا ۱۳۸۱ء

دولت مغلیہ ۳۳۳ء تا ۳۳۹ء

فلسفہ اخلاق ۱۶۸

نخفانیہ سلطنت ۳۳۳ء تا ۳۳۲ء

فلسفہ الہیات۔ الہیات ۲۲ء تا ۸۴ء، ۱۲۸۱ء تا ۱۳۳۱ء، ۱۳۲۱ء تا ۱۳۱۱ء

سلجوقی سلطنت ۳۱۰ء تا ۲۵۴ء

فن اسرار الرجال ۷۶

عبیدی سلطنت (فاطمی) ۲۸۳ء تا ۳۸۲ء

مسئلہ عدل ۸۵

لاطینی سلطنت ۲۵۵

معقولات ۱۴۵

ولایت انطاکیہ ۲۵۳

منطقیات ۱۴۲ء تا ۱۴۱ء، ۱۳۳

عہد وادوار:

یونانی فلسفہ ۱۲۲ء تا ۱۲۰ء، ۱۸۵ء تا ۱۸۳ء

زمانہ صحابہ ۸۰

زبان:

عہد اموی ۸۶ء تا ۳۱ء، ۳۱ء تا ۳۳

سریانی ۱۲۰ء تا ۱۸۴

عہد رسالت۔ عہد نبوت ۱۳۸۱ء تا ۱۶۵۶ء

منکر ۱۲۰ء تا ۲۶۱ء

عہد صدیقی ۸۶

عربی ۱۲۰ء تا ۳۳

عہد عباسی ۳۰۶ء تا ۲۰۶

فارسی ۱۲۰

یونانی ۱۲۰

سکے:

سلطنتیں و حکومتیں:

اشرفی

۳۳۳

تاریخ سلطنت

۲۵۴ واقعہ ارتداد

۲۵۹ واقعہ حصن الاکراد

۶۸ واقعہ کربلا

۲۶۴ جنگ حطین

۳۲۷ جنگ خارا

۲۵۹ معرکہ بقیعہ

دیگر متفرقات:

۲۴-۲۶ بت - مورت

۲۸۴ جوہر

۱۸۱ چقماق

۳۳ حجر اسود

۱۷۷ زقوم

۱۷۵ شطرنج

۲۸۸ صلاة الرغائب

۳۲۰-۳۳۲ صلیب

۲۰۸ صنوبر

۷۰ عنبر

۷۵ فرسخ

۷۰ مشک

۲۸۲ ملوخیاء

۹۱ منجیق

۳۳۱ چاندی

۷۷۱۶۹۱۳۶ دینار

۶۹ روپیہ

۳۳۱۱۳۲ سونا

۶۹ قطار

۷۷ گنی

تحرکات و سلاسل طرق:

۲۸۵۱۱۲۲۱۱۲۱ اخوان الصفا

۱۱ جماعت اصلاح و تبلیغ لکھنؤ

۱۲۱ فری مشن

۲۲۶ سلسلہ قادریہ

۲۲۴ طریقہ اسہروردیہ

اہم واقعات و معرکے:

۱۴۶ آتش نمرود

۱۴۶ ذبح ابراہیمؑ

۱۴۶ طوفان نوحؑ

۱۴۶ عصائے موسیٰؑ

۱۰۳ فتنہ اعتراض

۱۲۳ فتنہ باطنیت

۳۰۳۱۹ فتنہ تاتار

۹۵۱۹۴۱۹۱۹۰۱۸۴ فتنہ خلق قرآن